# حقیقتِ دین

مولانا امین احسن اِصلاحی

مُشتمل بر

حقیقتِ شرک ○ حقیقتِ توحید

حقیقتِ تقویٰ ○ حقیقتِ نماز

مرکزی انجمن خُدّام القرآن لاہور

# حقیقتِ دین

مشتمل بر

حقیقتِ شرک، حقیقتِ توحید، حقیقتِ تقویٰ اور حقیقتِ نماز

تالیف

مولانا امین احسن اصلاحی

شائع کردہ

مکتبہ مرکزی "انجمن خدام القرآن" لاہور (رجسٹرڈ)

قیمت ——— ۲۴/- روپے

بیس روپے









مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیرِ اہتمام

طبع اوّل ------ ۱۳۹۳ھ / ۱۹۷۳ء

تعداد ------ ۱۱۰۰

طبع دوم ------ ۱۴۰۰ھ / ۱۹۸۰ء

تعداد ------ ۱۱۰۰

شائع کردہ: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور رجسٹرڈ

۳۶-کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور

(فون: - ۸۵۲۶۱۱ - ۸۵۲۶۸۳)

کراچی آفس: ۱۴۴ اسٹی پلازا، مولانا حسرت موہانی روڈ کراچی ۱

مطبع: المطبعۃ العربیہ، پرانی انار کلی لاہور

# تقدیم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یہ مجموعہ میرے چار رسالوں — حقیقتِ شرک، حقیقتِ توحید، حقیقتِ تقویٰ اور حقیقتِ نماز پر مشتمل ہے۔ مقدم الذکر دونوں رسالے میں نے اس غرض سے لکھے تھے کہ دین کے بنیادی عقائد کی وضاحت قرآن حکیم کے فطری و عقلی دلائل کی روشنی میں کی جائے۔ ہمارے متکلمین نے ان مسائل پر جس نہج سے بحث کی ہے، وہ یونانیوں کے فرسودہ طریقِ استدلال سے ماخوذ ہے جس کے اندر عقل و فطرت کے لیے کوئی اپیل نہیں ہے۔ میں نے چاہا تھا کہ قرآنی علمِ کلام کا پورا سلسلہ مرتب کر دیا جائے یعنی توحید اور شرک کی طرح رسالت اور معاد سے متعلق تمام سوالوں کے جواب بھی قرآن کی روشنی میں دیے جائیں کہ قرآن کی عقلیت بھی آشکارا ہو اور عصرِ حاضر نے نئی نسل کے ذہنوں میں جو زہر پھیلائے ہیں ان کا تریاق بھی فراہم ہو۔ افسوس ہے کہ میں کلیتہً تفسیر کی طرف متوجہ ہو جانے کے سبب سے اس سلسلہ کے دو پیشِ نظر رسائل — حقیقتِ رسالت اور حقیقتِ معاد — مرتب کرنے کی فرصت نہ پا سکا۔ اگر یہ دونوں رسالے بھی مرتب ہو جاتے تو یہ سلسلہ مکمل ہو جاتا۔ لیکن ان تمام مسائل پر تدبرِ قرآن میں اتنی وضاحت کے ساتھ میں بحث کر رہا ہوں کہ میرے رفقاء میں سے کسی کو توجہ ہوئی تو وہ بڑی آسانی سے حقیقتِ رسالت اور حقیقتِ معاد کے لیے سارا مواد تفسیر کے صفحات میں سے فراہم کر لیں گے۔ مطالب میں ایک منطقی ترتیب قائم کرنے کے سوا کوئی اور زحمت ان کو اٹھانی نہیں پڑے گی۔

اللہ تعالیٰ جلد وہ وقت بھی لائے کہ میں نے تمدنی، اجتماعی، سیاسی، قانونی اور معاشرتی مسائل پر جو رسائل لکھے ہیں وہ بھی ایک مناسب ترتیب کے ساتھ چھپ کر شائع ہو جائیں۔ برادرم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے کہ ان کی سعی سے یہ چیزیں قدر دانوں تک پہنچ رہی ہیں۔

والسلام

امین احسن اصلاحی

یکم مارچ ۱۹۷۳ء

# حقیقتِ شرک

# فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# دیباچہ

اسلام کی اساس کلمہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللہِ ہے۔ یہ رسالہ اس کلمہ کے پہلے ٹکڑے لَآ اِلٰہ کی شرح ہے۔ یا دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ اس میں بتایا گیا ہے کہ توحید کیا نہیں ہے؟ شرک کی حقیقت، اس کی قسمیں، اس کی خرابیاں اور انسانی فطرت سے اس کی نامناسبت اس رسالہ سے پوری طرح واضح ہو جائے گی۔ توحید کے دلائل کی تفصیل ہم نے اس رسالہ میں نہیں کی ہے۔ اس کے لیے ہم نے دوسرا رسالہ لکھا ہے جس کا نام حقیقتِ توحید ہے اور وہ گویا اِلَّا اللہ کی شرح ہے۔

اس رسالہ کی تالیف اہل قلم کے عام طریقہ کے مطابق نہیں ہوئی ہے کہ ایک عنوان سامنے آیا ہو اور محض ظاہری مناسبت کو سامنے رکھ کر اس سے متعلق کچھ آیتیں قرآن سے یکجا کر لی گئی ہوں اور کچھ مواد ادھر ادھر سے اکٹھا کر لیا گیا ہو اور پھر اس مواد کو جمع کر کے ایک کتاب بنا دی گئی ہو۔ بلکہ اس میں جو خیالات ظاہر کیے گئے ہیں، تدبّرِ قرآن کے سلسلہ میں، میں نے ان کو بار بار جانچا پرکھا ہے، بار بار ان کے ضعف و قوّت کا امتحان کیا ہے اور برسوں کی تنقید و تنقیح کے بعد اس خیال سے ان کو ٹانک رکھا تھا کہ جب اللہ تعالیٰ کی مرضی ہوگی تفسیر قرآن میں، جو میرے پیش نظر ہے، یہ اپنے اپنے مواقع میں بیان ہوں گے۔ ان ہی معلومات کا کچھ حصّہ اس رسالہ میں ایک مناسب ترتیب کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ تاہم

مجھے اس بات کا دعویٰ نہیں ہے کہ میں نے جو کچھ لکھا ہے سب ٹھیک ہی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ مجھ سے لغزشیں ہوئی ہوں ۔ پس جو اصحاب علم کسی لغزش پر مجھے متنبہ فرمائیں گے میں نہایت مسرت اور کشادہ دلی کے ساتھ ان کی تنبیہات کا خیر مقدم کروں گا۔

کتاب کی ترتیب اس طرح ہے کہ پہلے شرک کی تعریف اور اس کی اصولی قسمیں بیان ہوئی ہیں۔ اس کے بعد علی الترتیب قرآن کے اوّل تین مخاطب گروہوں یعنی مشرکین ، اہلِ کتاب اور منافقین کے اندر قرآن نے جن اقسامِ شرک کی نشان دہی کی ہے ان کی وضاحت کی گئی ہے تاکہ لَآ اِلٰـہَ کی نفی میں جو تفصیل پوشیدہ ہے اس کی پوری حقیقت ایک موزوں تدریج کے ساتھ لوگوں کے سامنے آجائے۔ اس کے بعد ان فصلوں کا خلاصہ یکجا کر دیا گیا ہے تاکہ بیک نظر بحث کے سارے مطالب پڑھنے والے کی گرفت میں آجائیں۔ پھر دو علیحدہ علیحدہ فصلوں میں موجودہ دنیا اور مسلمانوں کے موجودہ حالات کا جائزہ لیا گیا ہے تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ توحید اور شرک کے نقطۂ نظر سے اس وقت دنیا کا کیا حال ہے ؟ اس کے بعد وقت کا اصلی فرض بتایا گیا ہے اور زمانہ کے خاص حالات کی وجہ سے جو بعض سوالات پیدا ہوتے ہیں ان کے جواب دیے گئے ہیں۔ کتاب کے پچھلے مباحث کو پڑھتا ہوا جو شخص اس فصل تک پہنچے گا اس کے ذہن میں جو اہم شبہات پیدا ہو سکتے ہیں ان کے ازالہ کا حتیّ الامکان میں نے سامان کر دیا ہے لیکن بعض ضمنی شبہات اور بھی پیدا ہو سکتے ہیں جن سے میں نے اغماض کیا ہے۔ نیک نیت قارئین خود ان کا جواب معلوم کر لیں گے۔

کتاب کے آخر میں دو فصلیں "کیا شرک تقاضائے فطرت ہے ؟" اور "شرک کا اصلی سبب" کے عنوانوں سے آئیں گی۔ ان میں علمائے ارتقاء سے تعرض کیا گیا

ہے جنھوں نے اپنے زعم کے مطابق شرک کی حمایت میں علمی دلائل فراہم کیے ہیں۔
ان فصلوں میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ شرک انسانی فطرت سے بالکل بے جوڑ ہے۔
دینِ فطرت صرف توحید ہے۔ ان فصلوں سے مقصود ایک طرف تو مقصدِ دعوت
کو تقویت پہنچانا ہے کہ شرک اپنے عالمگیر غلبہ کے باوجود گھورے پر اگا ہوا ایک
درخت ہے جو توحید کی ایک ضرب کی بھی تاب نہیں لا سکتا۔ بشرطیکہ وہ گروہ
جس کو اللہ تعالیٰ نے توحید کو قائم کرنے کے لیے برپا کیا تھا اپنے فرض کو پہچانے
اور شرک کے عام غلبہ کو دیکھ کر اس کے مقابلہ سے ہمت نہ ہار بیٹھے۔ مَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيثَةٍ
كَشَجَرَةٍ خَبِيثَةٍ اجْتُثَّتْ مِن فَوْقِ الْأَرْضِ مَا لَهَا مِن قَرَارٍ
(خبیث کلمہ کی مثال ایسی ہے جیسے ایک فاسد پودا ہو جو زمین کے اوپر ہی
سے اکھاڑ لیا جائے، اس کی کوئی جڑ نہ ہو) دوسری طرف عام بنی نوع آدم پر
یہ واضح کرنا ہے کہ صحیح دعویٰ صرف قرآن کا ہے جو کہتا ہے کہ انسان کی فطرت
صرف توحید ہے۔ شرک کی غلط فہمی اس کو محض سوء فہم اور بعض دوسری کمزوریوں
کی وجہ سے لاحق ہوتی ہے۔

یہ مقالہ محض علمی تحقیق نہیں ہے بلکہ ایک عظیم مقصد کے لیے دعوت
کے ساتھ ساتھ وقت کے نظام اور وقت کی سوسائٹی پر تنقید بھی ہے۔ علمی
تحقیقات کو بعض لوگ خاموشی سے پڑھ لیتے ہیں۔ بعض اس کی تحسین کرتے
ہیں۔ بعض اس کو مہمل قرار دیتے ہیں اور بعض یہ کہہ کر گزر جاتے ہیں کہ یہ کوئی
نئی چیز نہیں ہے، ان باتوں کو ہم بھی جانتے ہیں۔ لیکن وقت کے نظام اور
سوسائٹی پر تنقید سے بہت سے لوگ آزردہ ہوتے ہیں اور بعض اوقات اُن
کی یہ آزردگی غصہ و غضب کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ مجھے تنقید کے جرم کا اقرار
ہے اور اس کے لیے صفائی پیش کرنا فضول سمجھتا ہوں۔ لیکن میری نیت نیک

ہے اور اللہ تعالیٰ سے ملتجی ہوں کہ اگر میرے قلم سے حق نکلا ہے تو اس کے لیے دلوں میں جگہ پیدا کرے اور اس کے اجر و ثواب میں ان تمام دوستوں کو شریک کرے جو اس رسالہ کے لکھنے کے محرک ہوئے اور اگر میرا قلم کہیں چوکا ہے تو اس کے اثر کو مٹا دے اور سب کو اس کے گناہ سے بچا لے۔

امین احسن اصلاحی

---

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# تمہید

شرک کی معصیت دوسری تمام معصیتوں کے مقابل میں، ایسی سخت و شدید ہے کہ کوئی مسلمان اس کی ادنیٰ نسبت بھی اپنی طرف گوارا نہیں کرتا۔ ایک عامی سے عامی مسلمان بھی ہر قسم کے الزامات سہ لے گا، ہر قسم کی معصیتوں کی نسبت اپنی طرف گوارا کر لے گا، ہر طرح کی آلودگیوں اور ہر قسم کے گناہوں کا اعتراف کرلے گا، لیکن اگر آپ اُس کے کسی عقیدہ یا عمل میں، کسی معمولی شائبہ شرک کی بھی نشان دہی کیجیے گا تو تلملا اٹھے گا۔

موجودہ زمانہ میں جو لوگ جدید علوم و افکار سے متاثر ہیں، ان کا ذہین طبقہ بھی، بلا امتیاز مذہب و قوم، شرک سے بیزاری ضرور رکھتا ہے، خواہ توحید کے لیے اس کے اندر کوئی حمیت ہو یا نہ ہو۔ ان کا خیال ہے کہ اس زمانہ میں الحاد ہے یا توحید۔ شرک جیسی وہم پرستی میں اس زمانہ کا عقلیت پرست انسان مبتلا نہیں ہو سکتا اور ان میں سے ہرگز کوئی شخص اس بات کا روادار نہ ہوگا کہ آپ اس کی طرف شرک کی نسبت کریں۔

ایک آدمی جس کے پاس قرآن و حدیث کا کچھ علم ہو، جب شرک سے لوگوں کی اِس بیزاری و نفرت کو دیکھتا ہے اور ساتھ ہی مسلمانوں کے اعمال و عقائد اور دنیا کے احوال و معاملات پر غور کرتا ہے تو اس پر سخت حیرت سی چھا جاتی ہے

وہ اپنے علم اور لوگوں کی شہادت میں کھلا ہوا تضاد پاتا ہے۔ وہ اپنے سر کی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوتا ہے کہ گوشہ گوشہ میں شرک کی نجاست پھیلی ہوئی ہے۔ لیکن دوسروں کو اس بات پر متفق اللفظ پاتا ہے کہ دنیا اس نجاست سے پاک ہو چکی ہے اور اگر اس کا کچھ نشان باقی ہے تو ایسی ناقابلِ ذکر اور غیر مؤثر حالت میں ہے کہ اس کے لیے چنداں فکر و اہتمام کی حاجت نہیں ہے۔ زمانہ کی ترقی اور علم کی اس وسعت سے وہ آپ سے آپ مٹ جائے گا۔ اپنی رائے کی مخالفت میں دوسروں کا یہ اتّفاقی کلمہ ایک نیک نیت آدمی کو مشتبہ کر دیتا ہے اور بسا اوقات اپنے علم کو متہم کرنے لگ جاتا ہے کہ ممکن ہے میں نے ہی شرک کا مفہوم غلط سمجھا ہو، ممکن ہے توحید کی تعریف میں اصل حقیقت سے میں ہی دور جا پڑا ہوں۔ کمرے میں بدبُو تو ضرور ہے لیکن جب سب یہی کہہ رہے ہیں کہ ہر طرف خوشبُو ہی خوشبو پھیل رہی ہے تو ہو نہ ہو اس وقت کچھ میرا ہی دماغ گڑبڑ ہے۔ یہ چیز کچھ دیر کے لیے اس کو مذبذب اور متردد کر دیتی ہے لیکن جب بار بار کے تجربہ کے بعد بھی اسے اپنی ہی رائے صحیح معلوم ہوتی ہے اور بدبُو کے وجود سے انکار کرنا اس کے لیے ناممکن ہو جاتا ہے تو اس وقت دو ہی راہیں اس کے سامنے ہوتی ہیں۔ اگر رائے عام کی مخالفت کی جرأت اس میں نہیں ہے تو وہ مجبور ہوتا ہے کہ دوسروں کی طرح خود بھی بدبُو کو خوشبو کہنے لگے اور اگر رائے عام کی پروا اتنی نہیں ہے کہ اس کی خاطر حق کو جھٹلا سکے تو وہ اپنی قوتِ شامہ کی تصدیق کرتا ہے اور دوسروں کو یا تو صاف صاف خبردار کر دیتا ہے کہ وہ کسی مصلحت سے بدبُو کو خوشبو کہہ رہے ہیں یا یہ خیال کرتا ہے کہ ان کو خوشبو اور بدبُو میں امتیاز ہی نہیں ہے۔

میں موجودہ زمانہ کے مسلمانوں اور دوسری مدعیٔ توحید جماعتوں کے بارہ میں یہی آخری رائے رکھتا ہوں۔ میرا خیال یہ ہے کہ مسلمانوں کے اندر شرک سے جو بیزاری اور

توحید کے لیے جو عصبیت ہے اس کے پیچھے کوئی صحیح علم وشعور نہیں ہے۔ وہ محض ایک پندار ہے جو ان کی مذہبی وتاریخی روایات کے توارث پر قائم ہے۔ وہ خیال کرتے ہیں کہ ہم جو دنیا میں ابطالِ شرک کی ایسی شاندار تاریخ رکھتے ہیں۔ کیسے ہو سکتا ہے کہ اسی باطل میں خود مبتلا ہو جائیں؟ مسلمانوں کے سوا جو دوسری جماعتیں توحید کی مدعی ہیں ان کے نزدیک شرک سے بیزاری اور توحید کی حمایت ایک علمی تفاخر کے قسم کی چیز ہے۔ جس طرح کوپرنیکس نے قدیم خیال کے خلاف دعویٰ کیا کہ زمین کی حرکت کا مرکز سورج ہے اور گلیلیو نے دوربین ایجاد کر کے اس دعویٰ کو حقیقت ثابت کر دیا۔ اسی طرح جدید تجربات ومشاہدات نے ان لوگوں کے خیال میں شرک کی تمام وہم پرستیوں کو مٹا دیا ہے اور علم وتحقیق کے اس دور میں اب ان میں گرفتار ہونے کا کوئی امکان باقی نہیں رہا۔ ان لوگوں کو کچھ خبر نہیں کہ شرک فی الحقیقت ہے کیا؟ اس کی صورتیں اور قسمیں کیا کیا ہیں؟ ہماری علمی، اخلاقی اور سیاسی زندگی پر اس کے کیا کیا اثرات پڑتے ہیں؟ ان میں سے وہ کسی ایک بات سے بھی واقف نہیں ہیں۔ ان کے نزدیک اس معاملہ کی اہمیت اس سے زیادہ نہیں ہے کہ یہ دنیا کی ایک علمی غلطی تھی۔ علمِ انسانی کی ترقی نے جس کی اصلاح کر دی۔ شرک کا ایک بہت ہی تنگ مفہوم "بت پرستی" یا "نیچر پرستی" ان کے ذہن میں ہے اور ان کا کہنا یہ ہے کہ جب نیچر کے اتنے اسرار منکشف ہو چکے ہیں کہ قریب ہے انسان زمین وآسمان اور زمان ومکان کے خداوند ہونے کا دعویٰ کر سکے تو دریاؤں، پہاڑوں، سیاروں اور ستاروں کی بندگی کے کیا معنی؟

یہ صورتِ حال حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ایک حکیمانہ بات یاد دلاتی ہے۔ ایک مرتبہ آپ سے کسی شخص کی نیکی کی تعریف کی گئی کہ وہ تو اس قدر نیک ہے کہ بدی کو جانتا بھی نہیں، آپ نے اِس کی یہ تعریف سُن کر فرمایا، تب تو اس سے کے

بدی میں پڑ جانے کا بڑا احتمال ہے، کیونکہ جو شخص بدی اور نیکی میں امتیاز ہی نہیں کر سکتا وہ ہر وقت بدی میں مبتلا ہو سکتا ہے۔ ہمارے نزدیک ٹھیک یہی حال اپنے زمانہ کا ہے۔ یہ لوگ دین سے اس قدر بے خبر ہیں کہ دنیا کی اس سب سے بڑی بُرائی سے، جس کا نام شرک ہے، اچھی طرح واقف ہی نہیں ہیں اور جو شخص بیماری کو بیماری جانتا ہی نہ ہو وہ اگر بیماری کا کچھ اندازہ نہ کر سکے، یا بیماری ہی کو صحت خیال کرنے لگ جائے تو کیا تعجب! پس وقت کی ایک نہایت اہم ضرورت ہے کہ اس جاہلیت کی، جس کو قرآن نے ظلم عظیم کہا ہے، تشریح کی جائے" تاکہ توحید کی صحیح حقیقت اُجاگر ہو اور حق و باطل کے یہ دونوں نقطے اس قدر نمایاں ہو جائیں کہ التباس کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے۔ لیهلك من هلك عن بينة ويحيى من حى عن بينة " تاکہ جس کو ہلاک ہونا ہو وہ اتمام حجت کے بعد ہلاک ہو اور جسے ایمان کی زندگی حاصل کرنی ہو وہ دلیل کے ساتھ زندگی حاصل کرے"۔

---

# شرک کی حقیقت

## اور

# اس کے اقسام

کسی شے کا صحیح تصوّر اس کی صحیح تعریف کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا اس وجہ سے سب سے پہلے ضروری ہے کہ ہم شرک کی تعریف کریں اور اس کے بعد اس کے اقسام و فروع پر بحث کریں۔

قرآن مجید اور احادیث رسولؐ میں جن چیزوں کو شرک قرار دیا گیا ہے، ان کو سامنے رکھ کر، اگر شرک کی تعریف کی جائے تو اس کی تعریف یہ ہوگی۔

"خدا کی ذات یا اس کی صفات میں، جس مفہوم میں وہ خدا کے لیے مستعمل ہیں یا اس کے حقوق میں کسی کو ساجھی ٹھہرانا۔"

اس تعریف کو ٹھیک سمجھنے کے لیے کسی قدر توضیح کی ضرورت ہے۔

خدا کی ذات میں شریک کرنے کا مفہوم یہ ہے کہ خدا کو کسی سے یا کسی کو خدا سے قرار دینا، کسی کو اس کی ذات برادری سمجھنا، کسی کو اس کا باپ یا بیٹا کہنا۔ مثلاً عیسائیوں کا یہ عقیدہ کہ مسیح خدا کے جوہر سے ہیں، یا خدا نے ان کو جنا ہے، یا حضرت مریمؑ خدا کی ماں ہیں۔ یا عربوں کا یہ عقیدہ کہ فرشتے خدا کی بیٹیاں ہیں۔ یہ ساری باتیں خدا کے قدیم اور ازلی و ابدی ہونے اور ان تمام صفات کمال کے منافی ہیں جن کا ماننا عقل، فطرت اور مذہب کی رُو سے لازم ہے۔ یہ شرک فی الذات ہے۔[1]

---

[1] عقیدہ وحدت الوجود کی تقریر مختلف طریقوں سے کی جاتی ہے۔ اس کی (باقی اگلے صفحہ پر)

صفات میں شریک کرنے کا مفہوم یہ ہے کہ جو صفات کمال خدا کے لیے مخصوص ہیں، مثلاً خلق، تدبیر، قدرت، علم، حکمت وغیرہ، ان میں کسی کو ساجھی قرار دینا لیکن اس کے ساتھ یہ قید لگی ہوئی ہے کہ جس مفہوم میں وہ خدا کے لیے مستعمل ہیں۔ اس قید کا فائدہ یہ ہے کہ یہی صفتیں بسا اوقات ہم اپنے ہی جیسے انسانوں کے لیے بھی استعمال کرتے ہیں لیکن ظاہر ہے کہ جب ہم ان کو خدا کے لیے بولتے ہیں تو ان کا مفہوم بالکل خاص ہوتا ہے جو اس بے ہمہ و باہمہ ذات کے شایان شان ہوتا ہے اور جب ان کو انسانوں کے لیے بولتے ہیں تو خدائی مفہوم سے بالکل الگ کر کے بولتے ہیں، مثلاً حکیم کی صفت ہم خدا اور آدمی دونوں کے لیے بولتے ہیں لیکن جب اس کو خدا کے لیے بولتے ہیں تو اس کا مفہوم اور ہوتا ہے اور جب انسان کے لیے بولتے ہیں تو اس کا مطلب کچھ اور ہوتا ہے۔ اگر انسان کے لیے بھی اس صفت کو اس مفہوم میں بول دیں جس مفہوم میں خدا کے لیے بولتے ہیں تو یہ شرک فی الصفات ہوگا۔

حقوق میں شریک کرنے کا مفہوم یہ ہے کہ خدا کی صفات کمال سے جو باتیں لازم آتی ہیں یا جو حقوق ہم پر عائد ہوتے ہیں ان میں کسی کو شریک ٹھہرانا۔ مثلاً خدا خالق ہے، تو اس سے لازم آتا ہے کہ تمام عالم میں حکم و انتظام اُسی کا ہو۔ اب فرض کیجیے کہ ہم یہ تو مانیں کہ آسمان و زمین کا خالق خدا ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی مان لیں کہ ان کا انتظام خدا کے سوا کسی اور کے ہاتھ میں ہے تو یہ شرک فی اللوازم ہوگا اس لیے کہ خدا کے خالق ہونے سے جو بات لازم آتی ہے اس میں ہم خُدا کے سوا ایک دوسرے کو شریک کر رہے ہیں۔ حالانکہ جس نے خلق کیا ہے امر کا حق دار بھی وہی ہے چنانچہ فرمایا ہے اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ (آگاہ اسی کے اختیار میں ہے خلق

---

(حاشیہ صفحہ گزشتہ) بعض صورتیں بالکل اس کے تحت آجاتی ہیں۔ بالخصوص جس صورت میں وہ گیتا اور ہندو فلسفہ میں ہے، اس کے شرک فی الذات ہونے میں تو کوئی شبہ نہیں ہے۔

اور تدبیر، جب تمام کائنات کی تدبیرِ امر اسی کے ہاتھ میں ہے تو اس سے لازم آتا ہے کہ بندگی صرف اُسی کی کی جائے، اطاعت خالص اسی کی ہو، محبت حقیقی کا مرکز وہی ہو۔ اب فرض کیجیے کہ ہم خدا کے سوا کسی اور کی بندگی کو بھی اختیار کر لیں، یا اس کی اطاعت کے خلاف کسی اور کی اطاعت کو جائز قرار دے لیں یا اس کی کی محبت کے خلاف کسی اور کو محبت حقیقی کا مرکز ٹھہرائیں تو یہ ساری باتیں شرک فی الحقوق میں شمار ہوں گی۔ چنانچہ اسی بنیاد پر قرآن نے یہ مطالبہ کیا ہے فَاعْبُدُوا اللّٰہَ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ "اللہ کی بندگی کرو اطاعت کو اس کے لیے خالص کرتے ہوئے۔" الزمر - 2

دوسری جگہ فرمایا ہے وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِلّٰہِ۔ "جو لوگ اہل ایمان ہیں وہ اللہ کی محبت میں دوسری تمام محبتوں سے زیادہ سخت ہوتے ہیں" (یعنی دوسروں کے ساتھ ان کی محبت خدا کی محبت کے تحت ہوتی ہے)

یہ شرک کی اصلی قسمیں ہوئیں۔ ان کے علاوہ بعض چیزیں ایسی بھی ہیں جو اگرچہ فی نفسہٖ شرک نہیں ہیں اور مذکورۂ بالا اقسام میں سے کسی کے تحت وہ نہیں آتی ہیں۔ لیکن وہ صورت شرک یا ذریعہ شرک ہیں، اگر ان کو باقی رکھا جائے تو اس کا اندیشہ ہے کہ وہ اصلی شرک کا دروازہ کھول دیں گی۔ اسلامی شریعت کا اصول یہ ہے کہ وہ اصلی گناہ کے ساتھ ساتھ ان ذرائع کا بھی سدِّ باب کرتی ہے جو اس گناہ کے محرک ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے شریعت نے ان کو بھی ناجائز قرار دیا۔ مثلاً غیر اللہ کو سجدہ کرنا۔ یا بقصد تعظیم غیر اللہ کی قسم کھانا۔ چونکہ سجدہ ہمیشہ سے انتہائی تذلل کی نشانی خیال کیا گیا ہے اور مشرک قومیں اپنے معبودوں کی قسمیں بھی کھایا کرتی تھیں۔ اس وجہ سے اسلام نے، جو آخری اور مکمّل شریعت ہے، ان تمام صورتوں کا بھی خاتمہ کر دیا جو ذریعۂ شرک ہو سکتی تھیں۔ اِس قسم کے شرک کو شرک شبہی کہتے ہیں۔

شرک کی ان اقسام کی توضیح کے لیے مناسب ہوگا کہ ہم قرآن مجید سے ان کی مثالیں پیش کریں۔

قرآن نے اپنے زمانۂ نزول میں جن جماعتوں سے براہ راست خطاب کیا ہے اور ان کے افعال و معتقدات میں شرک کا پتہ دیا ہے، وہ تین ہیں۔ اہل عرب (بنی اسمٰعیل) اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) اور منافقین۔ ان تینوں جماعتوں میں اہل عرب کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ قرآن نے ان کے لیے "مشرکین" کا لفظ بطور علم اور صفت کے استعمال کیا ہے۔ بقیہ جماعتوں کی طرف فعل شرک کی نسبت تو ضرور کی ہے لیکن "مشرک یا مشرکین" کا لفظ بطریق علم یا صفت ان کے لیے استعمال نہیں کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دوسری جماعتیں توحید کو اساس و بنیاد کی حیثیت سے تسلیم کرتی تھیں۔ ان کے اور مسلمانوں کے درمیان توحید بطور ایک مسلمہ اور قدر مشترک کے تھی۔ یہود اور نصاریٰ میں سے کوئی بھی توحید کا منکر نہیں تھا اور منافقین تو اپنے تمام ظاہری اعمال و اعترافات میں گویا مسلمان ہی تھے۔ ان گروہوں کے اندر جو شرک تھا وہ ان کے اقرار و اعلان کے بالکل خلاف تھا۔ برعکس اس کے مشرکین شرک کو بطور ایک اساسی عقیدہ کے تسلیم کرتے تھے۔ خدائی کے اس کارخانہ میں ان کے شرکاء نہ صرف شریک تھے بلکہ وہ ناگزیر تھے۔ شرک کو تسلیم کیے بغیر ان کے نزدیک اس کائنات کا معمہ حل ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ ان کی اس اہمیت کی وجہ سے شرک و توحید کی بحث میں قرآن نے بھی ان کو مقدم رکھا ہے اور ہم بھی ان کو مقدم رکھیں گے۔ چنانچہ ان کے اندر قرآن نے شرک کے جن اقسام کی نشان دہی کی ہے ہم پہلے ان کو اجمال کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔

# (۱) مشرکین کا شرک

اہل عرب کے متعلق سب سے پہلی بات یہ جاننی چاہیے کہ ان میں کوئی جماعت خدا کی منکر نہیں تھی۔ بعض لوگوں نے ان کے قول (وَمَا يُهْلِكُنَا اِلَّا الدَّهْرُ (ہم کو نوبس گردش زمانہ فنا کرتی ہے) سے یہ استدلال کیا ہے کہ ان میں بعض جماعتیں خدا کی منکر یا باصطلاح جدید نیچری (NATURALIST) تھیں، لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ عربوں میں نزولِ قرآن کے وقت دہریوں کی کوئی جماعت موجود نہیں تھی وَمَا يُهْلِكُنَا اِلَّا الدَّهْرُ جو وہ کہتے تھے تو اس سے ان کا مقصود خدا کی ہستی کا انکار نہیں ہوتا تھا بلکہ یہ بات وہ قرآن کے اس دعوے کی تردید میں کہتے تھے کہ قوم کے عروج و زوال کا انحصار اس کے عقائد و اعمال کے صلاح و فساد پر ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ قوموں کے عروج و زوال کے لیے قرآن مجید ایک اخلاقی بنیاد قرار دیتا تھا۔ وہ عاد، ثمود، قوم لوط، اہل مدین اور قوم فرعون کی تباہی کا سبب ان کے کفر و شرک، ظلم و سرکشی، فسق و عدوان اور ان کے دوسرے عملی و اعتقادی فسادات کو بتاتا تھا اور عربوں کو متنبہ کرتا تھا کہ اگر انھوں نے اپنی اعتقادی و اخلاقی غلطیوں کی اصلاح نہ کی تو اپنی قوت و جمعیت کے باوجود مذکورہ قوموں کی طرح وہ بھی تباہ ہو جائیں گے۔ یہ بات اُن کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ وہ قوم کے عروج و زوال میں کسی اخلاقی اصول کو کارفرما نہیں مانتے تھے۔ وہ قوم کو ایک درخت کے مانند سمجھتے تھے جو اُگتا ہے، نشو و نما پاتا ہے۔ پھل پھول لاتا ہے۔ یہاں تک کہ اپنی فطری قوتیں نچوڑ کر ایک دن گردشِ لیل و نہار کی نذر ہو جاتا ہے۔ یا ایک فرد کے مانند سمجھتے تھے جو پیدا ہو جاتا ہے، جوان ہوتا ہے، پھر کسی بیماری کے سبب سے،

یا درازی عمر سے، ایک دن مرجاتا ہے۔ موت وزیست کا جو طبیعیاتی ضابطہ کائنات کے ہر گوشہ میں کام کر رہا ہے وہ اسی ضابطہ کو قوموں کی موت وزیست میں بھی کارفرما مانتے تھے اور اپنے شعروں میں اسی نقطۂ نظر سے گزشتہ اقوام و قبائل کی تباہی کا ذکر کرتے تھے۔

قرآن مجید نے تاریخ ایک نئے نقطۂ نظر سے پیش کی تھی، جو ان کے اس مادہ پرستانہ نقطۂ نظر سے بالکل مختلف تھا اور دنیا میں زندہ رہنے کے لیے ان سے نئے اصول زندگی کا مطالبہ کیا تھا جو ان کی خواہشات نفس کے بالکل خلاف تھا اس وجہ سے وہ اس کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھے اور جواب میں یہ کہتے تھے کہ وَمَا يُهْلِكُنَا إِلَّا الدَّهْرُ قوم کی موت وزیست کو ان اصولوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ قوموں کو تو صرف گردش روزگار فنا کرتی ہے، قوم کی بدی کو اس کی تباہی میں کوئی دخل نہیں ہوا کرتا۔ اٹلی کے مشہور سیاسی فلسفی مکیاویلی کا مذہب بھی یہی ہے۔ وہ جب یہ کہتا ہے کہ حکومت ایک مجرد سیاسی وجود ہے، وہ نہ اخلاقی ہے نہ قانونی، فرمانروا اور مدبرین ملک کے تمام اعمال سیاسی کا محور صرف فائدہ پرستی کو ہونا چاہیے، جس کام میں حکومت کا بھلا ہو رہا ہو، یا جس بات کے لیے حکومت کی قوت و صلاحیت مقتضی ہو، وہ ان کو کر گزرنی چاہیے، اس میں کسی ضابطۂ قانونی و اخلاقی کو مانع نہیں ہونا چاہیے تو وہ درحقیقت کوئی نئی بات نہیں کہتا بلکہ ٹھیک ٹھیک عرب جاہلیت کے نقطۂ نظر کی ترجمانی کرتا ہے۔

الغرض اہل عرب نہ تو خدا کے منکر تھے اور نہ وہ خدا کی بنیادی صفات میں سے کسی صفت کے منکر تھے۔ وہ زمین و آسمان، سورج اور چاند اور ابرو ہوا کا خالق خدا ہی کو مانتے تھے۔ زندگی بخشنے والا، روزی دینے والا اور زندگی لینے والا اسی کو کہتے تھے۔ اپنی تمام قوتوں اور قابلیتوں کو اسی کا عطیہ جانتے تھے۔ اس

کائنات کا انتظام وانصرام اسی کے دست تصرف میں سمجھتے تھے، لیکن ساتھ ہی بعض ایسی باتیں بھی مانتے اور کرتے تھے جن سے یا تو خدا کی صفتوں اور ان کے مقتضیات کا انکار لازم آتا تھا جو کفر ہے۔ یا خدا کی صفات اور اس کے حقوق میں دوسروں کی حصہ داری لازم آتی تھی، جو شرک ہے۔ قرآن نے ان کے اس تناقض پران کو جگہ جگہ متنبہ کیا ہے۔ ہم صرف ایک آیت نقل کرتے ہیں جو کافی ہوگا :-

| | |
|---|---|
| قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ | پوچھو، کون تم کو روزی دیتا ہے آسمان |
| وَالْاَرْضِ اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ | سے اور زمین سے یا کون قدرت رکھتا |
| وَالْاَبْصَارَ وَمَنْ يُّخْرِجُ الْحَيَّ | ہے کان پر اور آنکھوں پر؟ اور کون |
| مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ | نکالتا ہے زندہ کو مردہ سے اور مردہ |
| الْحَيِّ وَمَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ | کو زندہ سے؟ اور کون عالم کا انتظام |
| فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ فَقُلْ اَفَلَا | کرتا ہے؟ جواب دیں گے اللہ، تو کہو |
| تَتَّقُوْنَ ۝ فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ | کیا اس سے ڈرتے نہیں۔ وہی اللہ |
| الْحَقُّ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ | تو تمہارا حقیقی مالک ہے تو اس مالک |
| اِلَّا الضَّلٰلُ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ۔ | حقیقی کے بعد گمراہی کے سوا اور کیا |
| (یونس ۱۰-۳۱-۳۲) | ہے! تو کہاں کھوئے جارہے ہو۔ |

اس تناقض نے اہل عرب کو خدا کی عبادت کے ساتھ ساتھ دوسرے بہت سے خداؤں کی پرستش میں مبتلا کر دیا تھا جس سے خدا کی ذات، اس کی صفات اور اس کے حقوق میں شرک کی بہت سی قسمیں پیدا ہوگئیں اور وہ آہستہ آہستہ ان پر چھاتی چلی گئیں۔ قرآن کی روشنی میں اگر ان کی مشرکانہ پرستشوں کی تحلیل کی جائے تو ان کی پانچ قسمیں نکلیں گی۔ ملائکہ پرستی، جنات پرستی، کواکب پرستی، آباء پرستی اور خود پرستی، اب ہم ان میں سے ہر ایک پر، اختصار کے ساتھ گفتگو کریں گے۔

د۔ ملائکہ پرستی | اہل عرب فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں اور اس کی اولاد قرار دیتے تھے جو صریحاً شرک فی الذات ہے اور اس سے اس کی شان بے ہمگی اور اس کے استغناء کی نفی لازم آتی ہے جو کھلا ہوا کفر ہے۔ قرآن نے ان کے اس عقیدہ کی تردید اس طرح فرمائی ہے۔

| | |
|---|---|
| قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ؕ | وہ کہتے ہیں اللہ نے اپنے لیے اولاد بنائی |
| هُوَ الْغَنِيُّ ؕ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ | ہے، وہ پاک ہے وہ بے پرواہ ہے، جو |
| وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ اِنْ | کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب اسی |
| عِنْدَكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍۢ | کا ہے۔ تمہارے پاس اس بات کی |
| بِهٰذَا ؕ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ | کوئی دلیل نہیں ہے کیا تم خدا پر ایسی بات |
| مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ | کی تہمت دھرتے ہو جس کے متعلق تمہارے |
| (یونس - ۶۸) | پاس کوئی علم نہیں ہے۔ |

ان فرشتوں کو وہ خدا سے قربت کا وہ مقام دیتے تھے جو عبدیت و بندگی کے مقام سے بالاتر اور الوہیت کے مقام سے قریب تر ہے اور یہ کھلا ہوا شرک فی الصفات ہے۔ قرآن نے اس کی تردید فرمائی۔

| | |
|---|---|
| وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ | اور آسمان اور زمین میں جتنے جاندار |
| وَمَا فِي الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ | ہیں سب اللہ ہی کے لیے سجدہ کرتے |
| وَّالْمَلٰٓئِكَةُ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ۝ | ہیں اور فرشتے بھی اللہ ہی کے لیے |
| يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ | سجدہ کرتے ہیں اور وہ تکبر نہیں کرتے |
| فَوْقِهِمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا | اپنے رب سے ڈرتے رہتے ہیں، اوپر |
| يُؤْمَرُوْنَ (نحل - ۴۹-۵۰) | سے جو حکم پاتے ہیں اس کی تعمیل کرتے ہیں۔ |

"تکبر نہیں کرتے" یعنی اپنے تئیں بندگی سے بالاتر نہیں سمجھتے، "اپنے رب سے

ڈرتے ہیں اپنے اوپر سے" یعنی قربت حاصل ہونے کے باوجود خدا کے ساحت جلال تک ان میں سے کسی کی رسائی نہیں ہے۔ بس اوپر سے جو حکم نازل ہوتا ہے اس کی تعمیل کر دیتے ہیں۔ 'یُؤْمَرُوْنَ' عربی زبان میں مجہول کا صیغہ ہے جو ظاہر کرتا ہے کہ حکم دینے والے کا مقام ان کی پہنچ سے بالاتر ہے۔ اس وجہ سے بجائے اس کے کہ وہ اپنی اس قربت پر فخر کریں اور یہ گمان کرنے لگ جائیں کہ اب وہ جو چاہیں خدا سے کرا سکتے ہیں (جیسا کہ مشرکین کا ان کے بارہ میں خیال ہے) وہ ہر وقت خدا کی بندگی و اطاعت میں سرگرم اور اس کی خوشنودی اور قربت کے طلبگار رہتے ہیں۔ یَبْتَغُوْنَ اِلٰی رَبِّهِمُ الْوَسِیْلَةَ اَیُّهُمْ اَقْرَبُ (الآیۃ)

مشرکین اپنے لیے بلا کسی واسطہ کے خدا کی قربت ناممکن خیال کرتے تھے۔ اس وجہ سے ان فرشتوں کو خدا تک رسائی کا وسیلہ بناتے تھے اور ان کی بندگی کرتے تھے اور اس طرح شرک فی اللوازم یا شرک فی العبادت کی بدعت شروع ہوئی۔ قرآن مجید نے خود ان کی زبان سے ان کی ملائکہ پرستی کی یہی توجیہ پیش کی ہے۔

| | |
|---|---|
| وَالَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ | اور جنھوں نے اللہ کے سوا مددگار ٹھیرا |
| دُوْنِهٖ اَوْلِیَآءَ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا | لیے ہیں کہتے ہیں کہ ہم تو ان کو محض |
| لِیُقَرِّبُوْنَآ اِلَی اللّٰهِ زُلْفٰی ط | اس لیے پوجتے ہیں کہ وہ ہم کو اللہ |
| (زمر-۳) | کے قریب کر دیں۔ |

دنیا کی فارغ البالی اور خوش حالی ان فرشتوں کی بندگی کی برکت سمجھتے۔ ان کے خیال میں اولاد ان کی عنایت سے ملتی تھی۔ چنانچہ قرآن نے ان کے اس خیال کا اظہار کر کے اس کی تردید فرمائی ہے۔

| | |
|---|---|
| فَلَمَّآ اٰتٰهُمَا صَالِحًا | پس جب اللہ ان کو بھلی چنگی اولاد دیتا ہے |
| جَعَلَا لَهٗ شُرَكَآءَ فِیْمَا | تو اس کی دی ہوئی چیز میں دوسروں کو ساجھی |

| | |
|---|---|
| اٰتٰهُمَا فَتَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝ اَيُشْرِكُوْنَ مَا لَا يَخْلُقُ شَيْئًا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ... (الاعراف - ۱۹۰-۱۹۱) | جاتے ہیں۔ وہ ان چیزوں سے جن کو وہ ساجھی ٹھہراتے ہیں برتر ہے۔ کیا وہ ایسی چیزوں کو ساجھی ٹھہراتے ہیں جو کچھ پیدا نہیں کرتیں، بلکہ وہ خود پیدا کی جاتی ہیں |

اسی طرح روزی، ان کے خیال میں فرشتوں کی عنایت سے ملتی تھی۔ قرآن نے ان کے اس گمان کی تردید فرمائی ہے۔

| | |
|---|---|
| اِنَّ الَّذِيْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَمْلِكُوْنَ لَكُمْ رِزْقًا فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰهِ الرِّزْقَ وَاعْبُدُوْهُ وَاشْكُرُوْا لَهٗ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝ (عنکبوت - ۱۷) | جن کو تم اللہ کے سوا پوجتے ہو وہ تمہارے لیے ذرا بھی روزی پر اختیار نہیں رکھتے پس اللہ ہی کے ہاں سے روزی چاہو اور اسی کی بندگی کرو اور اسی کی شکرگزاری بجا لاؤ۔ اسی کی طرف جانا ہے۔ |

اہل عرب موت کے بعد کی زندگی اور حساب و کتاب کو اگرچہ مستبعد خیال کرتے تھے لیکن کہتے تھے کہ بالفرض مرنے کے بعد اٹھنا ہی پڑا اور حساب و کتاب کی نوبت ہی آئی تو یہ فرشتے جن کو ہم پوجتے ہیں ہماری سفارش کریں گے اور ہم پر کوئی آنچ نہ آنے دیں گے۔ ان کے اس عقیدہ سے ایک طرف خدا کی صفت علم و عدل اور حکمت کا انکار لازم آتا ہے جو کفر ہے[1]۔ اور دوسری طرف یہ خدا کی صفتوں میں غیر اللہ کو شریک کرنا ہے جو کھلا ہوا شرک ہے۔ قرآن نے اس کی مختلف پہلوؤں سے تردید کی ہے۔ ہم بعض آیتیں یہاں نقل کرتے ہیں۔ جن سے ان کے عقیدہ کا اصلی پہلو بھی واضح ہو

---

[1] اس عقیدہ سے خدا کی صفت علم، عدل و حکمت کا انکار کس طرح لازم آتا ہے؟ اس سوال کا تفصیلی جواب ہمارے رسالہ "حقیقت توحید" میں ملے گا۔ یہاں ہم صرف بالاجمال اہل عرب کے شرکیہ عقائد کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں

جائے گا اور قرآن نے جس پہلو سے اس کی تردید کی ہے وہ بھی سامنے آ جائے گا۔

| | |
|---|---|
| أَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِينَ كَالْمُجْرِمِينَ | کیا ہم فرمانبرداروں کو مجرموں کی طرح کر |
| مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ - أَمْ لَكُمْ | دیں گے؟ تمھیں کیا ہو گیا ہے۔ کیسا فیصلہ |
| كِتَابٌ فِيهِ تَدْرُسُونَ - إِنَّ لَكُمْ | کرتے ہو! کیا تمھارے پاس کوئی کتاب |
| فِيهِ لَمَا تَخَيَّرُونَ أَمْ لَكُمْ أَيْمَانٌ | ہے جس میں تم پڑھتے ہو، اس میں تمھارے |
| عَلَيْنَا بَالِغَةٌ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ | لیے وہی ہے جو چاہتے ہو، کیا تم نے |
| إِنَّ لَكُمْ لَمَا تَحْكُمُونَ - سَلْهُمْ | ہم سے عہد لے رکھا ہے قیامت تک |
| أَيُّهُمْ بِذَلِكَ زَعِيمٌ - أَمْ | کے لیے، تمھارے لیے وہی ہوگا جو تم |
| لَهُمْ شُرَكَاءُ فَلْيَأْتُوا بِشُرَكَائِهِمْ | کہو گے؟ پوچھو اس کا ذمہ کون لیتا ہے؟ |
| إِنْ كَانُوا صَادِقِينَ - | کیا ان کے شرکاء ہیں! تو لائیں اپنے شرکاء |
| (قلم۔ ۳۵-۴۱) | کو اگر وہ سچے ہیں۔ |

سورہ نجم میں ان فرشتوں کے نام بھی قرآن نے گنا دیے ہیں جن کی شفاعت پر اہل عرب کو بڑا اعتماد تھا اور ایک دوسرے پہلو سے ان کے شریک خدا یا شفیع ہونے کی تردید بھی کر دی ہے۔

| | |
|---|---|
| أَفَرَأَيْتُمُ اللَّاتَ وَالْعُزَّى وَ | ذرا دیکھو تو لات اور عزیٰ کو اور منوۃ |
| مَنَاةَ الثَّالِثَةَ الْأُخْرَى أَلَكُمُ | کو جو دوسرے کا تیسرا ہے۔ کیا تمھارے |
| الذَّكَرُ وَلَهُ الْأُنْثَى تِلْكَ | لیے بیٹے ہیں اور اس کے لیے بیٹیاں؟ |
| إِذًا قِسْمَةٌ ضِيزَى إِنْ هِيَ إِلَّا | یہ تو بڑی بھونڈی تقسیم ہوئی۔ یہ تو محض |
| أَسْمَاءٌ سَمَّيْتُمُوهَا أَنْتُمْ | نام ہیں جو تم نے اور تمھارے باپ |
| وَآبَاؤُكُمْ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ | دادا نے رکھ چھوڑے ہیں۔ خدا نے ان |
| بِهَا مِنْ سُلْطَانٍ إِنْ يَتَّبِعُونَ | کی کوئی دلیل نہیں اتاری۔ یہ لوگ محض |

| | |
|---|---|
| اِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْاَنْفُسُ | گمان کی پیروی کر رہے ہیں اور نفس |
| وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنْ رَّبِّهِمُ | کی خواہش کی۔ حالانکہ ان کے پاس |
| الْهُدٰى (النجم۔ ۱۹-۲۳) | ان کے رب کی ہدایت آ چکی ہے۔ |

ان آیتوں میں لات، منوٰۃ اور عزّیٰ کا جو ذکر آیا ہے یہ تینوں فرشتوں کے بت تھے اور تینوں کے نام عورتوں کے نام پہ تھے۔ ان کی شفاعت پہ مشرکین کو بڑا اعتماد تھا۔ اہل عرب ان کا طواف کرتے تھے اور طواف کے وقت یہ الفاظ دہراتے تھے تلك الغرانيق العلى وان شفاعتهن لترتجى (یہ بلند مرتبہ ہیں اور ان کی شفاعت کی امید ہے)، آگے کی آیات میں ان کے اسی خیال کی تردید ہو رہی ہے۔

| | |
|---|---|
| اَمْ لِلْاِنْسَانِ مَا تَمَنّٰى فَلِلّٰهِ | کیا انسان جو آرزو کرے گا پا جائے گا! |
| الْاٰخِرَةُ وَالْاُوْلٰى وَكَمْ | اللہ ہی کے لیے ہے دنیا اور آخرت، |
| مِّنْ مَّلَكٍ فِى السَّمٰوٰتِ لَا | اور کتنے فرشتے ہیں آسمانوں میں جن کی شفاعت |
| تُغْنِىْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا اِلَّا | کچھ کام نہ آئے گی الا یہ کہ اللہ اجازت دے |
| مِنْۢ بَعْدِ اَنْ يَّاْذَنَ اللّٰهُ | جس کے لیے چاہے اور پسند کرے۔ جو |
| لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَرْضٰى، اِنَّ | آخرت پر ایمان نہیں رکھتے (یعنی آخرت |
| الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ | کو ایک مفروضہ مانتے ہیں) وہ ملائکہ کے نام |
| لَيُسَمُّوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ تَسْمِيَةَ | عورتوں کے نام پر رکھتے ہیں (اشارہ لات، |
| الْاُنْثٰى (نجم۔ ۲۴-۲۷) | عزّیٰ اور منوٰۃ کی طرف) |

اس کے بعد شفاعت کے ابطال کی دلیل بیان فرمائی ہے کہ یہ نہیں ہو سکتا کہ شفاعت نیک کو بد اور بد کو نیک بنا دے۔ یہ بات اللہ تعالیٰ کے عدل اور حکمت کے بالکل خلاف ہے۔ ہر شخص اپنے عمل کا بدلہ پائے گا۔ خدا کی رحمت کے مستحق وہی ٹھہریں گے جو بھلے کام کریں گے۔ گناہوں اور بدکاریوں سے بچیں گے۔ ہاں کبھی لغزش اور خواہش

نفس کے غلبہ سے کسی بدی میں آلودہ ہو جائیں گے تو یہ علیحدہ چیز ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت و مغفرت کا دامن بہت وسیع ہے۔ وہ بڑی بڑائیوں سے بچنے والوں کی چھوٹی چھوٹی لغزشوں سے درگزر فرماتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

| | |
|---|---|
| وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي | اللہ کے لیے ہے جو آسمانوں اور زمین |
| الْاَرْضِ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ | میں ہے تاکہ رسوا کرے ان کو جنہوں نے |
| اَسَاۗءُوْا بِمَا عَمِلُوْا وَيَجْزِيَ | برے کام کیے اور بدلہ دے ان لوگوں کو |
| الَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا بِالْحُسْنٰى ۚ اَلَّذِيْنَ | جنھوں نے بھلے کام کیے، بھلا۔ یعنی |
| يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰۗىِٕرَ الْاِثْمِ | ان لوگوں کو جو بڑے گناہوں اور کھلی |
| وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ ۭ اِنَّ | بدکاریوں سے بچتے ہیں مگر کبھی کسی بدی میں |
| رَبَّكَ وَاسِعُ الْمَغْفِرَةِ ۔ | اتفاق سے پڑ جاتے ہیں۔ تیرا پروردگار |
| (النجم۔ ۳۱-۳۲) | وسیع مغفرت والا ہے۔ |

جن فرشتوں سے یہ اُمیدیں وابستہ کی گئیں لازماً وہ اس درجہ کی محبت کے بھی سزاوار قرار پائے جو صفات الٰہی کے مقتضیات و لوازم اور اللہ تعالیٰ کے خاص حقوق میں سے ہے اور جو اسی کے لیے مخصوص ہونی چاہیے۔ قرآن مجید ان کے اس شرک فی الحقوق کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے۔

| | |
|---|---|
| وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ | اور لوگوں میں وہ بھی ہیں جنھوں نے اللہ |
| مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا | کے سوا شرکاء ٹھہرا لیے ہیں۔ ان سے |
| يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ | اس طرح محبت کرتے ہیں جس طرح اللہ |
| اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ | سے محبت کرنی چاہیے اور جو اہل ایمان |
| وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا | ہیں وہ اللہ سے سب سے بڑھ کر محبت کرتے |
| اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ ۙ اَنَّ الْقُوَّةَ | ہیں۔ کاش دیکھتے یہ لوگ جنھوں نے |

| | |
|---|---|
| لِلّٰهِ جَمِیْعًا وَّاَنَّ اللّٰهَ | ظلم کیا ہے اس وقت کو جب دیکھیں گے |
| شَدِیْدُ الْعَذَابِ۔ | عذاب کہ ساری قوت اللہ ہی کے ہاتھ |
| (البقرہ - ۱۶۵) | میں ہے اور اللہ سخت عذاب والا ہے۔ |

یُحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ (ان سے اللہ کے برابر محبت کرتے ہیں) کا مطلب یہ ہے کہ ان فرشتوں کے ساتھ ان کی یہ محبت مستقل محبت ہے۔ خدا کی محبت کے تابع نہیں ہے اور جو محبت خدا کی محبت کے تابع نہ ہو وہ شرک ہے۔ اہل ایمان کی محبت اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایسی ہوتی ہے کہ دوسری تمام محبتیں اس کے تابع ہو جاتی ہیں۔ جہاں کوئی محبت خدا کی محبت سے متصادم ہوتی انھوں نے فوراً اس سے استعفا دے دیا۔ یہ نہیں ہے کہ اس کی خاطر خدا اور اس کی شریعت کو نظر انداز کر بیٹھے، یہی مفہوم ہے وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ کا۔

ان تمام امیدوں اور نیازمندیوں کے بعد ان فرشتوں کی نسبت یہ عقیدہ رکھنا بھی لازم ہو گیا کہ وہ ان ساری دعاؤں اور عبادتوں اور اپنی بندگی کرنے والوں کے حالات سے باخبر بھی ہیں کیونکہ اس کے بغیر ان کی بندگی کرنے اور ان سے محبت کرنے کا فائدہ کیا؟ چنانچہ صفت علم کے اس مفہوم میں وہ شریک ہوئے جو اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص ہے۔ قرآن کے اس کی تردید کی ہے۔

| | |
|---|---|
| وَیَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِیْعًا | اور جس دن ہم ان سب کو جمع کریں گے |
| ثُمَّ نَقُوْلُ لِلَّذِیْنَ اَشْرَكُوْا | پھر جن لوگوں نے شریک ٹھہرایا ہم ان |
| مَكَانَكُمْ اَنْتُمْ وَشُرَكَآؤُكُمْ | سے کہیں گے ٹھہرو تم اور تمھارے شرکاء |
| فَزَیَّلْنَا بَیْنَهُمْ وَقَالَ شُرَكَآؤُهُمْ | پھر ان میں علیحدگی کر دیں گے اور ان کے |
| مَّا كُنْتُمْ اِیَّانَا تَعْبُدُوْنَ فَكَفٰی | شرکاء کہیں گے تم ہمیں نہیں پوجتے تھے |
| بِاللّٰهِ شَهِیْدًا بَیْنَنَا وَبَیْنَكُمْ | اللہ ہمارے اور تمھارے درمیان گواہی |

| | |
|---|---|
| اِنْ كُنَّا عَنْ عِبَادَتِكُمْ | کے لیے کافی ہے، ہم تمھاری بندگی سے |
| لَغَافِلِيْنَ (یونس-۲۸-۲۹) | بالکل بے خبر ہیں۔ |

**ب۔ جنّات پرستی** ملائکہ کی طرح جنات کو بھی اہلِ عرب بندگی سے مافوق اور زمرۂ الوہیت سے نسبت رکھنے والی مخلوق خیال کرتے تھے۔

قرآن نے ان کے اس خیال کا ذکر ان الفاظ میں فرمایا ہے۔

| | |
|---|---|
| وَجَعَلُوْا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ | اور انھوں نے اس کے اور جنات کے |
| الْجِنَّةِ نَسَبًا وَلَقَدْ عَلِمَتِ الْجِنَّةُ | درمیان رشتہ قائم کر رکھا ہے حالانکہ |
| اِنَّهُمْ لَمُحْضَرُوْنَ ه سُبْحٰنَ | جنات کو خوب معلوم ہے کہ انھیں خدا |
| اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ۔ | کے حضور عاجزانہ حاضر ہونا ہے، خدا پاک |
| (صافات ۱۵۸-۱۵۹) | ہے ان باتوں سے جو یہ بیان کرتے ہیں۔ |

اس نسبت ملند کی وجہ سے لازماً خدائی میں یہ جنات بھی شریک قرار دیے گئے۔

| | |
|---|---|
| وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَاءَ | اور انھوں نے اللہ کے لیے جنات میں |
| الْجِنَّ وَخَلَقَهُمْ | سے شرکاء ٹھہرا لیے ہیں حالانکہ اللہ نے |
| (انعام-۱۰۰) | ان کو پیدا کیا ہے۔ |

ان جنوں کو بالکل اس مفہوم میں نافع وضار خیال کیا جانے لگا جس مفہوم میں خدا کو نافع وضار خیال کیا جانا چاہیے۔ یعنی یہ سمجھا جانے لگا کہ اگر یہ کسی کو نقصان پہنچائیں تو کوئی ان کو روکنے والا نہیں اور اگر کسی کو نفع پہنچائیں تو کوئی ان کا ہاتھ پکڑنے والا نہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بعض اوقات ان کے جوش غضب کو ٹھنڈا کرنے کے لیے انسانی جانوں کی قربانی کی جانے لگی جو تذلل اور نیاز کا آخری درجہ ہے اور خدا کے سوا کوئی نہیں ہے جو اس کا حقدار ہو سکے۔ اگرچہ اس نے بھی بندوں سے اس صورت میں اس کا مطالبہ نہیں کیا ہے جس صورت میں مشرکین اپنے ان شرکاء

کے لیے جانی قربانیاں پیش کرتے تھے۔ قرآن اس کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے۔

| | |
|---|---|
| زَیَّنَ لِکَثِیْرٍ مِّنَ الْمُشْرِکِیْنَ | بہت سے مشرکین کے لیے ان کے شرکاء |
| قَتْلَ اَوْلَادِھِمْ شُرَکَآؤُھُمْ | (شرکاء جن) نے قتل اولاد کو پسندیدہ |
| (انعام - ۱۳۷) | بنادیا ہے۔ |

مصائب و آفات میں ان کی دہائی دی جاتی اور پناہ پکڑی جاتی۔

| | |
|---|---|
| وَاَنَّهٗ کَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ | اور یہ کہ انسانوں کی ایک جماعت جنوں |
| یَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ (جن-۶) | کی ایک جماعت کی پناہ پکڑتی ہے۔ |

زمرۂ الوہیت میں سے خیال کیے جانے کی وجہ سے یہ بھی خیال کیا جانے لگا کہ ان کی رسائی ملاء اعلیٰ تک ہے۔ وہاں سے غیب کی خبریں لاتے ہیں اور کاہنوں کو پہنچاتے ہیں۔ چنانچہ کہانت کے بازار کی ساری رونق انھیں کے دم سے تھی۔ قرآن نے اس کی تردید کی۔

| | |
|---|---|
| اِنَّا زَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْیَا | ہم نے زیریں آسمان کو ستاروں سے آراستہ |
| بِزِیْنَةِ نِ الْکَوَاکِبِ وَحِفْظًا | کیا اور ہر سرکش شیطان سے محفوظ کیا۔ |
| مِّنْ کُلِّ شَیْطَانٍ مَّارِدٍ لَا | وہ ملاء اعلیٰ کی طرف کان بھی لگانے |
| یَسَّمَّعُوْنَ اِلَی الْمَلَاِ الْاَعْلٰی | نہیں پاتے اور ہر طرف سے مارے |
| وَیُقْذَفُوْنَ مِنْ کُلِّ جَانِبٍ | جاتے ہیں دھتکارنے کے لیے۔ اور ان کے |
| دُحُوْرًا وَّلَھُمْ عَذَابٌ وَّاصِبٌ | لیے ایک عذاب دائمی ہے۔ مگر ہاں جو کوئی |
| اِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ فَاَتْبَعَهٗ | اچک لے کوئی بات تو تعاقب کرتا ہے |
| شِھَابٌ ثَاقِبٌ (صافات ۶-۸) | اس کا ایک دمکتا ستارہ۔ |

غیب دانی کے شوق میں کاہنوں نے ان سے تعلق پیدا کیا اور اس راستہ سے ایک خلق کثیر کو انھوں نے سفلی علوم کے فتنوں میں مبتلا کر دیا اور جنوں کی پرستش شروع ہوگئی۔ اسی کی طرف اشارہ ہے۔

يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ قَدِ اسْتَكْثَرْتُم مِّنَ الْإِنسِ (انعام - ۱۲۸)
اے گروہ جن، تم نے تو انسانوں میں سے بہتوں کو اپنا لیا۔

یہ کاہن لوگ عبدیت، و نیاز کے تمام لوازم ان کے لیے پورے کرتے اور غیب کی خبریں معلوم کرنے کے لیے ان کا مراقبہ کرتے اور پھر جاہل عوام غیب کی باتیں معلوم کرنے کے شوق میں جب، ان کے پاس آتے تو ان کو جھوٹی سچی باتیں بتا کر ان کو اُلّو بناتے۔ قرآن نے ان کی اس مکاری کا ذکر کیا ہے۔

يُلْقُونَ السَّمْعَ وَأَكْثَرُهُمْ كَاذِبُونَ (شعرا - ۲۲۳)
اور وہ کان لگاتے ہیں حالانکہ اکثر ان میں سے جھوٹے ہیں۔

قرآن مجید چونکہ مسجع اور مقفّٰی ہے اور کاہنوں کا کلام بھی مسجع اور مقفّٰی ہوتا تھا، نیز قرآن مجید میں چونکہ پیشینگوئیاں اور کاہنوں کے کلام میں بھی پیشینگوئیاں ہوتی تھیں اس وجہ سے اس ظاہری مشابہت کی بنا پر ابتدائے نبوت میں قریش نے طعنہ دیا، کہ آنحضرت صلعم کاہن ہیں اور یہ وحی فرشتوں کی لائی ہوئی وحی نہیں ہے بلکہ جس طرح کاہنوں پر جنّات وحی لاتے ہیں اسی طرح محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر بھی جنّات، وحی لاتے ہیں۔ قرآن نے اس کی تردید کی۔

وَمَا تَنَزَّلَتْ بِهِ الشَّيَاطِينُ ۝ وَمَا يَنبَغِي لَهُمْ وَمَا يَسْتَطِيعُونَ ۝ إِنَّهُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُولُونَ ۝ (الشعراء - ۲۱۰-۲۱۲)
اس کو شیطان لے کر نہیں اُترے ہیں اور نہ یہ ان کے لیے مناسب ہے اور نہ وہ کر سکتے ہیں، وہ تو سننے سے معزول کر دیے گئے ہیں۔

قرآن نے جو پہلا جواب قریش کو دیا ہے بعینہٖ یہی جواب اس سے پہلے اس طرح کے شبہ کے جواب میں حضرت مسیح علیہ السلام نے اپنے معترض فریسیوں کو دیا تھا۔ فریسیوں نے جب حضرت مسیح علیہ السلام کے پُر تاثیر کلام کو سنا اور ان کے معجزوں

اور کارناموں کو دیکھا اور یہ بھی دیکھا کہ لوگ برابر ان کے گرویدہ ہوتے چلے جا رہے ہیں تو ان کے بڑھتے ہوئے اثر کو روکنے اور عوام کو ان سے بدگمان کرنے کے لیے یہ مشہور کرنا شروع کر دیا کہ انھوں نے بڑے شیطان بعلزبول کو کسی عمل کے ذریعہ سے اپنے قابو میں کر لیا ہے اور اسی کی مدد سے یہ معجزے دکھاتے ہیں اور رعب جمانے کے لیے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ یہ سب کچھ وہ خدا کی مدد سے کر رہے ہیں۔ متی باب ۱۲ آیت ۲۴-۲۶ میں ہے:

"فریسیوں نے سن کر کہا یہ بدروحوں کے سردار بعلزبول کی مدد کے بغیر بدروحوں کو نہیں نکالتا۔ اس نے (مسیح نے) ان کے خیالوں کو جان کر ان سے کہا، جس بادشاہی میں پھوٹ پڑتی ہے وہ ویران ہو جاتی ہے اور جس شہر یا گھر میں پھوٹ پڑے گی وہ قائم نہ رہے گا۔ اور اگر شیطان ہی نے شیطان کو نکالا تو وہ آپ اپنا مخالف ہو گیا۔ پھر اُس کی بادشاہی کیونکر قائم رہے گی؟"

قرآن نے بھی "وما ینبغی لھم" کے الفاظ سے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ یہ وحی جس کا ایک ایک حرف شیطان اور اس کے سارے مقاصد و محبوبات کے بالکل خلاف ہے، شیطان کی مدد سے کیسے ہو سکتی ہے؟ وہ خود اپنے کاروبارِ ضلالت کو درہم برہم کرنے کے لیے ایسا مبارک صحیفۂ ہدایت کیسے نازل کر سکتا ہے؟ اگر وہ ایسا کرے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اُس نے اپنی سلطنت خود اپنے ہاتھوں برباد کر ڈالی اور آپ اپنا دُشمن بن گیا۔

دوسرا ٹکڑا وَمَا يَسْتَطِيعُونَ، إِنَّهُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُولُونَ (اور وہ کر بھی نہیں سکتے، وہ ملاءِ اعلیٰ کی خبریں سننے سے معزول کر دیے گئے ہیں) اس بات کی طرف اشارہ کر رہا ہے جس کا صافات والی آیت میں اوپر ذکر آ چکا ہے اور جس کا جنات نے خود، سورۂ جن میں اعتراف کیا ہے۔

وَأَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ    اور ہم بیٹھتے تھے اس کے (آسمان کے)

| | |
|---|---|
| لِلسَّمْعِ فَمَنْ يَّسْتَمِعِ الْاٰنَ | ٹھکانوں میں سننے کے لیے ملاءِ اعلیٰ کی |
| يَجِدْ لَهٗ شِهَابًا رَّصَدًا | باتیں لیکن اب جو سنے گا تو پائے گا اپنے |
| (جن - ۹) | لیے ایک شہاب گھات میں۔ |

ملاءِ اعلیٰ سے جنات کے اس تعلق کی قرآن نے جگہ جگہ تردید کی ہے اور بار بار یہ بات بیان فرمائی ہے کہ قرآن شیطانی تصرف سے بالکل پاک ہے اور ایسے مواقع پر بالعموم ستاروں کے گرنے، ان کے ٹوٹنے اور ان کے پھینکے جانے کی بطور شہادت قسم بھی کھائی ہے، جس سے شہاب ثاقب کا گرنا اور شیاطین کا دھتکارا جانا مراد ہے۔ سورہ واقعہ، سورۂ حاقہ، سورۂ تکویر اور سورۂ نجم میں اس کی مثالیں موجود ہیں۔ سورۂ شعرا میں ایک دوسرے پہلو سے اس کی تردید کی ہے۔ فرمایا کہ پیغمبر پر شیاطین نہیں آسکتے۔ جس طرح مکھی صرف غلیظ اور نجس چیزوں ہی پر بیٹھتی ہے اسی طرح جنات و شیاطین صرف گندی اور نجس روحوں پر ہی اترتے ہیں وہ خدا کے رسولوں اور نبیوں پر آنے کی جرأت نہیں کر سکتے اور نہ ان کے کلام میں اپنی باتوں کی کوئی ملاوٹ کر سکتے ہیں۔

| | |
|---|---|
| هَلْ اُنَبِّئُكُمْ عَلٰى مَنْ تَنَزَّلُ | کیا میں تمھیں بتاؤں شیاطین کن لوگوں پر |
| الشَّيٰطِيْنُ ۝ تَنَزَّلُ عَلٰى كُلِّ اَفَّاكٍ | اترتے ہیں؟ وہ ہر لپاٹئے گنہگار پر اترتے |
| اَثِيْمٍ ۝ يُّلْقُوْنَ السَّمْعَ وَ | ہیں (یعنی کاہنوں پر) وہ کان لگاتے |
| اَكْثَرُهُمْ كٰذِبُوْنَ - | ہیں (اخبار غیب سننے کے لیے باندار |
| (شعراء - ۲۲۱-۲۲۳) | مراقبہ بیٹھتے ہیں) اور اکثر جھوٹے ہوتے |

ہیں (یعنی حقیقت کچھ بھی نہیں ہوتی مگر بہت سی باتیں گھڑ کے سنا دیتے ہیں۔

**ج۔ کواکب پرستی** دنیا کی تقریباً تمام بُت پرست قوموں میں سورج اور چاند کی پرستش رائج رہی ہے۔ اہلِ عرب بھی ان کو زمرۂ الوہیت میں خیال کرتے اور ان کی عبادت کرتے تھے۔ قرآن نے اس کی تردید کی۔

| | |
|---|---|
| وَمِنْ اٰیٰتِهِ الَّیْلُ وَالنَّهَارُ | اور اس کی نشانیوں میں سے رات اور |
| وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ لَا تَسْجُدُوْا | دن، سورج اور چاند ہیں ۔ نہ سورج |
| لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوْا | کو سجدہ کرو نہ چاند کو، سجدہ کرو اس خدا |
| لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَهُنَّ اِنْ کُنْتُمْ | کو جس نے ان کو پیدا کیا ہے ، اگر تم اسی |
| اِیَّاهُ تَعْبُدُوْنَ (حٰمٓ السجدۃ - ۳۷) | کی بندگی کرتے ہو۔ |

اہل عرب نکھتروں کی تاثیر کے بھی معتقد تھے ۔ اُن کا خیال تھا کہ انواء (نکھتروں) کو زمین کی خوش حالی میں بڑا دخل ہے ۔ بارش انھیں کے جود وکرم کا نتیجہ سمجھتے تھے ۔ بارش ہوتی تو کہتے مطرنا بنوء کذا (فلاں نکھتر خوب برسی ۔ اور یہ نسبت ان کے نزدیک مجازی نہیں ہوتی تھی بلکہ وہ فی الحقیقت اس بات پر ایمان رکھتے تھے کہ پانی برسانا ان نکھتروں کا کام ہے ۔

مشہور ستارہ شِعریٰ بھی اہل عرب کا معبود تھا ۔ یہ گرمیوں کے زمانہ میں طلوع ہوتا تھا ۔ تابط شرا کا شعر ہے :۔

شامس فی القر حتی اذا ما

ذکت الشعری فبرد و ظل

(ممدوح) سردیوں میں گرمی پہنچاتا ہے ، یہاں تک کہ جب شعریٰ طلوع ہوتا ہے (گرما میں) تو وہ ٹھنڈک اور سایہ بن جاتا ہے ۔

عرب میں جاڑوں کا موسم قحط و افلاس کا موسم ہوتا تھا ۔ شمال کی ٹھنڈی ہوائیں اس زمانہ میں پورے ملک کی تمام کاروباری سرگرمیوں کو سرد کر دیتی تھیں ۔ اسی وجہ سے اہل عرب جاڑے کے موسم کو "ایام نحسات" کہتے تھے ۔ آمد و رفت اور تجارت کی چہل پہل زیادہ تر گرمیوں کے موسم کے ساتھ مخصوص تھی اور چونکہ یہی زمانہ شعریٰ کے طلوع ہونے کا زمانہ ہوتا تھا اس وجہ سے یہ ساری خیر و برکت اسی کی طرف منسوب ہوتی تھی ۔ قرآن نے سورۂ نجم میں اسی وہم کی تردید کی ہے ۔

وَاَنَّہٗ هُوَ اَغْنٰى وَاَقْنٰى — اور وہی لوگوں کو مال دار اور سرمایہ دار

وَاَنَّہٗ هُوَ رَبُّ الشِّعْرٰى — کرتا ہے اور وہی شعریٰ کا رب

(النجم ۴۸-۴۹) — ہے۔

اہل عرب کے تصور مذہبی نے ان مختلف عناصر کو جوڑ کر دیوتاؤں کی ایک بزم (CONSTELLATION OF GODS) سجائی جس میں خدا کی حیثیت ایک عرش والے (ذوالعرش) یا مہادیو کی قرار دی اور ان دیوتاؤں کو مقربین بارگاہ اور ارکان سلطنت کی حیثیت بخشی۔ پھر اس تصور میں تشبیہ نے، جو ہمیشہ سے شرک کے نہایت اہم اسباب وعوامل میں سے رہی ہے، رنگ آمیزی کی اور یہ خیال پیدا ہوا کہ جس طرح زمین کے ملوک وسلاطین اپنے دور دراز کے علاقوں کا انتظام اپنے حکام وعمال کے سپرد کر دیتے ہیں اسی طرح خدائے عرش نشین نے بھی زمین کے معاملات کا انتظام وانصرام ان دیوتاؤں کے سپرد کر چھوڑا ہے۔ اس نے اپنا تعلق صرف آسمان کے نظم واہتمام سے رکھا ہے، جس کو دارالسلطنت کی حیثیت حاصل ہے۔ باقی رہی زمین تو اس کے معاملات میں اس کی حیثیت بس ایک گوشہ نشین علاقہ لعل کی ہے۔ اس کی عام تدبیر وسیاست سے وہ بذات خود متعلق (IN TOUCH) نہیں ہے۔ یہ تصور ایک تنزیہی تصور ہے جو بعض مشرک اقوام میں پایا جاتا ہے لیکن یہ تنزیہہ ایک طرف تو خدا کی "قدرت اور علم کی نفی ہے۔ دوسری طرف اس سے خدا کی خدائی اور اس کی حاکمیت کی تقسیم لازم آتی ہے۔ اس وجہ سے قرآن نے اس کی تردید فرمائی ہے۔

اس تقسیم سے خدا کی قدرت اور اس کے علم کی جو نفی ہوتی ہے اور اس پر عجز اور ناواقفیت کا جو عیب لگتا ہے اس کی تردید اس طرح فرمائی ہے۔

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ — اللہ، نہیں ہے کوئی معبود مگر وہ زندہ

الْقَيُّوْمُ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ — اور قائم رہنے والا۔ اس کو اونگھ

| | |
|---|---|
| وَلَا نَوْمٌ لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ | اور نیند نہیں لاحق ہوتی۔ جو کچھ آسمانوں |
| وَمَا فِي الْأَرْضِ ......... | اور زمین میں ہے سب اسی کے |
| وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَ | لیے ہے۔....... اس کی سلطنت |
| الْأَرْضَ وَلَا يَؤُوْدُهُ حِفْظُهُمَا | آسمان و زمین سب پر حاوی ہے اور ان |
| (البقرہ - ۲۵۵) | کی حفاظت اس پر گراں نہیں ہے۔ |
| إِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِي خَلَقَ | تمہارا مالک وہ اللہ ہے جس نے |
| السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ | پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو چھ دن |
| أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ | میں۔ پھر وہ عرش پر متمکن ہوا انتظام |
| يُدَبِّرُ الْأَمْرَ (یونس - ۳) | کرتا ہوا۔ |

اس تقسیم سے خدا کی بادشاہی میں بٹوارے کی جو شکل پیدا ہوتی ہے اس کی تردید اس طرح فرماتی ہے۔

| | |
|---|---|
| وَقَالَ اللّٰهُ لَا تَتَّخِذُوْا إِلٰهَيْنِ | اور اللہ نے فرمایا نہ بناؤ دو معبود، |
| اثْنَيْنِ إِنَّمَا هُوَ إِلٰهٌ وَّاحِدٌ | وہ تو ایک ہی معبود ہے پس مجھی سے |
| فَإِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ (نحل ۵۱) | ڈرو۔ |
| وَهُوَ الَّذِي فِي السَّمَاءِ إِلٰهٌ | وہی ایک آسمان میں بھی معبود ہے |
| وَفِي الْأَرْضِ إِلٰهٌ وَهُوَ | اور وہی ایک زمین میں بھی معبود ہے |
| الْحَكِيْمُ الْعَلِيْمُ (زخرف - ۸۴) | اور وہ حکمت والا اور علم والا ہے |

اسی تصور کی تردید ان آیات میں بھی ہے۔

| | |
|---|---|
| قُلْ لَّوْ كَانَ مَعَهُ آلِهَةٌ كَمَا | کہو اگر اس کے ساتھ اور معبود بھی |
| يَقُوْلُوْنَ إِذًا لَّابْتَغَوْا إِلٰى ذِي | ہوتے جیسا کہ وہ کہتے ہیں تو وہ عرش |
| الْعَرْشِ سَبِيْلًا (بنی اسرائیل - ۴۲) | والے سے نزاع کی راہ ڈھونڈتے۔ |

| | |
|---|---|
| لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا | اگر آسمان و زمین میں اللہ کے سوا اور معبود ہوتے تو وہ دونوں درہم |
| (الانبیاء - ۲۲) | برہم ہو جاتے۔ |

زمین کے معاملات میں براہ راست متصرف ماننے کی وجہ سے اہل عرب نے ان دیوتاؤں کو عبادت و تعظیم کے ان تمام لوازم کا مستحق ٹھہرایا جو خدا کے لیے مخصوص تھے۔ خدا کے لیے کعبہ تھا، ان کے لیے بھی الگ الگ استھان اور معبد بنائے گئے خدا کے لیے حج اور قربانی کے طریقے تھے، ان کے لیے بھی حج اور قربانی کے مراسم اختیار کیے گئے۔ خدا نے اپنے لیے شعائر اور قربانی و نیاز کے جانور مقرر کیے۔ مشرکین نے اپنے معبودوں کے لیے بھی بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حام مخصوص کر دیئے[1]۔ خدا کے لیے زمین کی پیداوار اور چوپایوں میں سے ایک متعین حصہ تھا۔ ان کے دیوتا بھی اس حصے کے مستحق ٹھہرے اور چونکہ زمین کے نظم و اہتمام کے اصلی ذمہ دار ان کے خیال کے مطابق، یہی تھے اس وجہ سے خدا کے مقابل میں ان کا حق کچھ زیادہ ہی رہا۔ (وَجَعَلُوا لِلَّهِ مِمَّا ذَرَأَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْأَنْعَامِ نَصِيبًا فَقَالُوا هَٰذَا لِلَّهِ بِزَعْمِهِمْ وَهَٰذَا لِشُرَكَائِنَا فَمَا كَانَ لِشُرَكَائِهِمْ فَلَا يَصِلُ إِلَى اللَّهِ وَمَا كَانَ لِلَّهِ فَهُوَ يَصِلُ إِلَىٰ شُرَكَائِهِمْ سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ[2]) خدا کا حصہ ان کے شرکاء

---

[1] بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حام یہ جانوروں کی مختلف قسمیں ہیں جن کو اہل عرب اپنے دیوتاؤں کے نام پر چھوڑتے تھے اور ان کو ہدی کے جانوروں کی طرح مقدس سمجھتے تھے۔

[2] اور اللہ نے جو کھیتی اور چوپائے پیدا کیے اس میں انھوں نے اللہ کا ایک حصہ رکھا۔ پس کہا کہ یہ اللہ کے لیے ہے، ان کے زعم کے مطابق، اور یہ ہمارے شرکاء کے لیے ہے۔ پس جو حصہ ان کے شرکاء کا ہوتا ہے وہ اللہ کو نہیں پہنچتا اور جو حصہ اللہ کا ہوتا ہے وہ ان کے شرکاء کو مل سکتا ہے۔ برا فیصلہ ہے جو وہ کرتے ہیں۔ (انعام - ۱۳۶)

کی طرف منتقل ہو سکتا تھا لیکن شرکاء کا حصّہ خدا کی طرف منتقل نہیں ہو سکتا تھا۔ خدا کے لیے صرف جانوروں کی قربانی تھی۔ لیکن شرکاء کے لیے جیسا کہ اوپر گزرا، بعض حالات میں اولاد تک کی قربانی پیش کی جاتی تھی۔ خدا نے صرف چند چیزیں حرام کی تھیں لیکن ان دیوتاؤں کے تعلق سے بہت سی چیزیں حرام (TABOO) ہو گئیں۔ خدا وحی و الہام نازل کرتا تھا۔ یہ دیوتا بھی فال کے تیروں کی زبان سے اپنے غیبی فیصلے صادر کرنے لگے۔

خواص یہ ساری نیاز مندیاں ملائکہ، جنات اور کواکب کے لیے بجا لاتے تھے۔ لیکن عوام کو اتنی پرواز بھی نصیب نہیں تھی۔ وہ مٹی، پتھر اور لکڑی وغیرہ کے بنے ہوئے بتوں ہی کو اصل کارفرما مانتے تھے۔ اسی وجہ سے قرآن نے بت پرستی کی تردید میں خواص و عوام دونوں کی ذہنیت کو سامنے رکھا۔ مثلاً اعراف میں پہلے فرمایا:۔

| | |
|---|---|
| اِنَّ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ | جن کو تم اللہ کے سوا پکارتے ہو |
| دُوْنِ اللّٰہِ عِبَادٌ اَمْثَالُکُمْ | تمہارے ہی طرح بندے ہیں۔ پس ان |
| فَادْعُوْھُمْ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لَکُمْ | کو پکارو وہ تمہاری فریاد رسی کریں |
| اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ (۱۹۴) | اگر سچے ہو۔ |

پھر فرمایا:۔

| | |
|---|---|
| اَلَھُمْ اَرْجُلٌ یَّمْشُوْنَ بِھَا | کیا ان کے پاؤں ہیں جن سے چلتے |
| اَمْ لَھُمْ اَیْدٍ یَّبْطِشُوْنَ بِھَا | ہیں؟ کیا ان کے ہاتھ ہیں جن سے پکڑتے |
| اَمْ لَھُمْ اَعْیُنٌ یُّبْصِرُوْنَ بِھَا | ہیں؟ کیا ان کے آنکھیں ہیں جن سے |
| اَمْ لَھُمْ اٰذَانٌ یَّسْمَعُوْنَ | دیکھتے ہیں؟ کیا ان کے کان ہیں جن |
| بِھَا (۱۹۵) | سے سنتے ہیں؟ |

د۔ آبا پرستی | دیوتاؤں کی اسی بزم میں انھوں نے اپنے آباؤ اجداد میں سے ان

بزرگوں کو جگہ دی جن کے مذہبی تقدس کی روایات ان میں پھیلی ہوئی تھیں۔ ان کی قبریں اور ان کے آثار حصولِ برکت و قبولیت دُعا کے مرکز بنتے بنتے بالآخر معبد بن گئے اور آہستہ آہستہ ان کے متعلق بھی انھوں نے اسی طرح کے عقائد و تصورات قائم کر لیے جس طرح کے عقائد و تصورات انھوں نے جنات اور ملائکہ سے متعلق قائم کر لیے تھے اور جن کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے۔ قرآن نے اس کی تردید فرمائی

| | |
|---|---|
| وَالَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ لَا | اور جن کو اللہ کے سوا پکارتے ہیں وہ |
| یَخْلُقُوْنَ شَیْئًا وَّھُمْ یُخْلَقُوْنَ۔ اَمْوَاتٌ | کچھ پیدا نہیں کرتے بلکہ خود مخلوق |
| غَیْرُ اَحْیَآءٍ وَمَا یَشْعُرُوْنَ اَیَّانَ | ہیں۔ مردہ ہیں زندہ نہیں ہیں۔ انھیں |
| یُبْعَثُوْنَ (نحل ۲۰-۲۱) | کچھ خبر بھی نہیں کہ کب اٹھیں گے |

اس آباء پرستی کی سب سے زیادہ منحوس شکل یہ تھی کہ آباء و اجداد کے رواج اور چلن کو انھوں نے دین اور شریعت کی حیثیت دے دی چنانچہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کی مخالفت میں سب سے زیادہ قوی محرک ان کا یہی آباء پرستی کا خبط تھا۔ جب ان کو اللہ کے رستہ پر چلنے کی دعوت دی جاتی اور خدا کے احکام و قوانین بتائے جاتے تو کہتے۔ کیا ایک مجنون شاعر کے کہنے سے ہم اپنے آباء و اجداد کا طریقہ چھوڑ دیں؟ یہ نہیں ہو سکتا۔

| | |
|---|---|
| وَاِذَا قِیْلَ لَھُمْ تَعَالَوْا | جب ان سے کہا جاتا ہے اس چیز کی |
| اِلٰی مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ وَاِلَی | طرف آؤ جو اللہ نے اتاری ہے اور |
| الرَّسُوْلِ قَالُوْا حَسْبُنَا مَا | رسول کی طرف آؤ، کہتے ہیں ہم نے اپنے |
| وَجَدْنَا عَلَیْہِ اٰبَآءَنَا | باپ دادا کو جس دھرے پر پایا ہے وہ |
| اَوَلَوْ کَانَ اٰبَآؤُھُمْ لَا | ہمارے لیے بس ہے۔ کیا اگر ان کے آباء |
| یَعْلَمُوْنَ شَیْئًا وَّلَا | اجداد کچھ نہ جانتے رہے ہوں اور نہ |

يَهْتَدُوْنَ (مائدہ ۵-۱۰۴) پر نہ رہے ہوں جب بھی؟

اس آیت کے آخری حصہ سے معلوم ہوتا ہے کہ باپ دادا کا چلن اس اعتبار سے تو اچھی چیز ہے کہ طبیعت کو اس سے انس اور لگاؤ ہوتا ہے لیکن کسی چلن کی اچھائی کے لیے مجرد اتنی بات کافی نہیں ہو سکتی کہ وہ آباء و اجداد سے چلا آرہا ہے۔ اس کے متعلق سب سے مقدم سوال یہ ہے کہ وہ عقل کے خلاف تو نہیں ہے۔ فطرت انسانی سے بعید تو نہیں ہے؟ اخلاق کے منافی تو نہیں ہے؟ بالاجمال یہ کہ خدا کے بتائے ہوئے طریقہ سے الگ تو نہیں ہے؟ اگر ان کسوٹیوں پر وہ صحیح اتر جائے تو بے شک وہ صحیح ہے اور آباؤ اجداد کا طریقہ ہونا اس کی صحت کے لیے ایک مزید سفارش ہے اور اگر ان کسوٹیوں پر وہ کھوٹا ثابت ہو جائے تو وہ باطل ہے اور کسی باطل کا موروثی ہونا اس کی صحت کی دلیل نہیں ہو سکتا۔

اس معاملہ میں دنیا ہمیشہ سے افراط و تفریط میں مبتلا رہی ہے۔ جاہلیت قدیمہ کا نظریہ تو، جیسا کہ اوپر گزرا، یہ تھا کہ آباؤ اجداد کا طریقہ بہر صورت حق ہے۔ اس کے حق ہونے کی دلیل یہ ہے کہ وہ آباؤ اجداد سے چلا آرہا ہے۔ جاہلیت جدیدہ اس معاملہ میں جو نقطۂ نظر رکھتی ہے اس کی بہترین ترجمانی مشہور شاعر ٹینی سن کے لفظوں میں یوں کی جا سکتی ہے کہ "اگر بہتر سے بہتر چلن بھی ہمیشہ باقی رہے تو دنیا کو بگاڑ ڈالے" یہ دونوں راہیں افراط و تفریط کی راہیں ہیں۔ ایک کی بنا تقلید اعمیٰ پر ہے جو عقل سے کام نہ لینے کا نتیجہ ہے۔ دوسری کی بنا خیرہ سری اور بددماغی پر ہے جو عقل کو اس کی حد سے بڑھانے کا نتیجہ ہے۔ ایک شرک و بت پرستی کی ایک خاص قسم آبا پرستی (ANCESTOR WORSHIP) کی طرف رہبری کرتی ہے۔ دوسری الحاد و زندقہ کی طرف لے جاتی ہے جو خود پرستی کا دروازہ ہے۔ اور ان دونوں ہی راہوں میں انسان خدا پرستی کی حقیقت سے محروم اور عاقبت بینی کی ذمہ داریوں سے بالکل غافل ہو

جاتا ہے۔ اگر انسان کے لیے یہ بات جائز نہیں ہو سکتی کہ وہ اپنی عقل و تمیز پر مہر لگا کر چوپایوں کے گلہ میں داخل ہو جائے تو یہ بات بھی جائز نہیں ہو سکتی کہ ایک راستہ کی غلطی اور دوسرے کی صحت کا فیصلہ کیے بغیر وہ ایک کو چھوڑ کر دوسرے پر چل کھڑا ہو۔

ان دونوں راہوں میں انسان شیطان کے نقش قدم کی پیروی کا مجرم ہے۔ عقل و فطرت کا راستہ وہ ہے جس کی شہادت دُنیا کے اچھے انسانوں اور انبیاء علیہم السلام کی قبل بعثت کی زندگیوں سے ملتی ہے۔ ان کا طریقہ یہ رہا ہے کہ جوں ہی سن رشد کی کرنیں ان پر چمکیں انھوں نے سب سے پہلے اپنے اس ذہنی ورثہ کا جائزہ لیا جو انھیں آباؤ اجداد سے پہنچا تھا اور اس میں سے جو چیز بھی انھیں عقل و فطرت سے متناقض نظر آئی اس کو اُنھوں نے بے درنگ چھوڑ دیا۔ اس راہ میں انھیں خلق کی طرف سے بے شمار مصیبتیں بھی جھیلنی پڑیں لیکن اس کی اُنھوں نے کوئی پروا نہیں کی۔ یہی لوگ نوع انسانی کے گل سر سبد تھے اور اپنے اس جوہر کی وجہ سے حق سے مستفید ہونے میں ہمیشہ سب سے آگے رہے۔ جس طرح سورج طلُوع ہوتا ہے تو اس کی کرنیں سب سے پہلے اُونچی منڈیروں ہی پر چمکتی ہیں۔ اسی طرح جب کبھی دنیا میں آفتاب حق طلوع ہوا انہی کے دل و دماغ اس سے سب سے پہلے نورانی ہوئے۔ اس کی ایک عمدہ مثال حضرت یوسف علیہ السلام کی زندگی ہے۔ آپ نے فرمایا۔

| | |
|---|---|
| اِنِّیْ تَرَکْتُ مِلَّۃَ قَوْمٍ لَا | میں نے اس قوم کے مذہب کو چھوڑا |
| یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَھُمْ بِالْاٰخِرَۃِ | جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتی تھی اور وہ |
| ھُمْ کٰفِرُوْنَ وَاتَّبَعْتُ مِلَّۃَ | آخرت کی بھی منکر تھی اور میں نے |
| اٰبَآءِیْ اِبْرٰھِیْمَ وَاِسْحٰقَ وَ | اپنے آباؤ اجداد۔ ابراہیم، اسحٰق اور |
| یَعْقُوْبَ (یوسف۔ ۳۸) | یعقوب کی پیروی کی۔ |

حضرت یوسف علیہ السلام کے متعلق معلوم ہے کہ ظاہر میں نہ انھوں نے کسی

قرآن نے تنبیہ کیا کہ خدا کی عبادت اس کی اطاعت کے بغیر بے معنی ہے، خدا کی بندگی کالازمی اقتضا یہ ہے کہ صرف اسی کی اطاعت کی جائے۔

| | |
|---|---|
| اِنَّا اَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ | ہم نے تمھاری طرف کتاب اتاری ہے |
| فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ | حق کے ساتھ، پس اللہ ہی کی بندگی کرو |
| الدِّيْنَ ۭ اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ | اسی ایک کی اطاعت[1] کرتے ہوئے، ہاں |
| الْخَالِصُ (زمر ۲-۳) | اطاعت خالص اللہ ہی کے لیے زیبا ہے |

اس مضمون کی آیتیں قرآن مجید میں کئی جگہ ہیں۔ سب کو نقل کرنے میں طوالت ہے۔ ان سب کا مطلب یہ ہے کہ خدا نے جو دین نازل کیا تھا اس میں تحریف و تبدیل نے بہت سے اختلافات ڈال دیے تھے اور بے شمار بدعتیں داخل کر دی تھیں۔ اس وجہ سے خدا کی خالص عبادت و بندگی کی راہ مسدود ہو گئی تھی۔ ان بدعات کی موجودگی میں جو لوگ بھی عبادت کر رہے تھے، وہ خدائے واحد کی عبادت سے محروم تھے۔ وہ نام تو اللہ کا ضرور لیتے تھے لیکن ہر قدم پر غیر اللہ کی اطاعت سے دوچار تھے۔ اس کتاب نے یہ اختلافات مٹا دیے اور شریعت کو غیر الٰہی عناصر سے پاک کر دیا۔ یہ حق و باطل کے درمیان ایک قولِ فیصل کی حیثیت سے نمودار ہو گئی۔ اب خدا کی اطاعت و بندگی کی سیدھی راہ باز ہے۔ پس اسی کی عبادت کرو تنہا اسی کی اطاعت کرتے ہوئے یعنی بندگی وہی معتبر ہے جو خالص اطاعت کے ساتھ ہو۔ اگر محض مخصوص اوقات میں خدا کا نام جپ لیا جائے اور اطاعت میں اس کے ساتھ دوسروں کو بھی شریک کیا جائے، خواہ وہ شریک انسان کا اپنا ہی نفس ہو، تو یہ بندگی نہیں "نمرود کی خدائی" ہے جس سے کسی بھلائی کی توقع نہیں رکھنی چاہیے۔ اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ

---

[1] دین کے معنی یہاں اطاعت کے ہیں الدین الطاعۃ وقد دنتہ ودنت لہ اطعتہ قال عمرو بن کلثوم وایاما لنا غرا کراما ؛ عصینا الملک فیہا ان ندینا۔

اَفَاَنْتَ تَكُوْنُ عَلَيْهِ وَكِيْلًا۔[1]

خدا کی اطاعت کا راستہ یہ ہے کہ اس کے انبیاء کی پیروی کی جائے۔ وَمَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی)۔ یہی وجہ ہے کہ ہر نبی کی دعوت یہ رہی ہے کہ اللہ کی بندگی کرو۔ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ وَاَطِيْعُوْنِ۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کی عبادت و بندگی کی راہ یہ ہے کہ نبی کی اطاعت کی جائے اور ساتھ ہی ان لوگوں کے راستہ کی پیروی سے انکار کیا جائے جو اللہ کے راستہ سے منحرف ہیں۔ چنانچہ انبیاء کرام علیہم السلام نے اس کی بھی تصریح فرما دی کہ وَلَا تُطِيْعُوْٓا اَمْرَ الْمُسْرِفِيْنَ ہماری اطاعت کرو اور ان لوگوں کی اطاعت نہ کرو جنھوں نے حدودِ الٰہی سے تجاوز کیا ہے اور خدا کے باغی ہیں۔

توحید کا یہی وہ مقام ہے جہاں موحدین اور مشرکین میں اصلی نزاع برپا ہوتی ہے جب خدا کی عبادت صرف "پوجا پاٹ" پر قناعت نہیں کرتی بلکہ یہ مطالبہ بھی کرتی ہے کہ جو خدا کے بندے ہیں وہ صرف خدا ہی کی اطاعت بھی کریں اور اس کی اطاعت کے سوا ہر اس اطاعت کو شرک قرار دیں جو خدا کی اطاعت کے خلاف ہے تو اس بات کو وہ لوگ نہیں برداشت کر سکتے جو خود اپنی خدائی کے دعویدار ہوتے ہیں۔ علماء اسلام میں سے علامہ ابن تیمیہؒ نے اس بحث پر العبودیۃ کے عنوان سے ایک رسالہ لکھا ہے جو نہایت مفید مباحث پر مشتمل ہے۔ اس سے یہ حقیقت روشن ہوتی ہے کہ "عبادت" صرف چند رسوم کا نام نہیں ہے بلکہ پورا دین اس کے مفہوم میں داخل ہے اور یہ کہ اطاعت کے بغیر خدا کی عبادت کے کوئی معنی ہی نہیں ہیں۔

ب۔ اسی بنیاد پر قرآن نے وضع قانون مخصوص اللہ تعالیٰ کا حق قرار دیا اور کسی کے لیے اس میں ادنیٰ شرکت بھی گوارا نہیں فرمائی۔ چنانچہ اکثر جگہ توحید کے بیان کے

---

[1] دیکھو تو اس کو جس نے اپنی خواہش کو معبود بنا رکھا ہے، کیا تم اس کے ذمہ دار ہو سکتے ہو۔

ساتھ اس امر کا بھی ذکر کیا کہ کسی شے کو حرام اور کسی چیز کو حلال قرار دینا اللہ تعالیٰ کا حق ہے۔ وہ ہی بادشاہ ہے۔ اسی کو حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنی رعیت اور اپنی مملکت کے لیے قانون بنائے۔ اس کے قانون کے خلاف قانون سازی توحید کی خلاف ورزی، خطوات شیاطین کی پیروی اور خدا کی عبادت کی نفی ہے۔ جو شخص اللہ کے قانون کے خلاف قانون بناتا ہے وہ اپنے تئیں اللہ تعالیٰ کا شریک قرار دیتا ہے اور اگر دوسرے کے لیے اس حق کو تسلیم کرتا ہے تو اس کو اللہ کے سوا رب بناتا ہے اور اگر اس امر کا دعویٰ کرتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے تو یہ شرک کے ساتھ خدا پر افترا بھی ہے۔ سورۂ بقرہ میں آیات ۱۶۳-۱۷۳ پڑھیے۔ شروع کی پانچ آیتوں میں توحید کا بیان ہے پھر اسی کے ذیل میں یہ آیت آتی ہے۔

| | |
|---|---|
| یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِی الْاَرْضِ | اے لوگو۔ کھاؤ ان چیزوں میں سے جو زمین |
| حَلٰلًا طَیِّبًا وَّ لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ | میں ہیں حلال اور پاکیزہ اور شیطان کے |
| الشَّیْطٰنِ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ | نقش قدم کی پیروی نہ کرو۔ وہ تمہارا |
| مُّبِیْنٌ (۱۶۸) | کھلا ہوا دشمن ہے۔ |

"شیطان کے نقش قدم کی پیروی نہ کرو" سے اس کی اس دعوت شرک کی طرف اشارہ ہے جس کا اس نے روز اوّل ہی میں اعلان کر دیا تھا وَلَاُضِلَّنَّهُمْ وَلَاُمَنِّیَنَّهُمْ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَیُبَتِّكُنَّ اٰذَانَ الْاَنْعَامِ وَلَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَیُغَیِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ۔ (میں ان کو بھٹکاؤں گا، آرزوؤں میں پھنساؤں گا اور مشورہ دوں گا تو وہ چوپایوں کے کان کاٹیں گے اور مشورہ دوں گا تو وہ اللہ کی بنائی ہوئی فطرت کو بدلیں گے) اس کے بعد شیطان کی دعوت کا اصل مقصد واضح کیا ہے کہ وہ برائی اور بے حیائی کی دعوت دیتا ہے اور چاہتا ہے کہ انسان خود اپنے جی سے حلال و حرام کرے اور اپنا شارع آپ بنے اور پھر بلا سند اس کو خدا کی طرف منسوب کرے۔ اِنَّمَا یَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْٓءِ وَالْفَحْشَآءِ وَاَنْ

تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ) اس کے بعد فرمایا کہ اگر انسان کو قانون الٰہی کی پیروی کی دعوت دی جاتی ہے تو باپ دادا کی روایات کی سند لاتا ہے حالانکہ باپ دادا کی روایت کوئی سند نہیں ہے جب تک ان کے اقوال و اعمال کی بنیاد شرع الٰہی پر نہ ہو۔ باپ دادا کے طریقہ پر شریعت کی سند کے بغیر جم جانا اپنے آپ کو انسانوں کی صف سے نکال کر چوپایوں کے گلہ میں داخل کر دینا اور گونگوں، بہروں اور اندھوں کے زمرہ میں شامل ہو جانا ہے۔ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْئًا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ وَمَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِيْ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّنِدَآءً صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ (۱۷۰-۱۷۱) (اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس چیز کی پیروی کرو جو اللہ نے اتاری ہے تو جواب دیتے ہیں کہ بلکہ ہم اس طریقہ کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ کیا اس صورت میں بھی کہ ان کے باپ دادا نہ کچھ سمجھتے رہے ہوں اور نہ راہِ حق پر رہے ہوں؟ ان کافروں کا حال بالکل ویسا ہی ہے جیسے ایک شخص پکارے ایک گلہ کو جو پکار اور آواز کے سوا کچھ نہیں سنتا۔ یہ بہرے ہیں، گونگے ہیں اور اندھے ہیں، پس وہ سمجھنے کے نہیں) پھر فرمایا کہ جو لوگ خدا کی عبادت کے مدعی ہیں تو اس کی عبادت صرف اس طرح نہیں ہو سکتی کہ عبادت تو اس کی کریں لیکن حرام و حلال اپنے جی سے کریں۔ اس کی عبادت کا لازمی اقتضا یہ ہے کہ وضع قانون اور تشریع کا حق خالص اسی کے لیے تسلیم کریں۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ (اے ایمان والو کھاؤ ان پاکیزہ چیزوں میں سے جو ہم نے تم کو بخشی ہیں اور اللہ کا شکر کرو، اگر تم اسی کی بندگی کرتے ہو)

اسی بنیاد پر اللہ کے ایمان اور اس کی بندگی کے لیے تمام خدائی ادیان میں

اس بات کو ایک لازمی شرط قرار دیا گیا ہے کہ زندگی کے معاملات اللہ کی اتاری ہوئی شریعت کے مطابق چلائے جائیں اور شریعت کو چھوڑ کر کسی اور چیز کو رہنما نہ بنایا جائے۔ قرآن سابق امتوں کی تاریخ بیان کرتے ہوئے خبر دیتا ہے کہ یہی حکم یہود کو دیا گیا تھا۔

| | |
|---|---|
| اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا | ہم نے توریت اتاری جس میں رہنمائی |
| هُدًى وَّنُوْرٌ يَحْكُمُ بِهَا | اور روشنی ہے۔ اس کے ذریعہ سے |
| النَّبِيُّوْنَ الَّذِيْنَ اَسْلَمُوْا | معاملات کا فیصلہ کرتے تھے فرمانبردار |
| لِلَّذِيْنَ هَادُوْا وَالرَّبّٰنِيُّوْنَ وَ | انبیاء یہودیوں کے لیے اور اسی کے |
| الْاَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ | ذریعے سے فیصلہ کرتے تھے ربی اور |
| كِتٰبِ اللّٰهِ وَكَانُوْا عَلَيْهِ | علماء کیونکہ وہ اللہ کی کتاب کے امین |
| شُهَدَآءَ فَلَا تَخْشَوُا | تھے اور اس کے گواہ بنائے گئے تھے |
| النَّاسَ وَاخْشَوْنِ وَلَا | اور ان کو یہ ہدایت کی گئی تھی کہ لوگوں سے |
| تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا | نہ ڈرنا اور مجھی سے ڈرنا اور میری آیات |
| وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ | کو تھوڑی پونجی کے عوض نہ بیچنا اور جو |
| اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ. | نہ فیصلہ کریں گے اس کے مطابق جو اللہ نے |
| (مائدہ ۵، ۴۴) | اتارا ہے تو وہ لوگ کافر قرار پائیں گے۔ |

پھر قرآن مجید خبر دیتا ہے کہ بعینہٖ یہی حکم نصاریٰ کو بھی دیا گیا تھا کہ وہ بھی اللہ کی اتاری ہوئی شریعت کے مطابق معاملات زندگی کو چلائیں ورنہ فاسق ٹھہریں گے۔

| | |
|---|---|
| وَلْيَحْكُمْ اَهْلُ الْاِنْجِيْلِ بِمَآ اَنْزَلَ | اور چاہیے کہ اہل انجیل فیصلہ کریں اس کے |
| اللّٰهُ فِيْهِ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ | مطابق جو اللہ نے اس میں اتارا ہے اور |
| اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ | نہ فیصلہ کریں گے اس کے مطابق جو اللہ |

الْفَاسِقُوْنَ (مائدہ - ۴۷) نے اتارا ہے تو وہی لوگ فاسق ہیں۔

پھر بتایا کہ جو حکم ان امتوں کو دیا گیا تھا بعینہٖ وہی حکم مسلمانوں کو بھی دیا جاتا ہے کہ زندگی کے تمام معاملات کو اس کتاب کی راہنمائی میں چلائیں جو ان کی طرف اتاری گئی ہے۔

وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ — اور ہم نے تمہاری طرف کتاب اتاری ہے،
مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ — قول فیصل کے ساتھ، اس کتاب کی پیشینگوئی
الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ — کے مطابق جو اس سے پہلے سے ہے اور
فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ — وہ اس کی نگران ہے تو فیصلہ کرو ان کے
اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ — درمیان اس چیز کے مطابق جو اللہ نے
عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ۔ — اتاری ہے اور حق سے منحرف ہو کر ان کی
(مائدہ - ۴۸) — خواہشوں کی پیروی نہ کرو۔

بعینہٖ یہی مضمون اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ، سورہ انعام کی آیات ۱۳۶ سے لے کر ۱۵۳ تک بیان ہوا ہے اور آخری آیت میں یہ فرمایا گیا ہے کہ جماعت کی شیرازہ بندی اور تنظیم قانون و شریعت سے ہوتی ہے اس لیے ضروری ہے کہ وضع قانون و شرع کا حق صرف اللہ تعالیٰ کے لیے تسلیم کیا جائے جو سب کا خالق اور سب کا بادشاہ ہے۔ اگر اس حق میں دوسرے بھی شریک ہو جائیں اور ہر قوم و جماعت اپنے لیے قانون بنانے کی مجاز ہو جائے تو اس کا لازمی نتیجہ بدنظمی، انتشار اور فساد فی الارض ہے۔ وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (انعام - ۱۵۳)

(اور یہ میرا سیدھا راستہ ہے، پس اسی پر چلو اور مختلف راستوں پر نہ چلو کہ وہ تمہیں اس کے راستہ سے ہٹا دیں۔ یہ ہے جس کی تمہیں ہدایت کی جاتی ہے تاکہ تم بچو)

توحید اور تشریع کا یہی تلازم سورۂ نحل کی آیات ۵۴ - ۵۵ میں موجود ہے لیکن

یہاں زیادہ تفصیل کی گنجائش نہیں ہے۔

ج ۔ خود پرستی کی ایک نہایت اہم اور عام شکل یہ ہے کہ جو لوگ ایک مدت تک فارغ البالی اور خوش حالی کی زندگی بسر کر چکے ہوتے ہیں اور دولت و ثروت اور اکتساب علم و فن کے وسائل پر قابض رہتے چلے آتے ہیں، کچھ عرصہ کے توارث کے بعد، اس حالتِ امن و اطمینان کو وہ اپنا استحقاق ذاتی اور اپنے علم و قابلیت کا ثمرہ سمجھنے لگ جاتے ہیں ۔ یہ ذہنی حالت فرد کی ہو یا جماعت کی، بس کی گانٹھ ہے جس سے بے شمار مفاسد پیدا ہوتے ہیں ۔ اس کی تہ میں اتر کر غور کیا جائے تو یہ صریح شرک ہے ۔ کیونکہ اس دنیا کے اندر جو کچھ ہے سب کا خالق اللہ ہے ۔ تمام وسائل و ذرائع اسی کے پیدا کیے ہوئے ہیں اور ان وسائل و ذرائع پر ہم اپنے جن اعضاء اور جن قوتوں اور قابلیتوں کے ذریعہ سے تصرف کرتے ہیں وہ سب بھی خدا ہی کا عطیہ ہیں (وَهُوَ الَّذِي أَنْشَأَكُمْ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ قَلِيلًا مَا تَشْكُرُونَ[1]) ہمارے عروج و کمال کا کوئی درجہ، ہمارے علم و فضل کا کوئی مرتبہ اور ہماری عظمت و سطوت کا کوئی مقام ایسا نہیں ہے جو ہمیں اس کی بندگی اور غلامی سے بے نیاز کر سکتا ہو ۔ ہم سلیمانؑ و ذوالقرنین ہو کر بھی اس کے آگے ویسے ہی محتاج اور فقیر ہیں جیسے سلمان اور ابوذر ہو کر (رضی اللہ عنہما) ۔ احتیاج و افتقار ہماری ایک صفت ذاتی ہے جو کسی حال میں بھی ہم سے جدا نہیں ہو سکتی خواہ ہم کتنے ہی بلند مرتبہ پر پہنچ جائیں اور قوت و سطوت کی کتنی ہی بڑی مقدار فراہم کر لیں ۔

عرب جاہلیت میں شرک کی یہ قسم بھی موجود تھی ۔ وہ اپنی خوش حالی اور فارغ البالی

---

[1] اور وہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا ہے اور تمہارے لیے کان، آنکھ اور دل بنائے ہیں مگر تم بہت کم شکر ادا کرتے ہو ۔

کو اپنے علم و تدبر کا نتیجہ اور اپنے استحقاق ذاتی کا ثمرہ سمجھتے تھے۔ آخرت کے اولاً تو قائل نہیں تھے اور اگر ایک مفروضہ کے درجہ میں اس کو مانتے بھی تھے تو اس کے لیے عمل و اطاعت کی کسی سرگرمی کی ضرورت نہیں سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ جس طرح ہم دنیا میں بہتر حالت میں ہیں اسی طرح آخرت میں بھی بہتر حالت میں رہیں گے۔ یہ بہتر حالت میں رہنا ہمارا ایک ذاتی حق ہے جو کسی حال میں ہم سے چھن نہیں سکتا۔ قرآن نے اسی ذہنی حالت کی تصویر کھینچی ہے۔

| | |
|---|---|
| فَإِذَا مَسَّ الْإِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَانَا | جب انسان کو تکلیف پہنچتی ہے ہم کو |
| ثُمَّ إِذَا خَوَّلْنَاهُ نِعْمَةً مِنَّا | پکارتا ہے پھر جب ہم اس کو نعمت بخش |
| قَالَ إِنَّمَا أُوتِيتُهُ عَلَىٰ عِلْمٍ | دیتے ہیں کہتا ہے یہ تو مجھے اپنے علم |
| بَلْ هِيَ فِتْنَةٌ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ | کی بدولت ملی ہے بلکہ یہ آزمائش ہے |
| لَا يَعْلَمُونَ (زمر - ۴۹) | لیکن اکثر نہیں جانتے۔ |

یعنی انسان کوئی چیز اپنے علم و قابلیت سے نہیں پاتا۔ جو کچھ بھی پاتا ہے خدا کے فضل سے پاتا ہے اور اس سے مقصود اس کی آزمائش ہوا کرتی ہے کہ وہ شکر کرتا ہے یا ناشکری۔ لیکن اکثر اس آزمائش سے ناواقف ہیں اور وہ ناشکری ہی کرتے ہیں اور جو چیز خدا کی عنایت سے ملتی ہے اس کو اپنے علم و قابلیت کا ثمرہ اور اپنا استحقاق ذاتی سمجھنے لگتے ہیں اور اس طرح خدا کی ربوبیت اور وحدانیت میں شریک بن بیٹھتے ہیں۔ یہ چیز استکبار اور فساد فی الارض کی جڑ ہے۔ اسی متکبرانہ ذہنیت کی تصویر دوسری جگہ اس طرح کھینچی ہے۔

| | |
|---|---|
| وَلَئِنْ أَذَقْنَاهُ رَحْمَةً مِنَّا | اگر ہم اس کو چکھائیں رحمت بعد اس |
| مِنْ بَعْدِ ضَرَّاءَ مَسَّتْهُ | تکلیف کے جو اسے پہنچی، کہے گا یہ تو |
| لَيَقُولَنَّ هَٰذَا لِي وَمَا أَظُنُّ السَّاعَةَ | میرا حق ہے اور مجھے قیامت کے ہونے |

قَائِمَةً وَّلَئِنْ رُّجِعْتُ إِلٰى رَبِّيْ إِنَّ لِيْ عِنْدَهٗ لَلْحُسْنٰى۔ (حٰمٓ سجدہ ۔ ۵۰)

کا گمان نہیں ہے اور اگر مجھے اپنے رب کی طرف لوٹنا ہی ہوا تو میرے لیے وہاں بھی اچھائی ہی اچھائی ہے۔

یہی ذہنیت ہے جس کا ذکر سورہ مدثر میں ہے وَجَعَلْتُ لَهٗ مَالًا مَّمْدُوْدًا وَّبَنِيْنَ شُهُوْدًا وَّمَهَّدْتُّ لَهٗ تَمْهِيْدًا ثُمَّ يَطْمَعُ أَنْ أَزِيْدَ (اور ہم نے اس کو بہت سا مال دیا اور ساتھ دینے والے بیٹے دیے اور اس کی جڑ جمائی۔ پھر وہ توقع رکھتا ہے کہ ہم آخرت میں اس کو اور زیادہ دیں گے) آخری ٹکڑے ثُمَّ يَطْمَعُ أَنْ أَزِيْدَ (پھر توقع رکھتا ہے کہ میں زیادہ کروں گا) کا مطلب یہ ہے کہ وہ خیال کرتا ہے کہ اگر بالفرض خدا کے ہاں جانا ہی ہوا تو مجھے دنیا میں جو کچھ حاصل ہے اس سے زیادہ وہاں حاصل ہوگا کیونکہ وہ اس تمام عظمت و ثروت کو اپنے استحقاق کا نتیجہ سمجھتا ہے، اس کو خدا کی بخشش اور آزمائش نہیں سمجھتا۔

اسی ذہنیت کی تصویر سورہ معارج میں ہے فَمَالِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا قِبَلَكَ مُهْطِعِيْنَ عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ عِزِيْنَ أَيَطْمَعُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ أَنْ يُّدْخَلَ جَنَّةَ نَعِيْمٍ كَلَّا إِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّمَّا يَعْلَمُوْنَ (ان کافروں کو کیا ہو گیا ہے کہ تمہارے اوپر داہنے اور بائیں سے گروہ در گروہ پلے پڑ رہے ہیں، کیا ان میں سے ہر ایک یہ امید لیے بیٹھا ہے کہ وہ جنت نعیم میں داخل ہوگا! ہرگز نہیں، ہم نے اس چیز سے پیدا کیا جس کو وہ جانتے ہیں) یہ تصویر ہے اس حالت کی جو آنحضرت صلعم کو دعوتِ قرآن کے وقت پیش آتی۔ آخرت میں ارباب اقتدار کی ذلت اور جزا و سزا کی آیتیں جب آپ سناتے تو قریش کے سرداروں کو سخت چوٹ لگتی۔ ان کے لیے یہ تصور بہت شاق تھا کہ ایک دن ایسا بھی آنے والا ہے جس میں بلندی اور پستی کی میزان ایمان اور عمل صالح کے ہاتھ میں ہوگی اور ایک

غریب سے غریب کسان اور ادنیٰ سے ادنیٰ مزدور بھی اپنی بندگی اور اطاعت کے صلہ میں بڑے بڑے سرداروں کے لیے قابلِ رشک ہوگا۔ وہ جب قرآن کی یہ آیتیں سنتے تو ان کی تردید کرتے اور ان کا مذاق اڑانے کے شوق میں ہر چہار طرف سے آپ پر پل پڑتے اور اس استحقاق ذاتی کے گھمنڈ میں جو ایک متوارث خوشحالی اور سیادت کا قدرتی نتیجہ ہے، یہ کہتے کہ اگر ہم خدا کے ہاں جائیں گے بھی تو وہاں بھی ان کمینوں سے اچھے ہی رہیں گے۔ ہمیں جو کچھ حاصل ہے ہمارے استحقاق ذاتی کا ثمرہ ہے۔ یہ کسی جگہ بھی ہم سے چھن نہیں سکتا۔ نہ دنیا میں نہ آخرت میں۔ ہم پیدا ہی اسی لیے ہوئے ہیں کہ حکومت کریں، عیش و آرام کریں اور لوگوں پر بلند و بالا رہیں۔ قرآن نے اس کا جواب دیا۔ كَلَّآ ۭ اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّمَّا يَعْلَمُوْنَ (ہرگز نہیں ہم نے ان کو پیدا کیا اس چیز سے جس کو وہ جانتے ہیں) جس کو وہ جانتے ہیں، یعنی بتانے کی ضرورت نہیں ہے، اس کی بے حقیقتی اور کم قدری ان پر اچھی طرح واضح ہے۔ نجس پانی کی ایک بوند کے لیے اپنی برتری اور پاکیزگی، اپنے استحقاق ذاتی و موروثی اور اپنے شرف نسبی و حسبی کا یہ غرور زیب نہیں دیتا۔ اور جس انسان کی یہ تمام توانائیاں اور قوتیں اور تمام قابلیتیں بچپنے اور بڑھاپے کی دو ناتوانیوں کے درمیان گھری ہوئی ہیں (اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُؔعْفٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ ضُؔعْفٍ قُوَّةً ثُمَّ جَعَلَ مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ ضُؔعْفًا وَّشَيْبَةً)[1] اس انسان کے لیے یہ بات جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے تئیں بندگی سے بالاتر، عمل و اطاعت سے بے نیاز اور خدا کی خدائی میں حصے دار خیال کرنے لگے۔

یہی حقیقت سورۂ نجم میں نہایت لطیف اسلوب سے بیان ہوئی ہے۔

---

[1] اور اللہ ہی ہے جس نے تم کو پیدا کیا ناتوانی سے پھر ناتوانی کے بعد قوت دی، پھر قوت کے بعد ناتوانی اور بڑھاپا دیا۔

| | |
|---|---|
| وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ | اور اللہ ہی کے لیے ہے جو کچھ آسمانوں |
| مَا فِي الْاَرْضِ لِيَجْزِيَ | اور جو کچھ زمین میں ہے تاکہ جن لوگوں |
| الَّذِيْنَ اَسَآءُوْا بِمَا | نے بدی کی ان کو ان کی بدی کا بدلہ دے |
| عَمِلُوْا وَيَجْزِيَ الَّذِيْنَ | اور جن لوگوں نے نیکی کی ان کو ان کی نیکی |
| يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ | کا اچھا صلہ دے یعنی ان لوگوں کو جو بڑے |
| وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ اِنَّ | گناہ اور کھلی بدکاریوں سے بچتے رہے |
| رَبَّكَ وَاسِعُ الْمَغْفِرَةِ هُوَ | مگر کبھی اس کی چھوت لگ گئی۔ بے شک |
| اَعْلَمُ بِكُمْ اِذْ اَنْشَاَكُمْ | تیرا رب وسیع بخشش والا ہے۔ وہ تمھیں |
| مِّنَ الْاَرْضِ وَاِذْ اَنْتُمْ | خوب جانتا ہے جبکہ تم کو زمین سے پیدا کیا |
| اَجِنَّةٌ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ | اور جب تم اپنی ماؤں کے پیٹوں میں جنین کی |
| فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ | صورت میں تھے پس اپنی پاکیزگی کا دعوے |
| هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى ۔ | مت کرو وہ ان لوگوں کو خوب جانتا ہے |
| (نجم - ۳۲) | جنھوں نے پرہیزگاری اختیار کی۔ |

اس سے اوپر والی آیت میں ملائکہ کی شفاعت کی تردید تھی۔ اس کے بعد جزاء سزا کا حق ہونا بیان کیا اور فرمایا کہ اللہ کے ہاں کی کامیابی صرف ان لوگوں کے لیے ہے جو کبائر اور فواحش سے بچتے رہیں اور اگر کبھی اس طرح کی گندگی کا کوئی چھینٹا دامن پر پڑ جائے تو توبہ و استغفار کے اشک ندامت سے اس کو دھو ڈالیں۔ باقی رہے وہ لوگ جو استحقاق ذاتی کے گھمنڈ میں مبتلا ہیں اور اپنے آپ کو بڑی چیز بلکہ پیدائشی حقدار جنت سمجھ رہے ہیں۔ انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ خدا ان کے اس وقت سے بھی واقف ہے جب اس نے ان کو خاک سے پیدا کیا اور اس وقت سے بھی واقف ہے جب وہ پانی کی ایک بوند کی شکل میں اپنی ماؤں کے پیٹوں پڑے اور پھر ایک مضغۂ گوشت ہو

اور جنین کی صورت اختیار کی۔ ایسے ناتوان اور حقیر وجود کے لیے جس کی ابتدا اتنی ناچیز ہے، زیبا نہیں کہ وہ اپنی برتری کے غرور میں مبتلا ہو۔ اس کے پاس جو کچھ بھی ہے سب خدا کی بخشش ہے ایک ذرہ بھی اس کی قدرت و قابلیت کا نتیجہ نہیں ہے۔

اسی مشرکانہ ذہنیت کی تصویر سورۂ کہف میں ہے۔

| | |
|---|---|
| وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا رَّجُلَيْنِ | ان کے لیے دو شخصوں کی تمثیل بیان کرو |
| جَعَلْنَا لِأَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ | ان میں سے ایک کے لیے ہم نے انگور کے |
| مِنْ أَعْنَابٍ وَّحَفَفْنٰهُمَا بِنَخْلٍ | دو باغ بنائے ان کو کھجور کے درختوں سے |
| وَّجَعَلْنَا بَيْنَهُمَا زَرْعًا | گھیرا اور ان کے درمیان کھیتی اگائی دونوں |
| كِلْتَا الْجَنَّتَيْنِ اٰتَتْ | باغ خوب پھل لائے۔ کچھ کمی نہیں کی۔ ہم |
| اُكُلَهَا وَلَمْ تَظْلِمْ مِّنْهُ | نے ان کے درمیان ایک نہر بنائی۔ اس میں |
| شَيْئًا وَّفَجَّرْنَا خِلٰلَهُمَا | پھل آئے تو اس نے اپنے ساتھی سے کہا |
| نَهَرًا وَّكَانَ لَهٗ ثَمَرٌ فَقَالَ | اور وہ اس سے مفاخرت کر رہا تھا۔ میں |
| لِصَاحِبِهٖ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗ | تم سے مال میں زیادہ اور جمعیت میں قوی |
| اَنَا اَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا وَّاَعَزُّ | ہوں اور اپنے باغ میں آیا اور وہ اپنی جان |
| نَفَرًا وَدَخَلَ جَنَّتَهٗ وَهُوَ ظَالِمٌ | پر آفت لا رہا تھا اور بولا میں نہیں سمجھتا |
| لِّنَفْسِهٖ قَالَ مَا اَظُنُّ اَنْ تَبِيْدَ هٰذِهٖ | کہ یہ باغ کبھی برباد ہو سکے گا۔ اور میں قیامت |
| اَبَدًا وَّمَا اَظُنُّ السَّاعَةَ قَائِمَةً وَّ | کے ہونے کا بھی گمان نہیں رکھتا اور اگر |
| لَئِنْ رُّدِدْتُّ اِلٰى رَبِّىْ لَاَجِدَنَّ | مجھے اپنے رب کی طرف جانا ہی ہوا تو اس |
| خَيْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا قَالَ لَهٗ صَاحِبُهٗ | سے بہتر ٹھکانا پاؤں گا۔ اس کے ساتھی |
| وَهُوَ يُحَاوِرُهٗ اَكَفَرْتَ بِالَّذِىْ | نے جواب میں کہا کیا تم نے اس خدا کی ناشکری |
| خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ | کی جس نے تم کو مٹی سے بنایا پھر پانی کی |

مِن نُّطْفَةٍ ثُمَّ سَوّٰكَ رَجُلًاؕ — ایک بوند سے پھر ایک مرد بنا کھڑا کیا

لٰكِنَّا۠ هُوَ اللّٰهُ رَبِّيْ وَلَآ اُشْرِكُ — لیکن میرا رب تو وہی اللہ ہے میں کسی

بِرَبِّيْٓ اَحَدًا (کہف ۳۲-۳۸) — کو اپنے رب کا شریک نہ بناؤں گا۔

یہ ایک مفاخرت کی تصویر ہے جو عرب کی اجتماعی زندگی میں بڑی اہمیت رکھتی تھی اور جس کے لیے عربی ادب میں اصطلاحی لفظ منافرت ہے۔ اس پر غور کیجیے تو ایک ایسے ذہن کے تمام مفاسد اس میں عریاں ہو گئے ہیں جو استحقاق ذاتی کے گھمنڈ میں مبتلا ہو۔ اس کے جواب میں دوسرے بندۂ موحد نے بعینہٖ وہی بات کہی ہے جو اوپر سورۂ نجم اور سورۂ معارج والی آیتوں میں گزر چکی ہے۔ یعنی اس کو خلقت اور اس کی اصل کی طرف توجہ دلائی ہے کہ جس انسان کی اصل مٹی ہے جو اپنی ابتدا میں صرف نجس پانی کی ایک بوند ہے، اس کے لیے استحقاق ذاتی کا لفظ بالکل بے معنی ہے اور پھر نہایت خوبی کے ساتھ اس امر کو واضح کیا ہے کہ یہ استکبار اور یہ استحقاق ذاتی کا گھمنڈ درحقیقت شرک ہے۔ جو شخص اس غرور میں مبتلا ہوتا ہے وہ اپنے آپ کو خدائی میں شریک بناتا ہے اور پھر اپنے آپ کو اس شرک سے بری کیا ہے (لٰكِنَّا۠ هُوَ اللّٰهُ رَبِّيْ وَلَآ اُشْرِكُ بِرَبِّيْٓ اَحَدًا[1]) بعد کی آیت میں اس بر خود غلط مغرور کے باغ کی تباہی کا ذکر ہے اور اس کی حسرت ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اُشْرِكْ بِرَبِّيْٓ اَحَدًا (اے کاش میں کسی کو اپنے پروردگار کا شریک نہ ٹھہراتا) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب تک دولت و ثروت کی چکا چوند باقی رہی آنکھیں بند رہیں، اس وقت تک اپنی قوت و تدبیر پر ناز تھا، اپنی جمعیت و عصبیت پر فخر تھا۔ اپنے خدم و حشم کی کارفرمائیوں پر غرور تھا لیکن جب باغ ویران ہو گیا اور جمعیت و عصبیت کچھ کام آسکی نہ خدم و حشم کچھ کام آسکے (وَلَمْ تَكُنْ لَّهٗ فِئَةٌ يَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَمَا كَانَ مُنْتَصِرًا) تو

[1] بلکہ وہی اللہ میرا رب ہے اور میں کسی کو اپنے رب کا ساجھی نہیں ٹھہراؤں گا۔

ان تمام اصنام کی بے حقیقتی اس پر واضح ہوگئی اور پھر اس نے افسوس کیا کہ ہائے میری کمبختی میں نے ان کو کیوں اپنے پروردگار کا شریک ٹھہرایا۔

جن ذہنوں کے اندر یہ گھمنڈ بسا ہوا ہے ان کا بالکل غیر متوازن ہو جانا ایک بالکل قدرتی بات ہے۔ ان کی خدائی کی بنیاد ریت پر ہوتی ہے۔ جب خدا کی قدرت ان کو ذرا سا جھنجوڑ دیتی ہے۔ غرور اور گھمنڈ کی جگہ ان پر مایوسی و دل شکستگی چھا جاتی ہے۔ لیکن جوں ہی حالات بدل جاتے ہیں، سروسامان پھر بہم ہو جاتا ہے۔ قوت و شوکت کے جلوے پھر نظر آنے لگتے ہیں نفس کے اندر کی دبی ہوئی خدائی پھر جاگ اٹھتی ہے اور وہ قرآن کے لفظوں میں فرح فخور (اکڑنے والے اور فخر کرنے والے) بن کر زمین میں پھر فساد پھیلانے اور خدا کی خدائی کی جگہ خدا کے بندوں سے اپنی خدائی منوانے میں اپنا سارا زور و زر صرف کرنے لگتے ہیں۔

| | |
|---|---|
| هُوَ الَّذِي يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ | وہی ہے جو تم کو چلاتا ہے خشکی اور تری میں |
| وَالْبَحْرِ حَتَّىٰ إِذَا كُنتُمْ فِي | یہاں تک کہ جب تم کشتی میں ہوتے ہو اور |
| الْفُلْكِ وَجَرَيْنَ بِهِم بِرِيحٍ | کشتیاں سازگار ہوا سے چلیں اور وہ |
| طَيِّبَةٍ وَفَرِحُوا بِهَا جَاءَتْهَا | خوش ہوئے، آتی ہے ایک تند ہوا اور گھیر |
| رِيحٌ عَاصِفٌ وَجَاءَهُمُ | لیتی ہیں موجیں ہر سمت سے اور وہ گمان |
| الْمَوْجُ مِن كُلِّ مَكَانٍ وَظَنُّوا أَنَّهُمْ | کرنے لگتے ہیں کہ اب ہلاک ہوئے تو اللہ کو |
| أُحِيطَ بِهِمْ دَعَوُا اللَّهَ | پکارتے ہیں اسی کی اطاعت کو خالص کرتے |
| مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ لَئِنْ أَنجَيْتَنَا | ہوئے، کہتے ہیں اگر تو نے ہم کو اس ورطۂ |
| مِنْ هَٰذِهِ لَنَكُونَنَّ مِنَ الشَّاكِرِينَ ۝ | ہلاکت سے نجات بخشی تو ہم شکر کرنے والوں |
| فَلَمَّا أَنجَاهُمْ إِذَا هُمْ | میں سے ہوں گے۔ پھر جب ان کو نجات |
| يَبْغُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ | دے دیتے ہیں تو وہ زمین میں سرکشی کرنے |

الْحَقِّ۔ (یونس -۲۲-۲۳)

لگتے ہیں بغیر کسی استحقاق کے۔

یہی مشرکانہ ذہنیت ہے جس کا ذکر سورۂ قصص میں ہے:۔

وَابْتَغِ فِيمَا آتَاكَ اللَّهُ الدَّارَ الْآخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَأَحْسِنْ كَمَا أَحْسَنَ اللَّهُ إِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْأَرْضِ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِينَ ۝ قَالَ إِنَّمَا أُوتِيتُهُ عَلَىٰ عِلْمٍ عِنْدِي (قصص-۷۷-۷۸)

خدا نے تجھ کو جو کچھ بخشا ہے اس میں دارِ آخرت کو طلب کر اور دنیا کے اندر سے اپنا حصہ نہ بھول اور احسان کر جیسا کہ اللہ نے تجھ پر احسان کیا ہے اور زمین میں فساد نہ چاہ اللہ فساد چاہنے والوں کو دوست نہیں رکھتا اس نے کہا یہ سب کچھ تو میرے علم کی بدولت مجھے ملا ہے۔

سورۂ فجر میں ہے:۔

فَأَمَّا الْإِنْسَانُ إِذَا مَا ابْتَلَاهُ رَبُّهُ فَأَكْرَمَهُ وَنَعَّمَهُ فَيَقُولُ رَبِّي أَكْرَمَنِ ۝ وَأَمَّا إِذَا مَا ابْتَلَاهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهُ فَيَقُولُ رَبِّي أَهَانَنِ۔

(فجر-۱۵-۱۶)

لیکن انسان تو جب اس کو آزماتا ہے اس کا رب پس اس کو عزت دیتا ہے اور نعمت بخشتا ہے تو کہتا ہے میرے خداوند نے میری عزت کی اور جب اس کو آزماتا ہے اور اس کی روزی تنگ کرتا ہے تو کہتا ہے میرے رب نے مجھ کو ذلیل کر دیا ہے۔

یعنی یا تو یہ سمجھ کر کہ میں لائقِ عزت ہوں اور مجھے جو کچھ ملا ہے میرے استحقاق کا نتیجہ ہے، مغرور و متکبر ہو جاتا ہے اور زمین میں اکڑنے اور فساد پھیلانے لگتا ہے یا بحالتِ دیگر یہ سمجھ کر کہ خدا نے مجھے بالکل نکما اور ذلیل بنا دیا ذلیل و نامراد ہو جاتا ہے اور عزتِ نفس کا وہ جوہر بھی کھو بیٹھتا ہے جو سوسائٹی کے اندر اس کو ایک خوددار اور باوقار انسان کی جگہ دلا سکے۔ یہ عدم توازن محض اس غلطی کا نتیجہ ہے کہ انسان اللہ کی

بخشی ہوئی نعمتوں کو اپنے استحقاق ذاتی اور اپنی تدبیر و قابلیت کا ثمرہ خیال کرنے لگتا ہے۔ یہ تصور ایک مشرکانہ تصور ہے۔ موحدانہ تصور یہ ہے کہ انسان عسرا ور یسر، تنگی اور فراخی دونوں کو خدا کی طرف سے سمجھے۔ دونوں میں اپنے لیے آزمائش خیال کرے۔ فراخی کے متعلق یہ خیال کرے کہ یہ شکر کی آزمائش ہے۔ تنگی کے متعلق یہ خیال رکھے کہ یہ اس کے صبر کا امتحان ہے۔ ان دونوں حالتوں سے ایک بندے کا پورا دین ایمان کی کسوٹی پر جانچا جاتا ہے کیونکہ دین درحقیقت صبر اور شکر ہی کے مجموعہ کا نام ہے۔ جس شخص کا تصور یہ ہوگا لازماً اس کا نفس متوازن رہے گا۔ نہ وہ مصائب میں گھبرائے گا نہ فراخی و کشادگی کے وقتوں میں مغرور و متکبر ہوگا۔ وہ جب دشمنوں کے نرغہ میں ہوگا اور اس کے سر کے لیے بڑے بڑے انعاموں کا اعلان ہوگا تو عین اس وقت جب کہ آخری خطرہ بالکل سامنے ہوگا وہ اپنے ایک ہی ساتھی کو ان لفظوں میں تسلی دے گا لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا[1] اور عین اس وقت جب کہ ہزاروں انسانوں کی دل بادل فوج کے اندر اس پر ایک شہنشاہِ اعظم کا دھوکا ہو رہا ہوگا، اس کی مقدس پیشانی گھوڑے کی زین پہ خدا کے آگے جھکی ہوئی ہوگی۔ ایسے متوازن نفس کے لیے قرآن کے نفس مطمئنہ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ یَا اَیَّتُھَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّۃُ ارْجِعِیْ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَۃً مَّرْضِیَّۃً فَادْخُلِیْ فِیْ عِبَادِیْ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ[2]

---

[1] غم نہ کر اللہ ہمارے ساتھ ہے۔

[2] اے مطمئن دل تو لوٹ اپنے رب کی طرف خوش خوش اور پسندیدہ حالت میں اور شامل ہو جا میرے بندوں میں اور داخل ہو جا میری جنت میں۔

# (۲) اہل کتاب کا شرک

اہل کتاب کے دو گروہوں کا ذکر قرآن نے کیا ہے۔ یہود کا اور نصاریٰ کا۔ یہ لوگ آنحضرت صلعم کی رسالت کے سوا ان تمام اساساتِ دین کو تسلیم کرتے تھے جن پر ایمان لانے کی دعوت قرآن دیتا تھا۔ یہاں تک کہ عقیدۂ توحید بھی ان کے اور مسلمانوں کے درمیان مسلم تھا۔ نہ یہ لوگ اصول کی حد تک اس کے منکر تھے، نہ توریت اور انجیل کی تصریحات کی موجودگی میں اس کا انکار ممکن تھا لیکن اس مسلمہ پر ایمان رکھنے کے باوجود وہ بہت سے ایسے اعمال و معتقدات میں مبتلا تھے جو کفر اور شرک کو متلزم تھے۔ قرآن نے اسی مسلمہ کو اساس بحث قرار دے کر ان سے مطالبہ کیا کہ وہ اپنے اعمال و عقائد کو تناقض سے پاک کر لیں۔ یا تو توحید کا انکار کر دیں کہ اس کے لوازم کو تسلیم کرنے کی ذمہ داری سے سبکدوش ہو کر جس وادی میں چاہیں ٹھوکریں کھائیں یا اس کے لوازم اور مقتضیات کو بھی تسلیم کریں اور اسی چراغ کو لے کر اپنے تمام اعمال و عقائد کا جائزہ لیں اور جو بدعات و مفاسد ان میں، توحید سے بالکل متناقض، پیدا ہو گئے ہیں ان کو دور کریں۔

یاد ہوگا، عربوں سے بحث کا آغاز اس نقطہ سے ہوا تھا کہ جب آسمان و زمین کا خالق، قوتوں اور قابلیتوں کا موجد، آسمان و زمین کا مدبّر خدا ہی ہے اور تمہیں ان مسلمات سے انکار نہیں ہے تو پھر ایسی باتیں کیوں مانتے ہو جو ان تمام مسلمات کے تار و پود بکھیر دیتی ہیں۔ بالکل اسی طرح ایک قدم آگے بڑھ کر اہل کتاب سے نفس عقیدۂ توحید کو مرکز قرار دے کر بحث کا آغاز ہوا کہ اگر یہ عقیدہ ہمارے اور تمہارے درمیان مانا ہوا ہے تو آؤ اسی کسوٹی پر اپنے کھرے کھوٹے کا امتحان کر لو۔ فرمایا:-

| | |
|---|---|
| قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى | کہو اے اہل کتاب آؤ اس بات کی طرف |
| كَلِمَةٍ سَوَآءٍۭ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَنْ | جو ہمارے اور تمہارے درمیان مسلم ہے |
| لَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ | کہ نہ بندگی کریں مگر اللہ کی اور نہ ساجھی |
| شَيْئًا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا | ٹھہرائیں اس کا کسی چیز کو اور نہ بنائیں |
| اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَاِنْ | ایک دوسرے کو اس کے سوا رب رہیں |
| تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا | اگر وہ اس سے منہ موڑیں تو کہہ دو کہ |
| مُسْلِمُوْنَ (آل عمران۔ ٦٣) | ہم تو اللہ کے فرمانبردار ہیں۔ |

اس سے معلوم ہوا کہ ایک ہی اللہ کی بندگی کرنا، کسی کو اس کا شریک نہ ماننا کسی کو خدا کے سوا رب نہ ٹھہرانا اہل کتاب اور مسلمانوں کے درمیان مسلم تھا۔ ان میں سے کسی ایک بات سے بھی نہ یہود کو اختلاف تھا نہ نصاریٰ کو۔ لیکن کسی کو رب نہ ماننے کا مفہوم وہ صرف یہ سمجھتے تھے کہ کسی کو خدا کے سوا رب پکارا نہ جائے۔ ان کے نزدیک خدا کی ربوبیت میں اس بات سے کوئی فرق نہیں آتا تھا کہ جو حقوق و صفات صرف خدا کے لیے مخصوص ہیں ان میں دوسروں کو بھی شریک کر دیا جائے۔ مثلاً تشریع اور قانون سازی اللہ تعالیٰ کے مخصوص اختیارات میں سے ہے اور کسی کے لیے بھی یہ بات جائز نہیں ہے کہ اس کے اس اختیار میں کسی قسم کی مداخلت کرے۔ اگر کوئی شخص ایسا کرتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی خدائی میں ساجھا بٹانے کی جرأت کا مرتکب ہوتا ہے اور اگر ہم خود کسی کے لیے یہ حق تسلیم کرتے ہیں تو گو زبان سے ہم اس کو رب یا خداوند نہ کہیں لیکن درحقیقت ہم اس کو خدا کی حاکمیت و ربوبیت میں شریک گردانتے ہیں۔ مگر یہود اور نصاریٰ خدا کے اس حق میں دوسروں کو شریک کرنے میں کوئی قباحت نہیں خیال کرتے تھے۔ چنانچہ قرآن نے اسی بنیاد پر یہود و نصاریٰ دونوں ہی کو اس امر کا مجرم قرار دیا کہ یہ اپنے علماء اور فقیہوں کو اللہ کے سوا رب ٹھہراتے ہیں۔

| | |
|---|---|
| اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ | انھوں نے اپنے عالموں اور راہبوں کو اللہ |
| اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ | کے سوا رب ٹھہرالیا ہے اور مسیح ابن مریم کو |
| الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَمَآ اُمِرُوْٓا | بھی، حالانکہ ان کو نہیں حکم دیا گیا ہے مگر |
| اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا | اس بات کا کہ ایک ہی خدا کی بندگی کریں |
| لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا | اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ پاک ہے ان |
| يُشْرِكُوْنَ (توبہ - ۳۱) | چیزوں سے جن کو یہ خدا کا شریک ٹھہراتے ہیں |

اس آیت سے متعلق احادیث میں عدی بن حاتم کا ایک سوال منقول ہے۔ انھوں نے آنحضرت صلعم سے پوچھا کہ یہود و نصاریٰ اپنے عالموں اور راہبوں کو رب تو نہیں کہتے؟ آپ نے فرمایا کہ کیا یہ بات نہیں ہے کہ اللہ نے جو چیزیں حلال قرار دی ہیں ان کو وہ حرام کرتے ہیں تو تم ان کو حرام قرار دیتے ہو۔ اور جن چیزوں کو اللہ نے حرام کیا ہے ان کو وہ حلال کر دیتے ہیں تو تم ان کو حلال قرار دے دیتے ہو؟ عدی بن حاتم نے کہا۔ ہاں یہ بات تو ہے۔ حضورؐ نے فرمایا فتلک عبادتهم یہی ان کی پرستش ہوئی۔

اس سے معلوم ہوا کہ عدی بن حاتم کو یہ غلط فہمی تھی کہ جب تک زبان سے کسی کے خداوند ہونے کا اقرار نہ کیا جائے اس وقت تک وہ خدا اور رب نہیں ہوتا اور جب تک کسی کی رسمی عبادت نہ کی جائے اس وقت تک وہ معبود نہیں بنتا۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس غلط فہمی کا ازالہ یوں فرمایا کہ کسی کو خداوند کہو یا نہ کہو اگر وہ حقوق و اختیارات اس کو دیتے ہو جو خدا کے لیے مخصوص ہیں تو بغیر اس کے کہ تم زبان سے اس کو رب اور الٰہ کہو اس کو رب مان رہے ہو اور بغیر اس کے کہ اس کی پوجا کے رسمی طریقے بجالاؤ اس کی پرستش کر رہے ہو۔ قانون اور شریعت بنانا صرف اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص ہے۔ اس منصب پر تم جس کو سرفراز کرو وہ خداوند بن جائے گا اور تم اس کے بندے بن جاؤ گے۔ زبان سے اس کو بندہ کہو یا خدا۔

آیت کی صحیح توجیہ سمجھنے کے لیے یہ تشریح کافی ہے لیکن اس کی مزید وضاحت کے لیے یہاں چند مفید مطلب باتوں کا بیان کرنا انشاء اللہ بے موقع نہ ہوگا۔

اس آیت میں یہود و نصاریٰ کے دو شرک بیان ہوئے ہیں۔ احبار و رہبان کو رب بنانا اور حضرت مسیحؑ کو رب بنانا۔ ہم دونوں چیزوں پر بالاجمال گفتگو کریں گے۔

**ا۔ احبار پرستی**

یہود کے متعلق یہ امر معلوم ہے کہ انھوں نے اپنی شریعت کی بہت سی باتیں فراموش کر دی تھیں (وَنَسُوا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوا بِهِ مائدہ-۱۴) بہت سے مقامات میں تحریف کر ڈالی تھی، مثلاً جہاں بنی اسماعیل کے اندر ایک نبی خاتمؐ کی بعثت یا قبلہ ابراہیمیؑ یا مقام قربانی وغیرہ کا بیان تھا۔ بہت سے احکام انھوں نے چھپا دیے تھے بالخصوص جو زنا، سرقہ، قتل نفس وغیرہ کے حدود کے متعلق تھے۔ بہت سے احکام پر انھوں نے شرعی حیلوں کے پردے ڈال دیے تھے۔ بہت سے فتوے قانونِ الٰہی کے بالکل خلاف، محض اغراض دنیوی کے لیے لکھتے تھے اور پھر ان کے متعلق یہ دعوے کرتے تھے کہ یہ عین توریت کے احکام ہیں۔ یہ ساری باتیں قرآن مجید میں تفصیل کے ساتھ بیان ہوئی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کی شریعت کے ان تمام گوشوں میں خدا کی حاکمیت بالکل معدوم ہو چکی تھی اور اس کی جگہ ان کے علماء اور فقہاء کے خود ساختہ احکام و قوانین نے لے لی تھی۔

اسی طرح بائبل ہسٹری اور یہود کے نظام قضا اور طریق قانون سازی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ہاں اجتہاد بالکل معدوم تھا۔ قبائل میں جو قاضی مقدمات کے فیصلہ کے لیے مامور تھے وہ نئے مسائل میں، جن کے بارہ میں کوئی صریح حکم توریت میں موجود نہ ہوتا، یہ نہیں کرتے تھے کہ توریت کے احکام اور اپنے نبی کے فیصلے سامنے رکھ کر اجتہاد کر لیں اور اسلام کے اصول کے مطابق خدا کی مرضی سے اوفق بات معلوم کرنے کی کوشش کریں۔ ان کا طریقہ یہ تھا کہ وہ معاملہ کو

کاہنِ اعظم کے سامنے پیش کر دیتے۔ کاہنِ اعظم خدا کی مرضی معلوم کرنے کا ایک قدرتی ذریعہ (NATURAL ORGAN) خیال کیا جاتا تھا۔ کاہن اعظم یہ کرتا کہ وہ خیمۂ عبادت میں قدس الاقداس کے اندر جاتا جہاں تابوت ایک پردہ کے پیچھے رکھا ہوا ہوتا۔ یہ مقام الہامِ ربّانی کا مرکز خیال کیا جاتا تھا وہاں پہنچ کر اس پر یہواہ (خدا) کے احکام الہام ہوتے۔ وہ ان احکام سے لوگوں کو مطلع کرتا اور لوگوں پر ان کی تعمیل واجب ہوتی۔ بلنچلی اپنی کتاب دی تھیوری آف دی اسٹیٹ (THE THEORY OF STATE) میں مذہبی حکومت (تھیاکریسی) کے باب میں لکھتا ہے۔

”قانونِ الٰہی ایک سونا منڈھے ہوئے صندوق میں رکھا رہتا جس کی دو کروبی حفاظت کرتے اور جس کی تعظیم الہامِ ربانی کے مرکز کی حیثیت سے کی جاتی تھی۔ تابوت خیمہ کے اندر ایک پردہ کے پیچھے قدس الاقداس میں رہتا تھا اور کاہنوں کی طرف سے پورے اہتمام سے اس کی نگرانی ہوتی تھی۔ یہیں کاہن اعظم یہواہ (خدا) کے احکام معلوم کرتا اور لوگوں کو مطلع کرتا۔“

قاضی جو قبائل میں شریعت کی تنفیذ پر مامور تھے وہ یہ کام خدا کے نام سے انجام دیتے تھے۔ کیونکہ قانون سازی کا حق صرف اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص تھا۔ اگر کوئی معاملہ ان کے سامنے ایسا آجاتا جس کا فیصلہ ان کے لیے مشکل ہوتا تو اس میں ان کے لیے ضروری ہوتا کہ لاویوں کے ذریعہ سے خدا کی مرضی معلوم کریں۔“

یہ طریقہ ٹھیک ٹھیک بت پرست قوموں کی نقالی ہے اور یہود نے اپنے بگاڑ کے زمانہ میں اس کو اختیار کیا۔ جس طرح مصر، عراق، نینوا وغیرہ کے بت خانوں میں پجاری اور پروہت، کسی اہم ضرورت کے وقت، اپنے معبودوں کے سامنے جا کر ہاتفِ غیب کی زبان سے، ان معبودوں کی مرضی معلوم کرتے تھے یا جس طرح

اہلِ عرب اپنے معبودوں کے سامنے فال کے تیروں کے ذریعہ سے ان کے احکام اور فیصلے معلوم کرتے تھے اسی طرح یہود نے بھی تابوت کو ایک معبود بنا لیا تھا، جس معاملہ میں ان کو مشکل پیش آتی، کاہن اعظم تابوت کے سامنے جا کر، خدا کے احکام اور فیصلے معلوم کر لیتا۔ مجرد تابوت کے سامنے حاضری حصولِ الہام کے لیے کافی تھی۔ یہ کاہن معصوم اور ملہم خیال کیے جاتے۔ اس طریقہ کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ بنی لاوی ارباباً من دون اللہ بن بیٹھے اور ان کے ہر قسم کے خیالات، واوہام نے قانون و شریعت کا درجہ حاصل کر لیا۔

نصاریٰ کے ہاں صورت معاملہ اس سے بھی زیادہ بھونڈی ہے۔ نصاریٰ کی اصلی حیثیت یہود کے ایک اصلاح یافتہ فرقہ کی تھی نہ کہ ایک مستقل امت کی۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے خود فرمایا ہے کہ میں توریت کو منسوخ کرنے نہیں بلکہ اس کو پورا کرنے آیا ہوں۔ یہ بھی فرمایا ہے کہ جب تک اس کی ساری باتیں پوری نہ ہو لیں ایک نقطہ بھی اپنی جگہ سے ٹل نہیں سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے کوئی نئی شریعت نہیں دی بلکہ اپنے پیروؤں کو صرف روح دین کی تعلیم دی اور قوانین و شرائع میں اسی دین کی پیروی کا حکم دیا جو توریت میں موجود تھا۔ صرف یہود کی بدعات کی حد تک اس میں اصلاح فرمائی۔

نصاریٰ کی ابتدائی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شروع میں حضرت مسیح علیہ السلام کے خلفا کی حیثیت یہی تھی۔ وہ احکام و شرائع میں تمام تر توریت کے متبع تھے۔ لیکن پال نے مسیحیت کے تمام ظاہر و باطن کو بالکل مسخ کر ڈالا۔ اس نے نصاریٰ کو ایک مستقل نام اور ایک مستقل امت کی حیثیت سے ممیز کیا اور توریت کے احکام کی پابندی صرف بنی اسرائیل کے لیے خاص کر دی۔ غیر بنی اسرائیل کے لیے توریت کی پابندی منسوخ کر کے شراب اور سود وغیرہ کو جائز قرار دیا۔ حضرت مسیح علیہ السلام

کے سچے خلفائے ان مسائل پر اس سے بڑے بڑے مباحثے کیے لیکن پال کی بدعات رومیوں وغیرہ کے مذاق کو اس قدر اپیل کرنے والی تھیں کہ بالآخر انھیں کو فروغ ہوا۔ اس طرح مسیحیت نے ایک مستقل امت کی حیثیت اختیار کرلی۔ لیکن ایک ایسی امت کی جو کتاب و شریعت سے محروم ہے۔ کیونکہ انجیل احکام سے بالکل خالی ہے اور تورات کی پیروی سے پال نے ان کو بری کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تمام معاملات زندگی میں نصاریٰ خدا کے بجائے اپنے علماء کی بدعات کے پیرو ہو گئے۔ علماء جو کچھ کہتے وہی خدا کا حکم بن جاتا۔ قسطنطین کے زمانہ سے، جب سلاطین روم کی تلوار نے عیسائیت کی عداوت کی جگہ اس کی حمایت کا رنگ اختیار کیا، پوپ کی عظمت کا یہ حال ہوا کہ ایک طرف پوپ کے احکام روانہ ہوتے دوسری طرف بادشاہ کا فرمان جاری ہوتا کہ ان احکام کی خدائے قادر مطلق کے احکام کی حیثیت سے پیروی کی جائے۔ بالآخر یہ لے اس درجہ بڑھی کہ ان مقدس علماء کو یہ اختیار حاصل ہوگیا کہ یہ زمین پر جو باندھتے وہ آسمان پر بھی باندھا جاتا اور یہ زمین پر جو کھولتے وہ آسمان پر بھی کھولا جاتا۔ ان کی زبان خدا کی ترجمان بن گئی۔ یہاں تک کہ یہ زمین پر جس کو بخش دیتے وہ آسمان پر بھی بخش دیا جاتا۔ دوسرے لفظوں میں اس کے معنی یہ ہوئے کہ یہ اللہ کے احکام کے پیرو نہیں تھے بلکہ العیاذ باللہ خدا خود ان کے احکام کی تعمیل کرتا تھا۔

### ب۔ حضرت مسیح کو رب بنانا

اسی طرح نصاریٰ نے حضرت مسیح علیہ السلام کو بھی رب بنا لیا۔ عیسائیوں کے علم کلام اور مذہبی مباحثات کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس فتنہ کا بانی بھی پال ہی ہے۔ مسیح علیہ السلام کے شاگرد، جیسا کہ معلوم ہے، غیر تعلیم یافتہ لوگ تھے۔ برعکس اس کے پال یونانی فلسفہ اور یونانی تصوف کا ماہر تھا۔ اس نے انجیل کی شرح ایک نئے رنگ سے پیش کی اور دعویٰ کیا کہ میرے لیے مسیح کے ان پڑھ شاگردوں کے الفاظ کی پیروی ضروری نہیں

ہے، جو حقائق و رموز کے سمجھنے سے بالکل قاصر تھے۔ بلکہ میرا علم براہِ راست بطریق مکاشفہ خود مسیح سے ماخوذ ہے۔ لطف یہ ہے کہ پال عبرانی زبان سے، جو انجیل کی اصلی زبان تھی، بالکل ناواقف تھا۔ اس کا تعلق انجیل کی اصل زبان کے ساتھ وہی تھا جو ایک عجمی جاہل کا قرآن کی زبان کے ساتھ ہو سکتا ہے۔ جس طرح اسلام کی تاریخ میں ہم دیکھتے ہیں کہ دین میں بدعات کے فتنے بیشتر ان عجمیوں کی بدولت اُٹھے جو قرآن و حدیث کی اصل زبان سے عموماً ناواقف تھے اور ساتھ ہی ان کے دماغ عجمی فلسفہ و تصوف سے مسموم تھے۔ اسی طرح پال نے، جو انجیل کی اصل زبان سے ناواقف اور یونانی فلسفہ و تصوف کا ماہر تھا، انجیل اور نصرانیت کا بالکل ہیولا ہی بدل ڈالا۔ اس پر باطنیت (GNOSTICISM) کا رنگ غالب تھا اور اس کی تمام سرگرمیوں میں جو چیز اصل محرک کی حیثیت سے نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ جس طرح ممکن ہو رومیوں کے اندر عیسائیت کو مقبول بنائے۔ اس ذوق اور اس محرک کے ساتھ قدرۃً اس کو حضرت مسیح کی اصلی زندگی اور ان کی واقعی تعلیمات سے کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کی رغبت کی چیزیں وہی ہو سکتی تھیں جو اس کے فلسفۂ باطنیت کے ساتھ میل رکھتی ہوں اور جن کو آسانی کے ساتھ رومی میتھالوجی سے ہم آہنگ کیا جا سکے۔ چنانچہ اس کی ساری بدعتوں کے اندر اس کا یہ ذوق اُبھرا ہوا نظر آتا ہے۔ لیکن ہم یہاں صرف الوہیت مسیح کی بدعت کی کسی قدر وضاحت کرنا چاہیے ہیں۔

انجیل میں مسیح علیہ السلام کے لیے بیٹے (ابن) اور کلمۃ اللہ اور خدا کے لیے باپ (اب) کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں اور ساتھ ہی جگہ جگہ ان کو ابن آدم بھی کہا گیا ہے اور توحید کی بھی نہایت واضح لفظوں میں تعلیم دی گئی ہے۔ مسیح کے سچے شاگردوں کو ان باتوں کے سمجھنے میں کوئی اُلجھن نہیں پیش آئی۔ عبرانی زبان میں 'ابن'

کا لفظ عبد اور بیٹے کے مفہوم میں مشترک ہے۔ اسی طرح 'اب' کا لفظ باپ اور رب کے معانی میں مشترک ہے۔ ان کو نہ ابن کے لفظ سے کوئی دھوکا ہو سکتا تھا، نہ اب کے لفظ سے۔ وہ بے تکلف ابن اللہ کا مفہوم عبداللہ اور رابی کا مفہوم ربی سمجھتے تھے اور بالفرض لفظ کے اشتراک سے، اگر کوئی ابہام پیدا بھی ہو سکتا تھا تو توحید کی واضح تعلیمات اس کے دور کرنے کے لیے کافی تھیں۔ اہل حق کا طریقہ ہمیشہ یہ رہا ہے کہ وہ مشتبہ چیزوں پر عقائد کی بنیاد نہیں رکھتے بلکہ ان کی تاویل واضح تعلیمات اور قطعی اصولوں کی روشنی میں کرتے ہیں۔ لیکن پال کے لیے انجیل کے انہی چند الفاظ نے تاویل بازی اور فتنہ سازی کا دروازہ کھول دیا۔ پال کا تمام تر ماخذ عبرانی سے ناواقفیت کی وجہ سے، یونانی انجیلیں تھیں۔ یونانی میں آکر 'اب' اور 'ابن'، کے الفاظ اپنے اس مفہوم سے بالکل علیحدہ ہو گئے تھے جن مفہوموں میں وہ عبرانی میں مستعمل تھے۔ یونانی میں صریحاً وہ باپ اور بیٹے کے مفہوم میں ہو گئے تھے۔ یہیں سے پال کے مذاقِ باطنیت کو غذا ملی۔ مسیح کو کلمۃ اللہ بھی کہا گیا تھا۔ اسی کو اساس قرار دے کر اس نے یہ فلسفہ تراشا کہ کلمہ (LOGOS) ایک برتر تخلیقی روح کائنات (WORLD POWER) ہے اور مسیح اس برتر تخلیقی روح کائنات کا مظہر (INCARNATION) ہیں۔ بس یہیں سے مسیح کے ابن اللہ ہونے کی بدعت چل پڑی۔

پال ۶۷ء میں مرا ہے۔ اس وقت سے لے کر چوتھی صدی کے اوائل تک اس مسئلہ پر عیسائیوں کے درمیان جو ہنگامے برپا ہوئے اور اس بنیاد پر جو فرقے اٹھے۔ ان کی تفصیل طوالانی ہے۔ لیکن اس عہد کی تاریخ کے طالب علم کو تین فرقے نمایاں طور پر نظر آئیں گے:۔

(۱) آریوسی (ARIANS) - یہ آریوس (ARIUS) کے پیرو تھے اور مسیح علیہ السلام کو مخلوق مانتے تھے۔

(۲) سابلی (SABELLIANS) یہ لوگ حلول کے قائل تھے اور مسیح کو خدا کا ایک اوتار یا اس کا ایک رُخ (ASPECT) کہتے تھے۔ ان کے نزدیک خدا ہی خالق، منجی اور معزی سب کچھ تھا۔ جس طرح ایک ہی شخص باپ، مربی اور مہمان سب کچھ ہو سکتا ہے۔

(۳) تثلیثی۔ ان کا لیڈر (ATHANSIOS) تھا۔ یہ لوگ عقیدۂ تثلیث کے داعی تھے۔

ان فرقوں میں سے آریوسی فرقہ صحیح نصرانیت کے بقایائے صالحہ میں سے تھا۔ اگرچہ دوسرے فرقوں کے دباؤ اور رجحان عام کے اثر سے یہ لوگ بھی بعد میں حضرت مسیح کو مقام بشریت سے کچھ بالاتر خیال کرنے لگ گئے تھے لیکن تثلیث یا حلول کی تردید میں اس فرقہ کی کوششیں بے نظیر ہیں۔ تیسری صدی کے اواخر اور چوتھی صدی کے اوائل میں ایک خاص واقعہ نے مسیح علیہ السلام کی الوہیت اور عبدیت کے متعلق عیسائیوں کے تمام فرقوں کو بری طرح دست و گریبان کر رکھا تھا۔ اس وقت تک رومی شاہنشی کے اندر مسیحیت کافی پھیل چکی تھی اور یہ اختلافات سلطنت کے دشمنوں کے لیے ساز گار ہو سکتے تھے۔ اس وجہ سے قسطنطین نے مسیحیت کا قلع قمع کرنے کی وہ پالیسی، جو اس کے پیشرووں نے اختیار کر رکھی تھی، ترک کر کے حمایت مسیحیت کی پالیسی اختیار کی۔ اس کی سب سے پہلی کوشش یہ ہوئی کہ کسی طرح ان نبرد آزما اور متصادم فرقوں میں اتحاد کرائے تاکہ ان اختلافات کی وجہ سے سلطنت کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔ اس کے لیے سب سے پہلے ۳۱۴ء میں اس نے ارلیس میں چرچ کی ایک کونسل منعقد کی لیکن پیش نظر مقصد میں کوئی خاص کامیابی نہیں ہوئی۔ بالآخر ۳۲۵ء میں اس کے ایما سے، چرچ کی ایک جنرل کونسل نیسیہ (NICEA) میں منعقد ہوئی اور گو وہ خود اس وقت تک باضابطہ عیسائی نہیں ہوا تھا لیکن اسی نے کونسل کی صدارت کی۔ یہ کونسل نہایت اہم تھی۔ اس میں عیسائیت کے تمام فرقوں اور تمام کلیسوں کے ذمہ دار نمائندے موجود تھے۔

اصلی معرکہ آریوسی فرقہ اور الوہیت مسیح کے معتقدین کے درمیان تھا۔ اس کونسل کی روداد نہایت دلچسپ ہے۔ جس وقت بوڑھا آریوس مسیح علیہ السلام کے مخلوق ہونے پر تقریر کرنے کھڑا ہوا، ایک شخص نے اس کے منہ پر تھپڑ کھینچ مارا اور بہت سے بشپ اور پادری کانوں میں انگلیاں دیئے ہوئے یہ کہتے ہوئے بھاگے کہ اس بڈھے پھوس کی کفریات کی تاب نہیں لا سکتے۔ کونسل کی اکثریت آریوس کے خلاف تھی۔ اس وجہ سے اس کی پارٹی اور اس کے دوسرے حامیوں کو شکست ہوئی۔ کونسل نے کئی دن کی بحث و تمحیص کے بعد کثرت رائے سے مسیحی عقیدہ مندرجہ ذیل الفاظ میں مرتب کیا جو (NICEAN GREED) کے نام سے موسوم ہوا اور مسیحی عقائد کے باب میں چوتھی صدی سے لے کر آج تک مسلم اور سب سے اہم دستاویز ہے۔

"ہم ایک خدا پر ایمان لاتے ہیں جو باپ ہے اور قادر مطلق، تمام چیزوں کا خالق تمام حاضر و غائب کا، اور ایک خداوند یسوع مسیح پر ایمان لاتے ہیں، ابن اللہ، خدا کا جنا ہوا، اکلوتا، باپ کے جوہر سے، خداوند خدا، نور النور، عین خدا سے عین خدا، جنا ہوا، بنایا ہوا نہیں، باپ ہی کے جوہر سے، جس نے تمام چیزیں بنائیں آسمان اور زمین میں، جو ہم آدمیوں کے لیے اور ہماری نجات کے لیے اترا، مجسم بشکل انسانی، اس نے دکھ اٹھایا، پھر تیسرے دن جی اٹھا اور آسمان پر چڑھ گیا۔ مردوں اور زندوں کی عدالت کے لیے پھر آئے گا۔ اور ہم روح القدس پر ایمان لاتے ہیں۔"

"پر وہ جو کہتے ہیں کہ پہلے وہ نہ تھا اور جنے جانے سے پہلے وہ معدوم تھا اور وہ عدم سے وجود میں آیا، یا وہ جو کہتے ہیں کہ خدا کا بیٹا دوسری شے یا دوسرے جوہر سے ہے، یا مخلوق ہے یا بشر ہے وہ کیتھولک اور رسولی چرچ کی طرف سے مردود ہیں۔"

نیسیہ کی کونسل کے بعد سے یہی عقیدہ مسیحی دُنیا کا اصلی عقیدہ ہے۔ اس میں آریوس اور اس کے ساتھیوں کی علانیہ تکفیر کر دی گئی ہے۔ اس کونسل کے بعد سے یہ صرف چرچ ہی کا نہیں بلکہ اسٹیٹ کا بھی مذہب بن گیا اور اس کی تائید کے لیے حکومت کی تلوار بھی بے نیام ہوگئی۔ اس وجہ سے آریوس کے بہت سے ساتھیوں نے بھی اس کی تائید ہی میں امان دیکھی۔

کس قدر حیرت اور عبرت کا مقام ہے کہ جن عیسائیوں نے پوری تین صدیاں، انسانوں کی خدائی کے انکار کے جرم میں، سلاطین روم کے دل ہلا دینے والے مظالم و شدائد کے شکنجہ میں گزاریں، تلواروں سے قیمہ کیے گئے، آگ میں بھونے گئے، درندوں سے نچوائے گئے لیکن انسانوں کی خدائی سے برابر انکار کرتے رہے، وہی عیسائی نیسیہ میں جمع ہو کر، ایک کافر بادشاہ کی رہنمائی میں، مسیح کی خدائی کے محضر پر اس عزم و جزم کے ساتھ اپنی مہر تصدیق ثبت کر دیتے ہیں۔

اس کونسل کے بعد کونسلوں پر کونسلیں منعقد ہوئیں اور بعد کی صدیوں میں بھی برابر منعقد ہوتی رہیں، بہت سے جزئی اختلافات بھی پیش آئے، کبھی کبھی ایسا بھی ہوا کہ آریوس کے حامیوں نے زور بھی پکڑ لیا۔ یہاں تک کہ قسطنطین کے جانشینوں میں سے بھی بعض نے آریوسی عقیدہ اختیار کر لیا۔ لیکن یہ سب عارضی اور وقتی جزر و مد تھے۔ مرکزیت اسی عقیدہ کو حاصل رہی جو اوپر مذکور ہوا اور مشہور مورخ گبن کے لفظوں میں اب اسی عقیدہ کے اسرار و رموز کو حل کرنے کا نام مسیحیت رہ گیا ہے۔

عیسائیوں کے یہی وہ مشرکانہ عقائد ہیں جن کی قرآن نے نہایت تفصیل کے ساتھ تردید کی ہے۔ ہم بعض آیتیں نقل کرتے ہیں۔

| | |
|---|---|
| وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرُ ابْنُ اللَّهِ وَقَالَتِ النَّصَارَى الْمَسِيحُ | یہود کہتے ہیں کہ عزیر اللہ کے بیٹے ہیں اور نصاریٰ کہتے ہیں مسیح اللہ کے بیٹے |

ابْنُ اللّٰهِ ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ | ہیں، یہ ان کے منہ کی بات ہے، ان
يُضَاهِئُوْنَ قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا | لوگوں کی مشابہت کرتے ہیں جنھوں نے
مِنْ قَبْلُ قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ | ان سے پہلے کفر کیا اللہ ان کو ہلاک
اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ (توبہ - ۳۰) | کرے کہاں بھٹک گئے ہیں۔

ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ، یہ ان کے منہ کی بات ہے، یعنی اللہ نے نہیں فرمایا ہے، یہ ان کی اپنی من گھڑت ہے۔ کتاب الٰہی میں اس کی کوئی سند نہیں ہے۔ یضاھئون قول الذین کفروا من قبل، اپنے سے پہلے کے کافروں کی مشابہت کرتے ہیں یعنی بے سوچے سمجھے اپنے اگلوں کی بات دہراتے ہیں اور قرآن کی توضیح و تشریح کے بعد بھی غور نہیں کرتے کہ اصل حقیقت کیا ہے۔

انہی لوگوں کو مخاطب کر کے دوسری جگہ فرمایا ہے۔ یا اھل الکتاب لا تغلوا فی دینکم غیر الحق ولا تتبعوا اھواء قوم قد ضلوا من قبل واضلوا کثیرا وضلوا عن سواء السبیل (اے اہل کتاب (نصاریٰ) اپنے دین میں حق سے ہٹ کر غلو نہ کرو اور ان لوگوں کی بدعات کی پیروی نہ کرو جو تم سے پہلے گمراہ ہوئے اور جنہوں نے بہتوں کو گمراہ کیا اور جو وسط راہ سے بھٹک گئے) یعنی اس تمام فساد کی جڑ آباء پرستی ہے۔ جو ضلالت اگلوں سے چلی آرہی ہے، بے سوچے سمجھے اسی کی پیروی کر رہے ہیں اور اندھی تقلید نے ان کو صحیح تعلیم کی طرف توجہ کرنے سے محروم کر دیا ہے۔

بعض آیات میں ان کے شرک کو کفر سے تعبیر کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شرک حقیقت کے اعتبار سے کفر ہی ہے۔ دین میں صرف خدا کو ماننا معتبر نہیں ہے بلکہ اس کو جمیع صفات کمال کے ساتھ ماننا معتبر ہے۔ اس لیے وہ ماننا جو اس کی تمام صفات کے ساتھ نہ ہو، جیسا کہ مشرکین مانتے ہیں، درحقیقت نہ ماننے کے حکم میں ہے۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْا اِنَّ اللّٰهَ | ان لوگوں نے کفر کیا جو کہتے ہیں اللہ تو

| | |
|---|---|
| هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ قُلْ | وہی مسیح بن مریم ہے۔ کہدو کون اللہ |
| فَمَنْ يَّمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ | کے مقابل میں کسی چیز پر اختیار رکھتا |
| شَيْـًٔا اِنْ اَرَادَ اَنْ يُّهْلِكَ | ہے۔ اگر وہ ارادہ کرے کہ ہلاک کر دے |
| الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗ | مسیح بن مریم کو اور اس کی ماں کو اور |
| وَمَنْ فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَ | ان سب کو جو زمین میں بستے ہیں اور |
| لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ | اللہ ہی کے لیے آسمانوں اور زمین کی |
| وَمَا بَيْنَهُمَا يَخْلُقُ مَا | بادشاہی ہے اور جو ان کے درمیان ہیں |
| يَشَآءُ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ | پیدا کرتا ہے جو کچھ چاہتا ہے اور اللہ |
| قَدِيْرٌ (مائدہ - ۱۷) | ہر چیز پر قادر ہے۔ |

اس آیت میں مخاطب وہ لوگ ہیں جو حضرت مسیح کو خدا کا اوتار مانتے تھے اور چونکہ الوہیت مسیح کی ایک بڑی دلیل ان کی خارق عادت ولادت بھی تھی اس وجہ سے آیت کے آخری حصہ میں اس کی تردید کی ہے۔ اس خیال کی تردید قرآن نے مختلف جگہ مختلف طریقوں سے کی ہے۔ بعض جگہ ان کو حضرت آدمؑ سے تشبیہ دی ہے کہ بن باپ کے پیدا ہونا اگر دلیل الوہیت ہے تو آدم کو بھی الٰہ ہونا چاہیے۔ بعض سورتوں میں حضرت یحییٰ علیہ السلام کی ولادت کو حضرت مسیح علیہ السلام کی سرگزشت کا مقدمہ قرار دیا ہے کہ اگر عام اسباب کے خلاف پیدا ہو جانا خدا بن جانے کی دلیل ہے تو مرد کی پیری اور عورت کے بانجھ پن کے باوجود کسی لڑکے کی ولادت بھی خلاف عادت ہے، پھر حضرت یحییٰ کو خدا کیوں نہیں مانتے؟

سورۂ مائدہ میں ہے۔

| | |
|---|---|
| لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ | بلاشبہ ان لوگوں نے کفر کیا جنہوں نے |
| اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ وَ | کہا کہ اللہ تو وہی مسیح بن مریم ہیں حالانکہ |

| | |
|---|---|
| قَالَ الْمَسِيحُ يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ | مسیح نے تعلیم دی ہے کہ اے بنی اسرائیل |
| اعْبُدُوا اللَّهَ رَبِّي وَرَبَّكُمْ إِنَّهُ | اللہ ہی کی بندگی کرو جو میرا بھی رب |
| مَنْ يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدْ حَرَّمَ | ہے اور تمہارا بھی رب ہے بے شک |
| اللَّهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَأْوَاهُ | جو اللہ کا کسی کو ساجھی ٹھہرائے گا تو اللہ |
| النَّارُ وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ | نے اس پر جنت حرام کردی ہے اور اس |
| أَنْصَارٍ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا | کا ٹھکانا آگ ہوگا اور ظالموں (مشرکوں) |
| إِنَّ اللَّهَ ثَالِثُ ثَلَاثَةٍ وَمَا | کے لیے کوئی مددگار نہیں ہوگا۔ بیشک |
| مِنْ إِلَٰهٍ إِلَّا إِلَٰهٌ وَاحِدٌ.... | ان لوگوں نے کفر کیا جنھوں نے کہا اللہ |
| .... مَا الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ إِلَّا | تین کا تیسرا ہے۔ نہیں کوئی معبود مگر ایک ہی |
| رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ | ...... نہیں ہے مسیح بن مریم مگر |
| الرُّسُلُ وَأُمُّهُ صِدِّيقَةٌ | ایک رسول۔ اس سے پہلے بہت سے |
| كَانَا يَأْكُلَانِ الطَّعَامَ | انبیا گزر چکے ہیں اور اس کی ماں صدیقہ |
| (مائدہ ۷۲-۷۵) | تھی اور دونوں کھانا کھاتے تھے۔ |

اس آیت میں حلول اور تثلیث دونوں کے قائلین کی تردید ہے اور ان دونوا فرقوں کے دعوے کے خلاف خود مسیح علیہ السلام کی تعلیم یہ نقل کی گئی ہے کہ اُعْبُدُوا اللّٰہَ رَبِّیْ وَرَبَّکُمْ (اللہ ہی کی بندگی کرو جو میرا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے) انجیل میں حضرت مسیح کا یہ قول جو بار بار نقل ہوتا ہے کہ "میرا باپ اور تمہارا باپ"، قرآن نے اس کی ٹھیک ٹھیک تعبیر یہ بتائی ہے کہ وہ درحقیقت میرا رب اور تمہارا رب فرماتے تھے۔ اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ عبرانی میں 'اب' کا لفظ باپ اور رب کے مفہوم کے لیے مشترک ہے۔

آیت کے آخر میں ماں اور بیٹے دونوں کے کھانا کھانے کو بھی ان کی بشریت کی

دلیل کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ کھانا کھانا بشریت کی ایک ایسی دلیل ہے جو بنی اسرائیل میں مسلم تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس جو فرشتے آدمیوں کی شکل میں آئے تھے انھوں نے ان کے سامنے کھانا پیش کیا لیکن جب انھوں نے کھانے کی طرف التفات نہیں کیا تو حضرت ابراہیمؑ کو فوراً اندیشہ ہوا کہ یہ لوگ بشر نہیں بلکہ فرشتے ہیں۔

انجیل لوقا میں ہے کہ ایک مرتبہ خود مسیح علیہ السلام نے بھی کھانا کھا کر اپنے حواریوں کو اپنی بشریت کا یقین دلایا۔ اٹھا لیے جانے کے بعد جب وہ دوبارہ اپنے شاگردوں کے پاس آئے تو شاگرد بہت گھبرائے اور ان کی باتیں سن کر ان کو یہ گمان گزرا کہ کوئی روح ان سے باتیں کر رہی ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے ان کے اس وہم کو جس طرح دور کیا۔ اس کی تفصیل انجیل میں اس طرح بیان ہوئی ہے۔

"اس نے ان سے کہا تم کیوں گھبراتے ہو اور کس واسطے تمھارے دل میں شک پیدا ہوتے ہیں۔ میرے ہاتھ، میرے پاؤں دیکھو کہ میں ہی ہوں۔ مجھے چھو کر دیکھو کیونکہ روح کے گوشت اور ہڈی نہیں ہوتی، جیسا کہ مجھ میں دیکھتے ہو۔ اور یہ کہہ کر اس نے اپنے ہاتھ اور پاؤں دکھائے۔ جب مارے خوشی کے ان کو یقین نہ آیا اور تعجب کرتے تھے تو اس نے ان سے کہا یہاں تمھارے پاس کچھ کھانے کو ہے؟ انھوں نے اسے بھونی ہوئی مچھلی کا قتلہ دیا اس نے لے کر ان کے روبرو کھایا۔" (لوقا ۲ : ۳۹ - ۴۳)

اسی سلسلہ میں قرآن مجید کی وہ عظیم سورہ بھی پڑھ لینی چاہیے جو نصاریٰ کی مشرکانہ ضلالتوں کی سب سے زیادہ جامع تردید ہے۔ یعنی سورۂ اخلاص۔

| | |
|---|---|
| قُلْ هُوَ اللّٰهُ أَحَدٌ ۔ اَللّٰهُ | کہہ کہ وہ اللہ بے ہمہ ہے۔ اللہ باہمہ |
| الصَّمَدُ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ وَلَمْ | ہے نہ وہ باپ ہے نہ وہ بیٹا ہے نہ |
| يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا أَحَدٌ (اخلاص) | کوئی اس کی برابری کا ہے۔ |

اس سورہ کے ایک ایک لفظ کا صحیح وزن سمجھنے کے لیے مناسب ہو گا کہ اوپر نیسیہ کی کونسل کا مرتب کیا ہوا مسیحی عقیدہ، جو ہم نقل کر آئے ہیں، اس کے الفاظ پر غور کر کے، ایک مرتبہ اور پڑھ لیجیے۔ اس کے تقابل سے اندازہ ہو سکے گا کہ یہ سورہ اس عقیدۂ ضلالت کی ایک ایک اصل کو کس طرح ڈھا رہی ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ایک زمانہ میں نصاریٰ کو اس سورہ سے اس قدر چڑ رہی ہے کہ اگر وہ کسی کو اپنے مذہب میں داخل کرتے تھے تو اس سے نعوذ باللہ اس خدا پر لعنت کرواتے تھے جس کی صفت اس سورہ میں بیان کی گئی ہے۔

یہاں تک احبار و رہبان اور حضرت مسیح علیہ السلام کو رب بنانے کی تفصیلات بیان ہوئی ہیں لیکن قرآن نے اہل کتاب کو بعض دوسرے اقسام شرک کا بھی مجرم قرار دیا ہے۔ مثلاً فرمایا:۔

| | |
|---|---|
| يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ | اے وہ لوگو جن کو کتاب ملی ہے، ایمان |
| اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِّمَا | لاؤ اس چیز پر جو ہم نے اتاری ہے |
| مَعَكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّطْمِسَ | مطابق اس چیز کے جو تمھارے پاس ہے |
| وُجُوْهًا فَنَرُدَّهَا عَلٰٓى اَدْبَارِهَآ | اس سے پہلے کہ ہم مٹا دیں چہروں کو |
| اَوْ نَلْعَنَهُمْ كَمَا لَعَنَّآ اَصْحٰبَ | پس پھیر دیں ان کو ان کے پیچھے یا ان |
| السَّبْتِ ؕ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ | پر لعنت کر دیں جس طرح سبت والوں پر |
| مَفْعُوْلًا ۝ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ | لعنت کر دی اور خدا کی بات شدنی |
| اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا | ہے، بیشک اللہ اس بات کو نہیں |
| دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ | بخشے گا کہ اس کا ساجھی ٹھہرایا جائے |
| يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰٓى | اور اس کے سوا جو کچھ ہے اس کو بخش |
| اِثْمًا عَظِيْمًا ۝ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ | دے گا جس کے لیے چاہے اور جو کوئی |

| | |
|---|---|
| يُزَكُّونَ أَنْفُسَهُمْ ط بَلِ اللّٰهُ | اللہ کا ساجھی ٹھہرائے گا تو اس نے |
| يُزَكِّي مَنْ يَّشَآءُ وَلَا يُظْلَمُوْنَ | بہت بڑا گناہ گھڑا۔ کیا تم نے ان |
| فَتِيْلًا ٥ اُنْظُرْ كَيْفَ | لوگوں کو نہیں دیکھا جو اپنی پاکی کا دعویٰ |
| يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ط | کرتے ہیں ؟ بلکہ اللہ پاک کرتا ہے |
| وَكَفٰى بِهٖٓ اِثْمًا مُّبِيْنًا ٥ | جس کو چاہتا ہے اور ذرا بھی اس |
| اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ | کے ساتھ کمی نہیں کی جائے گی۔ دیکھو |
| اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ | کس طرح اللہ پر جھوٹا بہتان لگاتے |
| يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَ | ہیں اور کھلا ہوا گناہ ہونے کے لیے |
| الطَّاغُوْتِ وَيَقُوْلُوْنَ | یہ کافی ہے۔ کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں |
| لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا هٰٓؤُلَآءِ | دیکھا جن کو کتاب کا ایک حصہ ملا۔ وہ |
| اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ | ایمان لاتے ہیں جبت اور طاغوت پر |
| اٰمَنُوْا سَبِيْلًا ٥ | اور کہتے ہیں کافروں کو کہ یہ ایمان والوں |
| (النساء ۴۷ - ۵۱) | سے زیادہ راہ یاب ہیں۔ |

ان آیات میں اہل کتاب کے لیے قرآن پر ایمان لانے کی دعوت کے ساتھ یہ دھمکی بھی ہے کہ اگر وہ ایمان نہ لائے تو مستحق ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ ان کے چہرے مسخ کر دے اور جس طرح سبت کی حرمت برباد کرنے والوں پر لعنت کی گئی اسی طرح ان پر بھی لعنت کر دی جائے۔ آنکھ، کان، دماغ یہ ساری چیزیں اللہ تعالیٰ نے فائدہ اٹھانے کے لیے بخشی ہیں۔ اگر کوئی قوم ان چیزوں کو رکھ کر ان سے فائدہ نہیں اٹھاتی اور خدا کی آیتیں نہ اس کو دکھائی ہی دیتی ہیں نہ سنائی ہی دیتی ہیں تو وہ مستحق ہے کہ ان نعمتوں سے محروم کر دی جائے۔ اس کے بعد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ شرک کو ہرگز معاف نہیں فرمائے گا۔ البتہ اس کے علاوہ جو گناہ ہیں ان کو جس کے لیے

چاہے گا معاف کر دے گا۔ پھر اہل کتاب کے تین شرک گنائے ہیں۔

(۱) اپنی پاکی اور برتری کا دعویٰ

(۲) ایمان بالجبت والطاغوت

(۳) حمایت شرک

یہاں ہم ان تینوں کی شرح کریں گے لیکن طوالت سے بچنے کے لیے اختصار کو پیش نظر رکھیں گے۔

**ج۔ پاکی و برتری کا دعویٰ** اَلَمْ تَرَ اِلَی الَّذِیْنَ یُزَکُّوْنَ اَنْفُسَھُمْ (ان لوگوں کو نہیں دیکھتے جو اپنی پاکی کا دعویٰ کرتے ہیں) سے یہود و نصاریٰ کے اس خیال کی طرف اشارہ ہے جس کا ذکر قرآن شریف میں جگہ جگہ ہوا ہے۔ سورۂ مائدہ میں ہے۔

| | |
|---|---|
| وَقَالَتِ الْیَھُوْدُ وَالنَّصٰرٰی | اور یہود اور نصاریٰ کہتے ہیں ہم اللہ |
| نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰہِ وَاَحِبَّآؤُہٗ، قُلْ | کے بیٹے اور اس کے دوست ہیں۔ پوچھو |
| فَلِمَ یُعَذِّبُکُمْ بِذُنُوْبِکُمْ بَلْ | پھر خدا تمھیں گناہوں کے بدلہ میں سزا |
| اَنْتُمْ بَشَرٌ مِّمَّنْ خَلَقَ یَغْفِرُ | کیوں دیتا رہا ہے؟ بلکہ تم بھی خدا کی مخلوق |
| لِمَنْ یَّشَآءُ وَیُعَذِّبُ مَنْ | کے عام آدمیوں کی طرح ہو۔ وہ بخشے گا جس |
| یَّشَآءُ (مائدہ - ۱۸) | کو چاہے اور سزا دے گا جس کو چاہے۔ |

سورہ جمعہ میں ہے۔

| | |
|---|---|
| قُلْ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ ھَادُوْٓا | کہہ دو اے وہ لوگو جو یہودی ہوئے |
| اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّکُمْ اَوْلِیَآءُ لِلّٰہِ | اگر تمھارا خیال ہے کہ تم اللہ کے دوست |
| مِنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ | ہو لوگوں کے علاوہ تو موت کی تمنا کرو |
| اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ (۶) | اگر تم سچے ہو۔ |

اوپر مشرکین کے بیان میں خود پرستی کے عنوان سے، ہم جو کچھ لکھ آئے ہیں اس مقام کو سمجھنے کے لیے اس پر ایک نظر ڈال لینا مفید ہوگا۔ مشرکین اور اہل کتاب کے قلوب میں مشابہت کا ذکر قرآن نے کئی جگہ کیا ہے۔ یہ بھی اسی مشابہت کی ایک قسم ہے۔ جس طرح مشرکین خانہ کعبہ کی بدولت ایک عرصہ تک مرجع خلائق بنے رہنے اور امن و فارغ البالی کی زندگی بسر کرتے رہنے کی وجہ سے اس خبط میں مبتلا ہو گئے تھے کہ یہ جو کچھ انھیں حاصل ہے ان کے استحقاقِ ذاتی کا ثمرہ، ان کے حسب و نسب کا لازمی نتیجہ اور ان کے علم و تدبر کا کرشمہ ہے، وہ اسی حال میں رہیں گے۔ یہ عزت یہ سیادت، یہ سربراہی ان کے لیے اب وجد کی چھوڑی ہوئی میراث ہے جن کی قیمت ان کے باپ دادا ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام اپنی نیکیوں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ادا کر چکے ہیں اور اب ان کو کچھ کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ ٹھیک اسی طرح اہل کتاب بھی ایک عرصہ کی متوارث عظمت دینی و دنیاوی کی مسند پر متمکن رہنے کی وجہ سے اس خبط میں مبتلا ہو گئے تھے کہ قوموں کی سربراہی اور قیادت ان کا فطری اور قدرتی منصب ہے جس پر وہ اس لیے سرفراز کیے گئے ہیں کہ وہ خدا کی برگزیدہ مخلوق ہیں، اس کے محبوب اور چہیتے ہیں اور اس کے محبوبوں اور برگزیدوں کی اولاد ہیں۔

تورات وغیرہ میں جو عزتیں اور بزرگیاں صفات و اخلاق کے ساتھ وابستہ کی گئی تھیں۔ وہ تمام کی تمام انھوں نے اپنی قوم اور اپنی نسل کے ساتھ خاص کر دیں۔ اس خبط میں پڑ جانے کے بعد ان کا سارا اعتماد اس بات پر رہ گیا کہ وہ ابراہیم، اسحٰق اور یعقوب علیہم السلام کی اولاد ہیں اور ان اکابر کی اولاد میں ہونا ہی خدا کے یہاں تقرب اور اس کی پکڑ سے نجات کے لیے کافی ہے۔ عمل و اطاعت کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ یہیں سے ان کو یہ خیال بھی پیدا ہو گیا کہ جہنم کی آگ ہمیں چند دنوں سے زیادہ نہیں چھوئے گی۔ ہمیشگی کی جہنم ہمارے لیے نہیں ہے۔ یہیں سے یہ خبط بھی

ان کو پیدا ہو گیا کہ دنیا کو دین و ایمان کی روشنی اب صرف ہمارے ہی واسطہ سے مل سکتی ہے، کوئی دوسری قوم اس کا وسیلہ نہیں بن سکتی۔ قوم ہماری قوم ہے، نبی ہمارا نبی ہے اور ہدایت صرف ہماری ہدایت ہے جو ہمارے اندر رہے وہ راہ یاب ہے، جو ہم سے باہر ہے وہ گمراہ ہے۔

یہود کے اسی غرہ کی بنا پر حضرت مسیح علیہ السلام نے ان سے فرمایا کہ تم اولاد ابراہیمؑ میں سے ہونے پر گھمنڈ نہ کرو، خدا ابراہیمؑ کے لیے زمین کے ذرّوں سے اولاد پیدا کر سکتا ہے۔ قرآن نے ان کے یہ سارے خیالات سورۂ بقرہ وغیرہ میں نقل کئے ہیں اور ان کو امانی (جھوٹی آرزوئیں) ظنون (بے بنیاد خیالات) زخرف القول (ملمع کی ہوئی باتیں) وغیرہ الفاظ سے تعبیر کیا ہے، اور ان میں سے ایک ایک وہم کی تردید کی ہے اور ان خیالات ہی کی بنا پر ان کو ہدایتِ الٰہی کی پیروی سے محروم قرار دیا، ان کو رسولوں کے درمیان تفریق کرنے کا مجرم ٹھہرایا، یہاں تک کہ ان کو اسلام، خدا کی بندگی اور اخلاص (یعنی توحید) سے بھی محروم قرار دیا اور ان کی دعوت کُونُوا ہُوْدًا اَوْ نَصَارٰی تَہْتَدُوْا (یہودی ہو جاؤ یا نصاریٰ راہ یاب ہو گے) کی جگہ امت وسط بنی مسلمانوں کا کلمہ یہ بتایا۔

| | |
|---|---|
| قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ | کہو ہم ایمان لائے اللہ پر اور اس چیز پر |
| اُنْزِلَ اِلَیْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓی | جو ہماری طرف اتاری گئی اور جو اتاری گئی |
| اِبْرٰھِیْمَ وَاِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ | ابراہیم، اسمٰعیل، اسحٰق، یعقوب اور |
| وَیَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِیَ | ان کی اولاد پر اور جو دی گئی موسیٰ اور |
| مُوْسٰی وَعِیْسٰی وَمَآ اُوْتِیَ | عیسیٰ کو اور جو ملی نبیوں کو ان کے رب |
| النَّبِیُّوْنَ مِنْ رَّبِّھِمْ لَا | کی طرف سے۔ ہم ان میں سے کسی کے |
| نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْھُمْ | درمیان کوئی فرق نہیں کرتے اور ہم اسی |

| | |
|---|---|
| وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۝ فَاِنْ | کے فرمانبردار ہیں۔ پس اگر وہ ایمان لائیں |
| اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ | جس طرح تم ایمان لائے تو وہ راہ یاب |
| فَقَدِ اهْتَدَوْا وَاِنْ تَوَلَّوْا | ہوئے اور اگر وہ اعراض کریں تو وہ جھگڑے |
| فَاِنَّمَا هُمْ فِيْ شِقَاقٍ | میں پڑے ہوئے ہیں اور تمہاری طرف |
| فَسَيَكْفِيْكَهُمُ اللّٰهُ وَهُوَ | سے اللہ ان کے لیے کافی ہے اور وہ سننے |
| السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ، صِبْغَةَ | والا جاننے والا ہے۔ یہ اللہ کا رنگ ہے |
| اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ | اور اللہ سے رنگ میں کون بہتر ہے اور |
| صِبْغَةً وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ ۝ قُلْ | ہم اسی کی بندگی کرنے والے ہیں کہو |
| اَتُحَآجُّوْنَنَا فِي اللّٰهِ وَهُوَ رَبُّنَا | کیا تم ہم سے اللہ کے بارہ میں جھگڑتے |
| وَرَبُّكُمْ وَلَنَآ اَعْمَالُنَا وَ | ہو حالانکہ وہی ہمارا رب ہے اور وہی |
| لَكُمْ اَعْمَالُكُمْ وَنَحْنُ | تمہارا رب بھی ہے اور ہمارے لیے |
| لَهٗ مُخْلِصُوْنَ ۔ | ہمارے اعمال ہیں اور تمہارے لیے تمہارے |
| (البقرہ ۱۳۶-۱۳۹) | اعمال ہیں اور ہم اسی کے لیے خالص ہیں۔ |

اس آیت میں نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ (ہم اسی کے فرمانبردار ہیں) نَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ (ہم اسی کی بندگی کرنے والے ہیں) نَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ (ہم اسی کے لیے خاص ہیں) کے الفاظ خصوصیت کے ساتھ قابل توجہ ہیں۔ ان تینوں میں اہل کتاب پر تعریض ہے کہ نہ تو تم مسلم ہو، نہ خدا کی بندگی کرنے والے ہو، نہ موحد ہو۔ جو خدا کا فرمانبردار، خدا کا بندہ و غلام اور صرف اللہ واحد ہی کا ماننے والا ہوگا وہ اپنے تئیں خدا کے رنگ میں رنگے گا، یہودیت یا نصرانیت کے رنگ سے کیوں ملوث ہوگا؟ وہ اللہ کی ہدایت کی پیروی کرے گا وہ جس شکل اور جس زبان میں بھی آئے اور سب نبیوں پر ایمان لائے گا خواہ وہ کسی قوم میں مبعوث ہوئے ہوں۔ وہ یہ نہیں کرے گا کہ کسی

کو مانے اور کسی کا انکار کر دے۔ یہ ساری باتیں اخلاص اور توحید کے منافی ہیں۔ یہ تم خدا کی بندگی نہیں کر رہے ہو، بلکہ اپنی اپنی قوم کی اور اپنے اپنے نبی کی پرستش کر رہے ہو۔

یہ آیت ان مسلمانوں کے لیے خصوصیت کے ساتھ قابلِ توجہ ہے جو الگ الگ اماموں کی عصبیت میں گرفتار ہیں اور اپنے ہی گروہ کے امام یا علماء کے اندر حق و ہدایت کو محصور مانتے ہیں۔ انھیں سوچنا چاہیے کہ اگر کسی ایک نبی یا انبیاء کی کسی ایک ہی جماعت پر جم جانا اور دوسروں کا انکار کر دینا جائز نہیں ہے اور یہ اخلاص و توحید کے منافی ہے تو کسی ایک امام یا علماء کی کسی ایک ہی جماعت کے اندر حق کو محدود کر دینا خدا پرستی، اتباع ہدی اللہ و سنت رسول اور توحید کی روح سے کس طرح ہم آہنگ ہو سکتا ہے!

## د۔ ایمان بالجبت والطاغوت

جبت سے مراد سحر، شعبدے، گنڈے، ٹونے ٹوٹکے اور رمل جفر وغیرہ ہیں۔

بائیبل ہسٹری اور یہود کی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہود نے کلدانیوں کے تمام علوم سفلیہ سیکھ لیے تھے۔ یہ چیزیں تاریخ کے ہر عہد میں اہل مذاہب کے لیے فتنہ بنی رہی ہیں۔ مذہب کی سیدھی سادی بلکہ کڑوی کسیلی تعلیمات جب بے مزہ معلوم ہونے لگتی ہیں اور نفس چٹخاروں کی تلاش میں ہوتا ہے تو یہ چیزیں رواج پا جاتی ہیں۔ یہ چیزیں مذہب کی اصلی روح کی موت کی نشانی ہیں۔ جس دن یہ فتنے کسی قوم میں ظاہر ہونے شروع ہوئے وہی دن مذہب کی پاک تعلیم کے زوال کا روزِ اول ہوتا ہے۔ جو لوگ ان چیزوں میں منہمک ہوتے ہیں کتابِ الٰہی سے ان کا تعلق ٹوٹ جانا لازمی ہے۔ ان دونوں کے سرچشمے دو ہیں۔ ایک کا مصدر رو منبع شیطان ہے۔ اور دوسرے کا سرچشمہ رحمان ہے۔ جو لوگ شیطان سے رشتہ

جوڑ لیتے ہیں ان کے لیے ناگزیر ہے کہ وہ خدا سے کٹ جائیں اور نبیوں کی تعلیم اور اللہ کی کتاب کو پس پشت ڈال دیں۔ چنانچہ یہود کا بھی حال ہوا۔ سورہ بقرہ میں ان کی اسی جبت پرستی کا ذکر ہے۔

| | |
|---|---|
| وَلَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ | اور جب آیا ان کے پاس ایک رسول |
| عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا | اللہ کے پاس سے مطابق اس چیز کے جو |
| مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ | ان کے پاس ہے تو ان لوگوں میں سے |
| الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ كِتٰبَ | ایک گروہ نے جن کو کتاب ملی اللہ کی |
| اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ | کتاب کو پس پشت ڈال دیا گویا وہ |
| لَا يَعْلَمُوْنَ. وَاتَّبَعُوْا مَا | علم رکھتے ہی نہیں ۔ اور پیروی کی |
| تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ | اس چیز کی جو شیاطین سلیمان کے عہد |
| سُلَيْمٰنَ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ | میں پڑھتے تھے اور سلیمان نے کفر |
| الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ | نہیں کیا بلکہ شیاطین نے کفر کیا وہ لوگوں |
| السِّحْرَ وَمَا اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ | کو جادو سکھاتے تھے اور اس چیز کی |
| بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ | پیروی کی جو بابل میں دو فرشتوں ہاروت |
| (البقرۃ - ۱۰۱-۱۰۲) | ماروت پر اتاری گئی۔ |

’طاغوت‘ بروزنِ ملکوت و جبروت طغیٰ کے مادہ سے ہے جس کے معنی حد سے تجاوز کرنے کے ہیں۔ جو چیز حد مناسب سے آگے بڑھ جائے اس کے لیے عربی میں کہیں گے طغیٰ۔ طغی الماء، پانی حد سے آگے بڑھ گیا۔ قوم ثمود جس آفت سے ہلاک ہوئی اس کے لیے قرآن میں طاغیہ کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے معنی حد سے بڑھ جانے والی آفت کے ہیں۔ یہیں سے یہ لفظ حدود عبدیت و بندگی سے نکل جانے کے لیے استعمال ہوا اور جو چیز حدود بندگی سے نکل جائے اس کو طاغوت

کہنے لگے۔ پھر وہ چیزیں بھی اس کے تحت آگئیں جو حدودِ بندگی سے نکل جانے کا باعث یا ذریعہ ہوں۔ اہل لغت اسی وجہ سے اس کی تشریح یوں کرتے ہیں۔ الطاغوت عبارۃ عن کل متعد وکل معبود من دون اللہ (طاغوت سے مراد ہر وہ شے ہے جو حد سے نکل جائے اور ہر وہ معبود جس کی اللہ کے سوا پرستش کی جائے)

قرآن نے اس لفظ کو مختلف مقامات میں استعمال کیا ہے اور ہر جگہ اس کے مقابل کا ذکر کر کے اس کے مختلف مفہوموں پر روشنی ڈال دی ہے۔ مثلاً بقرہ میں ہے۔ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ۔ یہاں اللہ کے تقابل سے واضح ہے کہ طاغوت سے مراد ماسوا اللہ ہے۔ سورہ نحل میں ہے اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ سورہ نساء میں ہے اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ اس کے بعد فرمایا فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِيَاۗءَ الشَّيْطٰنِ۔ جس سے متعین ہو گیا کہ طاغوت سے مراد شیطان ہے اور شیطان سے مراد شیاطین الانس والجن دونوں ہیں اور قرآن میں غیر الٰہی دعوت و اطاعت کے لیے یہ ایک جامع تعبیر ہے۔ اسی طرح ایک دوسری جگہ اس لفظ کو کتاب الٰہی اور طریقہ رسول کے ضد کے لیے استعمال کیا۔ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ وَقَدْ اُمِرُوْٓا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِهٖ ۭ وَيُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّضِلَّھُمْ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا، وَاِذَا قِيْلَ لَھُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ رَاَيْتَ الْمُنٰفِقِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا۔[1] اس آیت میں يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ کے بالمقابل تعالوا الی ما انزل اللہ والی الرسول کہہ کر واضح کر دیا کہ طاغوت

---

[1] النساء ۶۰-۶۱

کتاب الٰہی اور سنتِ رسول کی ضد کے لیے ایک جامع تعبیر ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ جو چیز خدا کی بندگی و اطاعت سے نکل جائے یا نکل جانے کا باعث یا ذریعہ ہو، وہ سب طاغوت کے حکم میں داخل ہے۔ پس شیطان، ساحر، کاہن، اصنام و اوثان، فرعون و نمرود، اللہ کی ہدایت سے ہٹانے والے لیڈر، غیر الٰہی حکومتیں، غیر الٰہی عدالتیں، غیر الٰہی درسگاہیں، غیر الٰہی خانقاہیں سب اس کے تحت آتی ہیں اور اہل کتاب شرک کی اس قسم میں مبتلا تھے۔ مَنۡ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَغَضِبَ عَلَيۡهِ وَجَعَلَ مِنۡهُمُ الۡقِرَدَةَ وَالۡخَنَازِيۡرَ وَعَبَدَ الطَّاغُوۡتَ اُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّاَضَلُّ عَنۡ سَوَآءِ السَّبِيۡلِ۔ (مائدہ - ۶۰)

## د۔ حمایتِ شرک

اہل کتاب کا تیسرا شرک حمایت شرک ہے۔ شرک کی حمایت خواہ کسی نوعیت سے ہو شرک ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کو اپنی کتاب عنایت فرمائی تھی۔ ان سے اپنی شریعت کی پابندی کا عہد لیا تھا۔ ان کے اوپر آئندہ مبعوث ہونے والے نبی کی حمایت وتائید اور لوگوں سے اس کا تعارف کرانے کی ذمہ داری ڈالی تھی۔ یہود سے کہا گیا تھا کہ "میں ان کے لیے ان کے بھائیوں کے اندر سے ایک نبی تیرے مانند برپا کروں گا اور اپنا کلام ان کے منہ میں ڈالوں گا اور میں جو کچھ اس سے کہوں گا وہ ان کو بتائے گا (تثنیہ) حضرت مسیح اپنے حواریوں سے صاف صاف فرما گئے تھے کہ" مجھے تم سے بہت ساری باتیں کہنی تھیں لیکن ابھی تم ان کا تحمل نہ کر سکو گے لیکن جب وہ روح حق آئے گا تو سارے حق کی طرف تمھاری رہنمائی کرے گا۔" (یوحنا) یہود کو اس نبی کی بعثت کا انتظار بھی تھا اور وہ اپنے یہاں کی پیشین گوئیوں کے مطابق یقین بھی رکھتے تھے کہ یہ نبی ان کی سعادت کا فتح باب ہوگا اور ان کو کفار پر فتح دلائے گا (وَكَانُوۡا مِنۡ قَبۡلُ يَسۡتَفۡتِحُوۡنَ عَلَى الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا) اور نصاریٰ تو گویا یکسر چشم انتظار ہی تھے۔ حضرت مسیح علیہ السلام

نے انجیل میں جو تمثیلیں بیان فرمائی ہیں اگر ان کی تشریح کر دی جائے تو معلوم ہو گا کہ امثال انجیل کا بڑا حصہ آخری بعثت کی سرگزشت کے سوا کچھ ہے ہی نہیں۔

ان حالات کی موجودگی میں ظاہر ہے کہ اہل کتاب کا اصلی فریضہ یہ تھا کہ جب آخری بعثت ظہور میں آئی تو اپنے سابق علم کی روشنی میں اس کو جانچتے پرکھتے، اگر اس کو اپنی پیشین گوئیوں کے مطابق پاتے اس پر ایمان لاتے، لوگوں میں اس کو پہنچواتے، اس کی حمایت و تائید کرتے اور پھر اس کے لائے ہوئے دین کی اقامت کی راہ میں اپنا سب کچھ قربان کر دیتے لیکن ان لوگوں کا حال وہی ہوا جو مسیح علیہ السلام نے کنواریوں والی تمثیل میں بیان فرمایا ہے کہ رات بھر تو وہ اپنی مشعلیں جلائے ہوئے دولہا کا انتظار کرتی رہیں لیکن جب دولہا کے آنے کا وقت ہوا تو ان کی مشعلیں بجھ گئیں، ان کی کپیوں کا تیل ختم ہو گیا اور وہ خود سو گئیں۔ صدیوں تک تو یہ لوگ منتظر رہے لیکن جب اس کا ظہور ہوا اور ان لوگوں نے اس کو پہچان بھی لیا تو ایمان کے بجائے اس کے انکار میں سبقت کی اور اسی پر بس نہیں کیا بلکہ حسد و عناد کے جوش میں کھلم کھلا ان مشرکین کی حمایت و نصرت میں کھڑے ہو گئے جو اس دعوت کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور صرف کر رہے تھے۔ علی الاعلان اس کی تعلیمات کا مذاق اڑایا۔ اس کے کام کو روکنے کے لیے جنگیں برپا کیں اور اس عداوت کے جوش میں اس حد تک اتر آئے کہ مشرکین کے دین کو اس کی دعوت پر ترجیح دیتے اور کفار کو اس کے پیروؤں سے زیادہ برحق اور ہدایت یافتہ بتانے لگے وَيَقُولُونَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا هَٰؤُلَاءِ أَهْدَىٰ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا سَبِيلًا۔ اس شرک دوستی کے ساتھ توحید کے ساتھ کسی لگاؤ کی کہاں گنجائش رہتی ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان پر لعنت کر دی۔ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَعَنَهُمُ اللَّهُ وَمَنْ يَلْعَنِ اللَّهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهُ نَصِيرًا۔

# (۳) منافقین کا شرک

جہاں تک ظاہری اعتقاد و عمل کا تعلق ہے منافقین پورے مسلمان تھے۔ ایمان کے جتنے اجزاء ہیں ان سب کا ان کو اقرار تھا۔ آنحضرت صلعم اور دوسرے تمام انبیاء کی رسالت بھی ان کو تسلیم تھی۔ کلمۂ شہادت بھی وہ پڑھتے تھے۔ مسجدوں میں اسلام کے بتائے ہوئے طریقہ پر نمازیں بھی ادا کر لیتے تھے۔ زکوٰۃ بھی دے دیتے تھے، خانہ کعبہ کا حج بھی کر آتے تھے۔ غزوات میں بھی شریک ہو جاتے تھے۔ بلکہ قرآن سے تو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جہاں تک زبانی اظہار کا تعلق ہے جہاد کا ولولہ بمقابلہ سچے مسلمانوں کے زیادہ ظاہر کرتے تھے اور ایمان بالرسالت کی ظاہرداریوں کا تو یہ عالم تھا کہ آنحضرت صلعم کے پاس آتے اور قسمیں کھا کھا کے یقین دلاتے کہ ہم آپ کو اللہ کا رسول مانتے ہیں لیکن ان ساری باتوں میں سے ان کی ایک بات بھی قرآن نے تسلیم نہیں کی۔ بلکہ ان کو ایمان سے محروم، رسالت کا منکر، شیطان کا ساتھی، جہنم کے سب سے نچلے طبقہ کا مستحق اور صاف صاف لفظوں میں شرک کا مجرم قرار دیا۔

تمام آیتوں کا استقصا یہاں مشکل ہوگا لیکن ان کے شرک سے متعلق چند آیتیں ہم نقل کر کے ان پہ بالاجمال گفتگو کریں گے۔ قرآن مجید نے منافقین کو تحاکم الی الطاغوت کا مجرم قرار دیا ہے اور اس تحاکم الی الطاغوت کو شرک بتایا ہے۔

**تحاکم الی الطاغوت** | سورۂ نساء میں فرمایا ہے:۔

| | |
|---|---|
| اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يَزْعُمُوْنَ | کیا تم نے ان کو نہیں دیکھا جن کا گمان |
| اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ | ہے کہ وہ اس چیز پر ایمان لائے ہیں |
| وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ | جو تمہاری طرف اتاری گئی ہے اور |

| | |
|---|---|
| يُرِيدُونَ أَنْ يَتَحَاكَمُوا | جو تم سے پہلے اتاری گئی ہے۔ وہ |
| إِلَى الطَّاغُوتِ وَقَدْ أُمِرُوا | چاہتے ہیں کہ اپنے معاملات فیصلہ کے |
| أَنْ يَكْفُرُوا بِهِ وَيُرِيدُ | لیے طاغوت کے پاس لے جائیں، |
| الشَّيْطَانُ أَنْ يُضِلَّهُمْ ضَلَالًا | حالانکہ ان کو حکم دیا گیا ہے کہ اس کا |
| بَعِيدًا ه وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ | انکار کریں اور شیطان چاہتا ہے کہ ان |
| تَعَالَوْا إِلَى مَا أَنْزَلَ | کو بالکل گمراہ کر ڈالے اور جب ان |
| اللَّهُ وَإِلَى الرَّسُولِ | سے کہا جاتا ہے اس چیز کی طرف آؤ |
| رَأَيْتَ الْمُنَافِقِينَ يَصُدُّونَ | جو اللہ نے اتاری ہے اور رسول کی |
| عَنْكَ صُدُودًا۔ | طرف آؤ تو تم دیکھتے ہو منافقوں کو کہ |
| (النسا۔ ۶۰۔۶۱) | تم سے اعراض کرتے ہیں۔ |

اس سے اوپر والی آیت میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ اللہ، رسول اور اپنی جماعت کے اولوالامر کی اطاعت کرو اور اگر کسی امر میں اختلاف واقع ہو تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف رجوع کرو۔ اس کے بعد منافقین کا حال بیان فرمایا ہے کہ یہ لوگ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانے کے مدعی ہونے کے باوجود چاہتے ہیں کہ اپنے معاملات کا فیصلہ طاغوت سے کرائیں، اللہ اور اس کے رسول کی عدالت میں نہ لائیں۔

اوپر ہم لفظ طاغوت کے مفہوم پر بحث کر چکے ہیں۔ اس آیت میں طاغوت کے بالمقابل تَعَالَوْا إِلَى مَا أَنْزَلَ اللَّهُ وَإِلَى الرَّسُولِ (آؤ اس چیز کی طرف جو اللہ نے اتاری ہے اور رسول کی طرف) کے الفاظ آئے ہیں جس سے یہ بات صاف ہو گئی ہے کہ طاغوت سے مراد وہ حکام ہیں جن کے فیصلے کتاب الٰہی اور رسول کے فیصلے کے خلاف ہوتے ہیں اور آیات کے سیاق و سباق سے واضح ہے کہ یہاں اس

سے مراد اہل کتاب کے حکام اور ان کی عدالتیں ہیں۔ یہ اس عہد کا حال بیان ہوا ہے جب مدینہ میں بالفعل دارالاسلام قائم ہو چکا تھا اور مسلمانوں کے تمام معاملات از قسم حدود و تعزیرات خود آنحضرت صلعم کی عدالت میں پیش ہو کر طے پانے اور نافذ ہونے لگے تھے لیکن ساتھ ہی ایک متوازی حکومت (PARALLEL STATE) یہود کی پہلے سے قائم اور ہنوز موجود تھی۔ اس نظام کی موجودگی کی وجہ سے ایک بڑی پیچیدگی یہ پیدا ہو رہی تھی کہ منافقین اپنے بہت سے نزاعی امور میں ان یہودی عدالتوں کی طرف رجوع کرتے تھے۔ ان کے ایسا کرنے کی دو بڑی وجہیں تھیں۔ ایک یہ کہ یہود کے حکام کو رشوتیں دے کر ان سے اپنے موافق فیصلے کرا لینا نہایت آسان تھا اور آنحضرت صلعم کی عدالت میں اس چیز کا کوئی امکان نہیں تھا۔ دوسری یہ کہ منافقین کو یہ ڈر لگا ہوا تھا کہ ابھی مدینہ کی اسلامی حکومت بالکل ابتدائی حالت میں ہے۔ ہر چند قریش کی طاقت اس نے توڑ دی ہے لیکن یہود کی منظم جماعت سے اس کی ٹکر ابھی براہ راست نہیں ہوئی ہے۔ ممکن ہے کل کو یہ تصادم واقع ہو اور جیت یہود ہی کی رہے تو تھوڑا بہت لگاؤ جو ان کے ساتھ قائم رہے گا وہ کل کام آئے گا ورنہ یہ یہودی مسلمانوں اور اسلام کے ساتھ ہمارا بھی خاتمہ کر دیں گے۔ اس ظن فاسد کی وجہ سے یہ لوگ اپنے معاملات زیادہ تر انہی کی عدالتوں میں لے جاتے۔ البتہ اگر کوئی معاملہ ایسا ہوتا جس میں وہ سمجھتے کہ اسلامی عدالت کا فیصلہ کرانا مفید رہے گا تو نہایت فرمانبردارانہ آنحضرت صلعم کی خدمت میں حاضر ہوتے۔

دوسری طرف یہود یہ شرارت کرتے تھے کہ تعزیرات و حدود کے اہم معاملات میں، جن میں کسی ذاتی یا سیاسی مصلحت کی وجہ سے اپنی شریعت کے مطابق فیصلہ نہ کرنا چاہتے، فریقین معاملہ کو یہ مشورہ دیتے کہ اس کو آنحضرت صلعم کی عدالت میں لے جائیں اور ساتھ ہی ان کو یہ ہدایت بھی کر دیتے کہ محمد (صلعم) یہ فیصلہ کریں تو

مان لینا اور اگر کچھ اور فیصلہ کریں تو ہمارے پاس لوٹ آنا۔ اس طرح کے معاملات عموماً دولت مند یہودیوں کے ہوتے تھے جن سے بھاری بھاری رشوتیں لے کر علماء یہود شریعت الٰہی کی تنفیذ سے بچنے کی یہ شکل اختیار کرتے تھے۔ اگر آنحضرت صلعم کی عدالت میں فیصلہ حسبِ منشا ہوتا تو مقصد حاصل اور ذمہ داری آنحضرت صلعم کی ہوتی اور اگر فیصلہ خواہش کے خلاف ہوتا تو اس کو چھوڑ کر خود اپنی عدالت میں اپنے منشا کے مطابق فیصلہ کرتے۔

مذکورہ بالا آیت اور اس کی مشابہ آیات کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے کے لیے اس شان نزول کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔

ان منافقین کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ تحاکم الی الطاغوت یعنی غیر اسلامی عدالتوں میں اپنا معاملہ لے جانا اور پھر قرآن اور اللہ پر ایمان کا دعویٰ کرنا دو متناقض چیزیں ہیں۔ ایمان باللہ سے پہلے کفر بالطاغوت ضروری ہے اور الا اللہ کے اثبات سے پہلے لا الہ کی نفی ناگزیر ہے (فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ)[1] دوسری جگہ ہے (اُعبدوا الله واجتنبوا الطاغوت)[2] ایمان باللہ اور ایمان بالطاغوت دونوں ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتے۔ یہود کی عدالتوں میں اگر اپنے معاملات لے جاتے ہو تو تمہارا ایمان بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ کا دعویٰ ایک زعم باطل ہے۔ ایمان بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ کا لازمی اقتضاء یہ ہے کہ تمام معاملات میں اللہ ہی کی اطاعت کی جائے اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ انبیاء کے راستہ کی پیروی کی جائے اگر ایسا نہیں ہے تو نہ یہ ایمان باللہ ہوا نہ ایمان بما انزل اللہ ہوا نہ ایمان بالرسول ہوا۔ رسول صرف اس لیے نہیں ہوتا کہ اعتقاد کی حد تک یہ تسلیم کر لیا جائے کہ وہ رسول ہے بلکہ وہ اطاعت کے لیے

---

[1] پس جو کفر کرے طاغوت کا اور ایمان لائے اللہ پر۔

[2] اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت سے بچو۔

ہوتا ہے اور خدا کی اطاعت کی راہ اس کی اطاعت کے اندر ہی سے ہو کر نکلی ہے۔
چنانچہ بعد کی آیات میں فرمایا۔

| | |
|---|---|
| فَكَيْفَ إِذَا أَصَابَتْهُمْ | پس کیا ہوگا جب پہنچے گی ان کو کوئی |
| مُصِيبَةٌ بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ | مصیبت ان کے عمل کے بدلہ میں پھر وہ |
| ثُمَّ جَاءُوكَ يَحْلِفُونَ | آئیں گے تمہارے پاس قسم کھاتے ہوئے |
| بِاللَّهِ إِنْ أَرَدْنَا إِلَّا إِحْسَانًا | کہ خدا کی قسم ہم نے تو بہتری اور موافقت |
| وَتَوْفِيقًا أُولَٰئِكَ | چاہی تھی۔ ان لوگوں کے دلوں میں جو |
| الَّذِينَ يَعْلَمُ اللَّهُ مَا فِي | کچھ ہے اللہ اس کو خوب جانتا ہے۔ |
| قُلُوبِهِمْ فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ | پس ان سے منہ پھیر لو ان کو زجر کرو۔ |
| وَعِظْهُمْ وَقُلْ لَهُمْ فِي | اور ان سے ان کے بارہ میں وہ بات |
| أَنْفُسِهِمْ قَوْلًا بَلِيغًا وَ | کہو جو ان کے دل میں دھنسے۔ ہم نے |
| مَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَسُولٍ | نہیں بھیجا کوئی رسول مگر اس لیے کہ اس |
| إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللَّهِ | کی اطاعت کی جائے اللہ کے حکم سے |
| وَلَوْ أَنَّهُمْ إِذْ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ | ۔ اگر وہ، جبکہ انھوں نے اپنے اوپر |
| جَاءُوكَ فَاسْتَغْفَرُوا | ظلم کیا، تمھارے پاس آتے، اللہ سے |
| اللَّهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُولُ | مغفرت مانگتے اور رسول ان کے لیے |
| لَوَجَدُوا اللَّهَ تَوَّابًا | استغفار کرتا تو وہ اللہ کو توبہ قبول کرنے |
| رَحِيمًا فَلَا وَرَبِّكَ لَا | والا اور رحم کرنے والا پاتے۔ پس نہیں، |
| يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ | تیرے رب کی قسم وہ مومن نہیں ہیں جب |
| فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا | تک کہ وہ ان امور میں جو ان کے درمیان |
| يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا | پیدا ہوں تم ہی کو حکم نہ بنائیں۔ پھر اپنے |

مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا۔ دلوں میں تیرے فیصلہ کی وجہ سے کوئی تنگی
(النساء۔ ۶۲ - ۶۵) بھی نہ پائیں اور پوری اطاعت نہ کریں۔

مذکورہ بالا آیات میں وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰہِ۔ (اور ہم نے نہیں بھیجا کوئی رسول مگر اس لیے کہ اس کی اطاعت کی جائے اللہ کے حکم سے) خصوصیت کے ساتھ قابلِ غور ہے۔ یہ منافقین کے اس زعمِ باطل کی تردید ہے کہ وہ تحاکم الی الطاغوت کے باوجود اپنے تئیں مومن باللہ و مومن بالرسول سمجھتے ہیں۔ رسول صرف اس لیے نہیں آیا کرتا کہ زبان سے اس کی رسالت کا اقرار کر لیا جائے یا دل میں یہ عقیدہ رکھ لیا جائے کہ وہ اللہ کا رسول ہے بلکہ اس لیے آتا ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے۔ جملہ امور میں اس کو حَکَم مانا جائے۔ اس کے احکام کی بے چون و چرا تعمیل کی جائے۔ اپنے تئیں بالکلیہ اس کے حوالہ کر دیا جائے۔ اور جو لوگ اس کے بتائے ہوئے راستہ سے الگ ہیں ان سے لغاوت کی جائے۔ چنانچہ اس آیت میں قسم کھا کر فرمایا کہ جب تک یہ لوگ اپنے تمام معاملات میں رسول کی حکومت تسلیم نہ کرلیں، اس کے فیصلوں کو دل کی پوری رضامندی کے ساتھ نہ مانیں اور اپنی زندگی کے تمام گوشوں میں اس کے امر و نہی کے تابع نہ ہو جائیں اس وقت تک یہ مومن باللہ نہیں ہیں، مومن بالطاغوت ہیں۔

اوپر ہم نے جو باتیں بیان کی ہیں ممکن ہے اس کے بارہ میں کسی کو شبہ ہو کہ آیات کا شانِ نزول (پس منظر) متعین کرنے میں ہم نے محض اپنے تخیل سے کام لیا ہے۔ ان کے اطمینان کے لیے ہم ان کو مائدہ کی آیات ۴۱ - ۵۰ کا حوالہ دیتے ہیں۔ جو لوگ ان آیتوں پر تدبر کریں گے وہ ان ساری باتوں کا ماخذ خود قرآن میں پا جائیں گے، جو ہم نے بیان کی ہیں۔ ان آیات کا مطلب اختصار کے ساتھ ہم اپنے لفظوں میں یہاں بیان بھی کیے دیتے ہیں تاکہ مراجعت میں آسانی ہو۔

پہلے رسول کو تسلی دی ہے کہ منافقین اور یہود آپ سے معاملات کا فیصلہ کرانے کے بعد جو اس سے اعراض کرتے ہیں تو اس سے غمگین نہیں ہونا چاہیے یہ یہودی اپنے معاملات کبھی کبھی آپ کے پاس جو لاتے ہیں تو یہ جھگڑا چکانے اور مقدمے کا فیصلہ کرانے کے لیے نہیں لاتے بلکہ یہ جھوٹ کے خریدار اور سرداران یہود کے ایجنٹ ہیں۔ وہ سامنے نہیں آتے بلکہ پیچھے بیٹھے ہوئے ان کٹھ پتلیوں کو نچاتے ہیں اور اللہ کے دین میں کتر بیونت کرتے ہیں اور آپ کے پاس ان کو یہ سکھا کر بھیجتے ہیں کہ اگر تمھارے معاملہ کا یہ فیصلہ ہو تو مان لینا اور اگر اس کے خلاف فیصلہ ہو تو واپس چلے آنا۔ ایسے لوگوں کی حالت پر غم کرنا عبث ہے اللہ تعالیٰ کو منظور نہیں ہے کہ ان کے دلوں کو پاک کرے ورنہ توریت کی ہدایت کے مطابق یہ لوگ آپ پر ایمان لاتے اور کفر کے بجائے ایمان و اطاعت الٰہی کی طرف سبقت کرتے۔ ان کے لیے دنیا میں رسوائی اور آخرت میں عذاب عظیم ہے۔ یہ جھوٹ کے ماننے والے اور رشوت کھانے والے ہیں۔ اگر آپ کے پاس یہ اپنا معاملہ لائیں تو آپ کو اختیار ہے کہ ان کے معاملہ میں پڑیے یا نہ پڑیے۔ ہاں اگر پڑیے تو لازم ہے کہ اللہ کی شریعت کے مطابق فیصلہ کیجیے۔"

"اس کے بعد چند آیتوں میں یہود کو ملامت کی ہے کہ یہ کس قسم کے لوگ ہیں کہ آپ کو حَکَم بناتے ہیں پھر آپ کے فیصلہ سے مکر جاتے ہیں۔ حالانکہ ان کے پاس توریت موجود ہے جس میں اللہ کا قانون موجود ہے اور انھیں معلوم ہے کہ آپ کا فیصلہ قانون الٰہی کے خلاف نہیں ہے۔ پھر گزشتہ انبیاء اور علماء صالحین کا طریقہ بتایا کہ وہ اس کتاب کے مطابق تمام معاملات کے فیصلے کرتے تھے۔ پھر فرمایا کہ ان کو یہ ہدایت کی گئی ہے کہ دین کے معاملہ میں کسی قسم کی مداہنت اور خیانت کو راہ نہ دیں گے اور شریعت کو کسب دنیا

کا ذریعہ نہ بنائیں گے بلکہ ہر حال میں کتاب الٰہی کے مطابق فیصلہ کریں گے اور اگر اس کی خلاف ورزی کریں گے تو کافر ہوں گے۔ اس کے بعد توریت کے قانون قصاص کا حوالہ دیا ہے، کیونکہ یہود کی اصلی مداہنت حدود اور قصاص وغیرہ کے معاملات ہی میں تھی۔ اس کے بعد اہلِ انجیل کا ذکر فرمایا کہ ان کو بھی ہدایت کی گئی تھی کہ شریعتِ الٰہی کے مطابق فیصلے کریں گے اور اگر اس کے خلاف کریں گے تو فاسق ٹھہریں گے۔"

"پھر قرآن کا ذکر فرمایا کہ یہ کتاب توریت وانجیل کی پیشین گوئیوں کے مطابق اور ان کی تحریفات اور ملاوٹوں کی اصلاح کرنے والی ہے۔ پس آپ کا فرض ہے کہ اگر ان کے کسی معاملہ کا فیصلہ کرنا ہو تو اس کے مطابق کیجیے اور ان کی بدعات کی جو انھوں نے اپنی کتابوں میں ملا رکھی ہیں، ہرگز پیروی نہ کیجیے۔ ان کے ایمان و ہدایت کا سوال آپ سے نہ ہوگا۔ ان کا اپنا جو طریقہ ہے اسی پر جامد ہو گئے ہیں اور اس کی عصبیت میں ایسے اندھے ہو گئے ہیں کہ آپ کی پیروی نہیں کریں گے۔ اگر اللہ چاہتا تو ان کو ہدایت کے راستہ پر کر دیتا لیکن جبر کرنا اس کی سنت کے خلاف ہے۔ اس نے اختیار بخشا ہے اور جس کو جو کچھ دیا ہے اس میں اس کی آزمائش کی ہے کہ دیکھے کون نیکی اور اطاعت کی راہوں میں بڑھتا ہے اور کون عصبیت جاہلیت کی حماقت میں مبتلا ہو کر اپنے طریقے اور دھڑے ہی کو معبود بنا لیتا ہے۔"

"اس کے بعد مسلمانوں کی طرف توجہ فرمائی اور خطاب اگرچہ عام ہے لیکن روئے سخن ان منافقین ہی کی طرف ہے جو یہود سے ساز باز رکھتے تھے اور اپنے معاملات ان کی عدالتوں میں لے جاتے تھے۔ ان کو یہود و نصاریٰ

سے قطع تعلق کا ایک حکم دیا اور فرمایا کہ جو لوگ ان کو اپنا مددگار بنائیں گے
ان کا شمار انہی میں ہوگا۔ پھر صاف صاف لفظوں میں منافقین کا ذکر فرمایا کہ
ان کو اندیشہ ہے کہ اگر یہود اور مسلمانوں میں ٹکر ہوئی اور یہود فتح مند رہے
تو یہ پس جائیں گے۔ اس لیے یہ اپنے معاملات ان کی عدالتوں میں لے
جاتے ہیں تاکہ ان کی پارٹی میں سمجھے جائیں۔ پھر فرمایا کہ اے مسلمانو جو تم میں
سے اپنے دین سے مرتد ہو جائیں گے تو اللہ کو ان کی کچھ پروا نہیں۔ اللہ اس
کے بعد ایسے لوگوں کو لائے گا جن سے وہ محبت کرے گا اور وہ اس سے
محبت کریں گے۔ وہ مومنوں کے لیے نرم خو اور بردبار ہوں گے اور کافروں کے
لیے سخت ہوں گے، اللہ کی راہ میں جہاد کریں گے اور کسی کی ملامت کی پروا
نہیں کریں گے۔"

یہ ساری تفصیل ہم نے محض یہود کی اس وقت کی سیاست اور ان کے ساتھ منافقین کے تعلقات کی نوعیت سمجھانے کے لیے بیان کی ہے تاکہ تحاکم الی الطاغوت کا صحیح تصور ذہنوں کے سامنے آسکے اور یہ واضح ہو سکے کہ منافقین اس سے کیا فوائد پیش نظر رکھتے تھے اور پھر یہ معلوم ہو سکے کہ کس طرح یہ ایک ہی چیز دین کے تمام اقرارات و اعترافات کو ڈھا دینے والی اور تمام عبادتوں اور طاعتوں کو سوخت کر دینے والی ہے۔ یہاں تک کہ قرآن نے نہایت صاف لفظوں میں اس کو دین سے ارتداد قرار دیا ہے اور اعلان فرمایا ہے کہ خدا کو ایسے پلپلے، ایسے مریض القلوب اور ایسے بزدل اور نفع پرست لوگوں کی ضرورت نہیں ہے جو یہود کے ہاتھوں میں کٹھ پتلیوں کی طرح ناچیں۔ اس کو صرف ایسے لوگوں سے محبت ہے جو اپنی سیرت میں چٹان کی طرح ٹھوس اور اپنے عزم و ارادہ میں لوہے کی طرح مضبوط ہوں جو اسلام میں مصلحت پرستی اور نفع پرستی کے بت توڑ کر داخل ہوئے ہوں اور

بغیر کسی تقسیم کے اپنی پوری زندگی اللہ کے حوالہ کریں (اُدْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَافَّۃً) جو لوگ صرف فوائد کی حد تک خدا کے پرستار رہنا چاہتے ہیں وہ اپنے لیے جو دین چاہیں پسند کرلیں۔ اللہ اور اس کے دین کو ان کی ضرورت نہیں ہے۔ (ومن الناس من یعبد اللہ علی حرف فان اصابہ خیر اطمأن بہ وان اصابتہ فتنۃ انقلب علی وجھہ۔)[1]

توضیح مطلب اور شرح صدر کے لیے سورۂ نور کی یہ آیتیں بھی سامنے رکھیے۔

| | |
|---|---|
| وَیَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِاللّٰہِ وَبِالرَّسُوْلِ | اور وہ کہتے ہیں کہ ہم اللہ پر ایمان |
| وَاَطَعْنَا ثُمَّ یَتَوَلّٰی فَرِیْقٌ | لائے اور رسول پر اور ہم نے اطاعت |
| مِّنْھُمْ مِّنْ بَعْدِ ذٰلِکَ وَمَآ | کی، پھر ایک فریق اس عہد کے بعد |
| اُولٰٓئِکَ بِالْمُؤْمِنِیْنَ وَ | پھر جاتا ہے اور یہ لوگ مومن نہیں ہیں |
| اِذَا دُعُوْٓا اِلَی اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ | اور جب اللہ اور اس کے رسول کی |
| لِیَحْکُمَ بَیْنَھُمْ اِذَا فَرِیْقٌ | طرف بلائے جاتے ہیں تاکہ ان کے درمیان |
| مِّنْھُمْ مُّعْرِضُوْنَ وَاِنْ یَّکُنْ | معاملات کا فیصلہ کرے، تو ان میں |
| لَّھُمُ الْحَقُّ یَاْتُوْٓا اِلَیْہِ | سے ایک فریق جھٹ منہ پھیر لیتا |
| مُذْعِنِیْنَ اَفِیْ قُلُوْبِھِمْ مَّرَضٌ | ہے اور اگر حق انھیں کو ملنے والا ہو |
| اَمِ ارْتَابُوْٓا اَمْ یَخَافُوْنَ | تو بڑی رغبت سے آتے ہیں۔ ان |
| اَنْ یَّحِیْفَ اللّٰہُ عَلَیْھِمْ وَ | کے دلوں میں بیماری ہے یا وہ شک |
| رَسُوْلُہٗ بَلْ اُولٰٓئِکَ ھُمُ | میں پڑے ہیں یا ڈرتے ہیں کہ اللہ اور |

---

[1] اور لوگوں میں سے کچھ ایسے ہیں جو اللہ کی بندگی ایک کنارے پر کھڑے ہو کر کرتے ہیں۔ اگر ان کو بھلائی پہنچتی ہے تو اس پر مطمئن رہتے ہیں اور اگر کوئی آزمائش پہنچتی ہے تو اُلٹے پھر جاتے ہیں۔

الظّٰلِمُوْنَ اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ
الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ
وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ
اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا
وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝
وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ
وَيَخْشَ اللّٰهَ وَيَتَّقْهِ فَاُولٰٓئِكَ
هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ۝ وَاَقْسَمُوْا
بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ
اَمَرْتَهُمْ لَيَخْرُجُنَّ قُلْ لَّا
تُقْسِمُوْا طَاعَةٌ مَّعْرُوْفَةٌ ط
اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝
قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا
الرَّسُوْلَ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا
عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيْكُمْ
مَّا حُمِّلْتُمْ وَاِنْ تُطِيْعُوْهُ
تَهْتَدُوْا وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ
اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ۝ وَعَدَ
اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ
عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِى الْاَرْضِ

اس کا رسول ان کے معاملہ میں
ناانصافی کریں گے بلکہ یہی لوگ اپنے
اوپر ظلم کرنے والے ہیں۔ اہل ایمان
کا قول تو جب اللہ اور اس کے رسول
کی طرف بلائے جاتے ہیں، یہ ہوتا ہے
کہ ہم نے سنا اور مانا اور یہی لوگ فلاح
پانے والے ہیں اور جو اللہ اور اس
کے رسول کی اطاعت کریں اور اللہ
سے ڈریں اور بچیں وہی لوگ کامیاب
ہیں۔ اور اللہ کی پکی قسمیں کھاتے ہیں
کہ اگر تم ان کو حکم دو گے جہاد کا تو وہ
ضرور نکلیں گے۔ کہہ دو قسم مت کھاؤ
اور دستور کے مطابق اطاعت مطلوب
ہے۔ اللہ تمہارے عمل کی خبر رکھنے والا
ہے، کہہ دو خدا اور رسول کی اطاعت
کرو، پس اگر وہ اعراض کریں تو اس
پر (نبی پر) اس کی ذمہ داری (یعنی
تبلیغ) ہے اور تم پر تمہاری ذمہ داری
ہے (یعنی ایمان و اطاعت) اور اگر
تم اطاعت کرو گے تو راہ یاب ہو گے
اور رسول پر صرف کھلے طور پر پہنچا

| | |
|---|---|
| كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ | دینے کی ذمہ داری ہے۔ تم میں سے جو |
| مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ | لوگ ایمان لائے اور بھلے کام کیے ان |
| لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي | سے اللہ نے وعدہ کیا ہے کہ ان کو زمین |
| ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ | میں خلیفہ بنائے گا جس طرح کہ ان کے اگلوں |
| مِنْ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا | کو خلیفہ بنایا تھا اور ان کے لیے اس دین |
| يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ | کو جو ان کے لیے پسندیدہ ٹھہرایا ہے |
| بِيْ شَيْئًا وَمَنْ كَفَرَ | محکم کرے گا اور ان کی خوف کی حالت کو |
| بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ | امن سے بدل دے گا وہ میری بندگی |
| هُمُ الْفَاسِقُوْنَ۔ | کریں گے اور کسی کو میرا ساجھی نہیں |
| (نور۔ ۷۔۵۵) | ٹھہرائیں گے اور جو اس کے بعد کفر کریں گے |
| | تو وہی لوگ فاسق ٹھہریں گے۔ |

جن لوگوں نے ایمان کا مطلب صرف چند چیزوں پر اعتقادی ایمان سمجھ رکھا ہے ان کو ان آیات پر غور کرنا چاہیے۔ منافقین ان سب چیزوں پر ایمان رکھنے کے مدعی تھے لیکن قرآن نے ان کے اس اعتراف و اعتقاد کو تسلیم نہیں کیا بلکہ صاف صاف فرمایا کہ یہ لوگ مومن نہیں ہیں۔ یہ ایمان و اسلام کیسا کہ اپنے جملہ معاملات میں اللہ و رسول کی حکومت نہیں تسلیم کرتے۔ جب اپنا فائدہ ہوتا ہے تب تو رسول کے پاس دوڑے ہوئے آتے ہیں لیکن جب اندیشہ ہوتا ہے کہ رسول کے فیصلہ میں ان کا دنیوی خسارہ ہے تو یہود کی عدالت میں اپنا معاملہ لے جاتے ہیں کہ ان کی رشوت خوری اور مداہنت سے فائدہ اٹھائیں۔ ان کے دلوں میں نفاق کی بیماری ہے، یہ اسلام کے غلبہ کی طرف سے مشتبہ ہیں۔ انھیں اللہ اور رسول کے عدل پر بھروسہ نہیں ہے۔ پھر واضح الفاظ میں فرمایا کہ مومن صرف وہ لوگ ہیں جو اپنے تمام معاملات

اللہ ورسول کی عدالت میں پیش کریں اور یہاں سے جو فیصلہ ہو اس کو بے چون وچرا تسلیم کریں۔ آخری آیت کے الفاظ خصوصیت کے ساتھ غور کے قابل ہیں سچے مسلمانوں کو بشارت دی ہے کہ منافقین اسلام کے غلبہ کی طرف سے شبہ میں ہیں لیکن اللہ تعالےٰ ان کے علی الرغم اہلِ ایمان کو غلبہ دے گا۔ دینِ حق کا بول بالا کرے گا اور یہود اور مشرکین کی وجہ سے جو خوف و اندیشہ کی حالت ابھی قائم ہے اس کو جلد امن و اطمینان سے بدل دے گا اور ہمارے یہ خالص بندے صرف ہماری ہی بندگی کریں گے، کسی کو ہمارا شریک نہیں ٹھہرائیں گے۔

یہ منافقین پر تعریض ہے کہ یہ لوگ غیر اللہ کی بندگی کرتے اور اللہ کا ساجھی ٹھہراتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ تعریض محض اس وجہ سے ہے کہ وہ اپنے معاملات یہود کی عدالتوں میں لے جاتے ہیں۔ جو لوگ عبادت کے مفہوم میں اطاعت کو داخل نہیں سمجھتے اور خیال کرتے ہیں کہ اگر نمازیں پڑھی جاتی ہیں اور روزے رکھے جاتے ہیں تو اطاعت خواہ کسی طاغوت کی ہو رہی ہو اس سے خدا کی عبادت میں کوئی فرق نہیں پیدا ہوتا انھیں اس آیت پر غور کرنا چاہیے۔ اگر غیر اللہ کی اطاعت سے اللہ کی عبادت میں کوئی فرق نہیں آتا تو آخر ان منافقین کا کیا جرم تھا کہ ان کو مشرک اور غیر اللہ کی بندگی کرنے والا قرار دیا گیا۔

یہ مسئلہ چونکہ نہایت اہم ہے اور قرآن سے غفلت کی وجہ سے لوگ اس بارہ میں ایسی غلط فہمیوں میں پڑ گئے ہیں جو سرے سے دین کی بنیاد ہی ڈھلئے دے رہی ہیں اس لیے مزید توضیح کی خاطر ایک آیت ہم اور پیش کرتے ہیں۔ سورۂ نساء میں فرمایا ہے۔

| | |
|---|---|
| وَمَنْ يُشَاقِقِ الرَّسُولَ | اور جو شخص رسول کی مخالفت کرے |
| مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ | بعد اس کے کہ اس پر اللہ کی ہدایت |
| الْهُدَىٰ وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ | واضح ہو چکی ہے اور پیروی کرے مسلمانوں کی |

| | |
|---|---|
| الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَ | راہ کے سوا دوسری راہ کی ہم اس کو پھیر |
| نُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا | دیں گے اسی چیز کی طرف، جدھر وہ متوجہ ہوا |
| اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ | اور داخل کریں گے جہنم میں اور وہ برا ٹھکانا |
| بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ | ہے۔ بیشک اللہ نہیں معاف کرتا اس بات |
| ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَمَنْ | کو کہ اس کا ساجھی ٹھہرایا جائے اور جو کچھ |
| يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ | اس کے سوا ہے اس کو جس کے لیے چاہے گا |
| ضَلٰلًا بَعِيْدًا۔ | بخش دے گا اور جو اللہ کا شریک بنائے گا |
| (النساء - ۱۱۵-۱۱۶) | وہ بہت دور بھٹک گیا۔ |

اس آیت سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ رسول کے بتائے ہوئے طریقہ کی مخالفت کرنا اور مومنوں کی راہ چھوڑ کر کوئی دوسری راہ اختیار کرنا شرک ہے اور اس کی سزا جہنم ہے اور جہنم برا ٹھکانا ہے۔ ایک امر پر اس پہلو سے تو گفتگو ہو سکتی ہے کہ یہ اللہ و رسول سے ثابت ہے یا نہیں۔ لیکن اگر اس کا اللہ و رسول کی بات ہونا متعین ہے تو اس پر سرگوشی کرنا، اس کو خلافِ حکمت قرار دینا، اس کو روحِ زمانہ کے خلاف کہنا اور اس کو چھوڑ کر اپنے جی سے یا دوسروں کی تقلید میں کوئی اور راہ اختیار کر لینا شرک ہے اور اللہ شرک کو معاف نہیں فرمائے گا۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ (الآیہ) والی آیت ایک ہی سورہ میں دو جگہ وارد ہے۔ ایک جگہ اہل کتاب کے شرک کے بیان میں ہے جس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے اور یہ دوسری جگہ منافقین کے شرک کے بیان کے سلسلہ میں ہے اور ایک صاحبِ نظر اگر ان دونوں مقامات پر غور کرے تو اسے نہایت آسانی سے قدرِ مشترک مل جائے گا۔ اہل کتاب کے بیان کے سلسلہ میں جہاں یہ آیت وارد ہے وہاں ان کے تین شرک بیان ہوئے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ اللہ کی ہدایت پر اپنی قوم کی ہدایت کو ترجیح دیتے ہیں۔ دوسرا یہ کہ وہ اللہ کی

کتاب پر جبت وطاغوت کی پیروی کو ترجیح دیتے ہیں۔ اور تیسرا یہ کہ اہل ایمان کے طریقہ پر اہل مکہ کے طریقہ کو ترجیح دیتے ہیں اور یہاں اس آیت سے اوپر والی آیت میں یہ تمہید ہے۔ لَا خَيْرَ فِي كَثِيرٍ مِّن نَّجْوَاهُمْ إِلَّا مَنْ أَمَرَ بِصَدَقَةٍ أَوْ مَعْرُوفٍ أَوْ إِصْلَاحٍ بَيْنَ النَّاسِ یعنی یہ منافقین پیغمبر صلعم کی ذات، آپ کے احکام اور آپ کی تعلیمات کے خلاف جو سرگوشیاں کرتے ہیں ان میں کوئی بھلائی نہیں ہے۔ خیر صرف اس سرگوشی میں ہے جو ترغیب صدقہ، امر بالمعروف اور لوگوں کی اصلاح کی راہ میں ہو۔ باقی جو لوگ خدا اور اس کے رسول کے حکم پر اپنی رائے کو ترجیح دیتے ہیں تو وہ اپنی خدائی کے مدعی ہیں اور اگر کسی دوسرے کی رائے اور مذہب کو ترجیح دیتے ہیں تو اس کو الٰہ قرار دیتے ہیں اور ان دونوں ہی صورتوں میں وہ مشرک ہیں۔ موحد نہیں ہو سکتے۔

---

# ۴۔ پچھلی فصلوں کا خلاصہ

اس تمام درازنفسی اور طول بیان سے مقصود محض یہ دکھانا تھا کہ لاالٰہ کی نفی اور الا اللہ کا اثبات زبان سے ادا کرنے کے لیے تو نہایت سہل اور مختصر ہے لیکن ان کے مقتضیات و لوازم کا مظاہرہ جب عملی زندگی میں ہوتا ہے تو انسان کی زندگی کا کوئی گوشہ ان کے دائرہ سے باہر نہیں رہ جاتا۔

یہ حقیقت پچھلی تین فصلوں میں ایک موزوں تدریج کے ساتھ واضح ہوگئی ہے۔ اہل مکہ خدا کی ہستی اور اس کی تمام بنیادی صفات کے معترف تھے لیکن قرآن نے ان کے اس اعتراف کو کوئی وقعت نہیں دی۔ اہل کتاب نے ان سے بہت آگے بڑھ کر نہ صرف توحید کا بلکہ اس کی کتابوں کا، اس کے ملائکہ کا اور اس کے رسولوں کا بھی اقرار کیا لیکن قرآن کی میزان میں ان کا اقرار بھی بالکل بے وزن ٹھہرا۔ سب سے آخر میں منافقین آئے اور انھوں نے خیال کیا کہ توحید کے مقتضیات و لوازم میں سے کوئی بات ایسی نہیں رہ گئی ہے جو انھوں نے پوری نہ کر دی ہو اور شرک کی آلائشوں کا کوئی دھبہ ایسا نہیں رہ گیا ہے جس کو انھوں نے دھو نہ ڈالا ہو لیکن قرآن نے ان کے اندر سے بھی شرک کا کھوٹ نکال کر ان کے سامنے رکھ دیا اور ہر گروہ کو مطلع کر دیا کہ تم میں سے کوئی بھی خدا کا مخلص اور موحد نہیں ہے۔ ہر ایک نے اپنی بندگی میں دوسروں کو ساجھی بنا رکھا ہے اور اللہ کی نظر میں اس بندگی کی کوئی قیمت نہیں ہے جس میں شرک کی ملاوٹ ہو۔

اب ان تینوں گروہوں کی فرد قرارداد جرم ملاحظہ ہو۔

بنی اسماعیل سے کہا گیا:۔

تم فرشتوں کو مرتبۂ بندگی سے مافوق سمجھتے ہو۔ ان کو خدا کی بیٹیاں قرار دیتے ہو۔ ان کی پوجا کرتے ہو۔ اس پوجا کو تقرب الٰہی کا ذریعہ سمجھتے ہو۔ مال و اولاد اور دنیا کی خوشحالی و فارغ البالی کو ان کی برکت کا ثمرہ قرار دیتے ہو۔ خدا کے ہاں ان کی شفاعت بہرحال موجب نجات خیال کرتے ہو۔ ان سے خدا کی طرح محبت کرتے ہو۔ ان کو عالم الغیب مانتے ہو۔

اسی طرح جنات کو خدا کا کفو سمجھتے ہو۔ ان کو خدائی مفہوم میں نافع و ضار خیال کرتے ہو۔ ان کی دہائی دیتے ہو۔ ان کی رضا طلبی کے لیے اپنی اولاد کو قتل کرتے ہو۔ ان کی رسائی ملاء اعلیٰ تک مانتے ہو۔ ان کو علم غیب کا وسیلہ جانتے ہو۔ ان کی بندگی کرتے ہو۔ ان سے الہام حاصل کرنے کے لیے مراقبہ کرتے ہو۔

کواکب کو تدبیر عالم میں موثر بالذات مانتے ہو۔ بارش کو نکھتروں کا فیض سمجھتے ہو۔ اپنی تمام کاروباری چہل پہل کو شعریٰ کی برکت سمجھتے ہو۔

تم نے اپنے ان معبودوں کی ایک بزم بنائی ہے۔ اس میں خدا کی حیثیت بس ایک مہادیو کی ہے جس کا تعلق محض اس کے دار السلطنت آسمان سے ہے۔

زمین اس کی مملکت کا ایک دور دراز علاقہ ہے جس کا انتظام وہ اپنے عمال کو سپرد کر کے خود اس سے کنارہ کش ہے۔ تم ان معبودوں کی عبادت کرتے ہو۔ تم نے ان کے لیے معبد اور استھان بنائے ہیں۔ تم ان کے حج و زیارت کے لیے سفر کرتے ہو۔ ان کے لیے قربانیاں کرتے ہو۔ نذریں اور چڑھاوے پیش کرتے ہو۔ ان کے نام پر جانور چھوڑتے ہو۔ ان کے تعلق سے بہت سی چیزیں حرام و حلال کرتے ہو۔ ان کے حضور میں حاضر ہو کر، فال کے تیروں سے، ان کی مرضی معلوم کرتے ہو ان کی قسمیں کھاتے ہو۔

تم نے اپنے بزرگوں کی قبروں اور ان کے آثار کو معبد بنا لیا ہے۔ تم ان کو

وسیلۂ شفاعت اور ان کی عبادت کو ذریعہ تقرب الٰہی سمجھتے ہو۔ اس کی رسموں کو دین و شرع قرار دیتے ہو۔

پھر تم خود بھی الٰہ بن بیٹھے ہو۔ تم اللہ کی ہدایت کی جگہ اپنے نفس کی خواہش یا دوسروں کے قانون کی پیروی کرتے ہو۔ تم نے باپ دادا کے طریقوں اور رسوم رواج کو شریعت بنا رکھا ہے اور اس طرح سوسائٹی اور خاندان اور قبیلہ کو الٰہ بنائے بیٹھے ہو، اپنے جی سے قانون و شریعت بناتے ہو۔ تمہارے باپ ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام کے ذریعہ سے، اللہ تعالےٰ نے جو دین تمہیں دیا تھا اس میں تم نے اپنی بدعتیں ملا دی ہیں۔ تم خود اپنے شارع بن گئے ہو۔ تم اللہ کی بخشی ہوئی نعمتوں کو اپنے استحقاق ذاتی کا ثمرہ اور اپنے علم و ہنر کا نتیجہ سمجھتے ہو۔ تم کو اپنی برتری کا گھمنڈ ہے۔ تم کو ابراہیمؑ کی اولاد ہونے کا غرّہ ہے۔ تم سمجھتے ہو کہ تمہارا ہر کام بلا استناد شریعت اللہ کا کام ہے۔ یہ ساری باتیں شرک ہیں۔ خدا پرستی کے دعوے کے ساتھ ان کا کوئی جوڑ نہیں ہے۔

اہل کتاب سے قرآن نے کہا۔

تمہارا دعوائے توحید و خدا پرستی بھی باطل ہے۔ تم اپنے علما اور راہبوں کو قانون سازی اور تحریم و تحلیل کا اختیار دیتے ہو۔ یہ جو کچھ فرما دیں تمہارے نزدیک وہ قادر مطلق کے احکام ہیں۔ یہ زمین پر جو باندھیں وہ آسمان پر باندھا جاتا ہے اور زمین پر جو کھولیں وہ آسمان پر کھولا جاتا ہے۔ تم نے کتاب اور طریقۂ نبی سے اجتہاد کی جگہ کاہنوں کے اقوال کو دے رکھی ہے۔ یہود عزیر کو خدا کا بیٹا کہتے ہیں۔ نصاریٰ مسیح کو خدا کا بیٹا کہتے ہیں۔ ان کو خدا کا اوتار قرار دیتے ہیں۔ الوہیت کو تین حصوں میں تقسیم کرتے ہیں اور خدا کو اس تین کا تیسرا قرار دیتے ہیں۔

پھر تم اپنی برتری کے مدعی ہو۔ تمہیں ابراہیمؑ کی اولاد ہونے کا گھمنڈ ہے۔ تم

اسی نسبت کو خدا کے تقرب اور اس کے محبوب ہونے کے لیے کافی سمجھتے ہو اور خدا کی اطاعت سے نکل کر طاغوت بن بیٹھے ہو۔ تم نے کتاب الٰہی کے حامل ہونے کے باوجود جبابرہ کی بندگی اختیار کی اور طاغوتی نظام یا تو خود قائم کیے یا ظالموں کے قائم کردہ طاغوتی نظاموں کو قبول کیا۔ تم اپنے تئیں پاک اور برگزیدہ سمجھتے ہو اور خیال کرتے ہو کہ جو کچھ تم سے صادر ہو جائے وہ سب پاک و پاکیزہ اور اللہ اور دین کا کام ہو جاتا ہے، اس کا خدا کے حکموں کے مطابق ہونا ضروری نہیں۔ تم نے خدا کے نبیوں میں تقسیم کر رکھی ہے۔ ایک گروہ کو مانتے ہو۔ دوسری جماعت کا انکار کرتے ہو۔ اللہ کی ہدایت کی جگہ اپنی ہدایت، اپنے طریقے، اپنے انبیاء اور اپنی قوم کو مرکز ہدایت قرار دیتے ہو۔ مدعی ہو کہ تمھارے لیے ہمیشگی کا عذاب نہیں ہے، کچھ بھی کرو، تھوڑی سی سزا بھگت کر تقرب الٰہی کے مقام عالی پر سرفراز ہو جاؤ گے، تم سحر، شعبدہ، رمل، جفر اور علوم سفلیہ پر ایمان رکھتے ہو۔ تم ان لیڈروں اور کاہنوں پر ایمان رکھتے ہو جن کی باتیں اللہ کی ہدایت سے الگ ہیں اور جو شیطان کے پیرو اور خود طاغوت ہیں۔ تم شرک کے حامی ہو اور مشرکوں کے طریقہ کو اہل ایمان کے طریقہ پر ترجیح دیتے ہو۔ یہ ساری باتیں توحید اور اخلاص کے منافی ہیں۔

منافقین سے قرآن نے کہا۔

تمھارا دعویٰ توحید بھی باطل ہے۔ تم تحاکم الی الطاغوت کے مجرم ہو۔ تم اپنے معاملات ان کی عدالتوں میں لے جاتے ہو جو اللہ اور اس کے رسول کی ہدایت سے منحرف ہیں۔ تم رسول کو یا تو اعتقاداً واجب الاطاعت نہیں مانتے یا عملاً یا دونوں طرح، حالانکہ خدا کی اطاعت بغیر رسول کی اطاعت کے ممکن نہیں اور خدا کی عبادت کا دعویٰ بغیر اس کی اطاعت کے جھوٹا ہے۔ توحید کی لازمی شرط یہ ہے کہ اپنے تئیں بالکلیہ رسول کے حوالہ کر دو۔ اس کی پوری پوری اطاعت کرو۔ اپنے

سارے معاملات میں اسی کی طرف رجوع کرو اور اس کے فیصلوں کو بے چون وچرا مانو۔ تم اللہ اور اس کے رسول کی تعلیم پر نکتہ چینی کرتے ہو یا اپنے دلوں میں اس پر اعتراضات چھپائے ہوئے ہو اور اس کے متعلق شکوک و شبہات اور تذبذب و تردد رکھتے ہو۔ اللہ اور رسول نے اہل ایمان کے لیے جو طریقہ ٹھہرا دیا ہے اس سے انحراف کرتے ہو۔ رسول کی پیروی صرف اپنے فوائد دنیوی کی حد تک کرنا چاہتے ہو تم اپنے دنیوی مفاد اور اپنی شخصی دلچسپیوں اور اپنے خون کے رشتوں اور حلیفانہ روابط کو اللہ اور رسول اور اس کے دین سے عزیز تر رکھتے ہو۔ یہ ساری باتیں شرک ہیں اور اللہ تعالیٰ شرک کو کبھی معاف نہیں فرمائے گا۔

---

# ۵۔ موجودہ دُنیا کا سرسری جائزہ

اب ہمارے پاس وہ روشنی موجود ہے جس کو لے کر ہم دنیا کے جائزہ کے لیے نکل سکتے ہیں اور دیکھ سکتے ہیں کہ دنیا کی موجودہ قوموں بالخصوص "متمدن" قوموں کا شرک وبت پرستی کے اعتبار سے کیا حال ہے۔ لیکن اس رسالہ کی ہر فصل میں غایت درجہ اختصار ملحوظ ہے اس لیے ہم اولاً تو صرف سرسری اشارات پر کفایت کریں گے، ثانیاً ہر مذہب کے پیرووں کی صرف موجودہ حالت کو سامنے رکھیں گے، ان کے مذاہب کی اصل حقیقت سے بحث نہیں کریں گے۔ ثالثاً صرف ان قوموں سے تعرض کریں گے جو تمدنی اعتبار سے کچھ اہمیت رکھتی ہیں ورنہ یہ حکایت اتنی دراز ہو جائے گی کہ اس کو سمیٹنا مشکل ہو جائے گا۔

بحث کی آسانی کے لیے ہم پہلے مشرق اقصیٰ کی اقوام اور بدھ مذہب کے پیرؤوں کا جائزہ لیں گے۔ پھر ہندوستان کو دیکھیں گے۔ اس کے بعد ایک طرف مغربی یورپ اور امریکہ کا اور دوسری طرف روس کا جائزہ لیں گے تاکہ اندازہ ہو سکے کہ تہذیب جدید کے ان برقعوں کے اندر شرک کی کیسی گھنونی اور مکروہ شکلیں چھپی ہوئی ہیں اور علم وتحقیق کے مدعیوں کے اس دعوے کے باوجود کہ اب شرک دنیا سے ناپید ہو چکا ہے وہ کیسی حیرت انگیز وسعت کے ساتھ پورے کرۂ ارضی پر چھایا ہوا ہے۔

## مشرقِ اقصیٰ

مشرقِ اقصیٰ کی اقوام کا غالب حصّہ عموماً چار مذہبوں کا پیرو ہے۔ شنٹو مذہب،

تاوی مذہب ( TAOISM ) کنفیوشنزم اور بدھ مذہب۔

جاپان کا اصلی مذہب شنٹو مذہب ہے۔ ویسے تو جاپان کی سرزمین پانچ سو مذاہب کی سرزمین کہی جاتی ہے لیکن اس کا قدیم ترین اور جدید ترین مذہب شنٹو مذہب ہے۔ چھٹی صدی کے اواخر میں، کوریا کے راستے سے بُدھ مذہب بھی وہاں داخل ہو گیا تھا اور نویں صدی میں اس نے شنٹو مذہب کو بالکل ہی نگل لیا تھا لیکن سترھویں صدی میں جاپان میں قومیت کی جو زبردست تحریک اٹھی، اس نے ملک کے اس قدیم مذہب کو پھر زندہ کر دیا اور اس کے بعد سے اب یہی جاپان کا سرکاری اور قومی مذہب ہے۔

اس مذہب کا خاص اصول نیچر اور بزرگوں کی پرستش ہے۔ اس میں کوئی اسّی لاکھ دیوی دیوتا ہیں لیکن خاص الخاص سورج کی دیوی ہے جس کا پوتا جاپانیوں کے خیال کے مطابق جاپان کا پہلا حکمران ہوا۔ اسی سے جاپان کا تختِ حکومت یکے بعد دیگرے منتقل ہوتا ہوا موجودہ میکاڈو کو ملا ہے۔ اسی سورج کی دیوی کی نسل ہزارہا برس سے جاپان پر حکمرانی کر رہی ہے۔ اگرچہ اس مذہب میں سمندر کی دیوی، ندیوں کی دیوی، پہاڑوں کی دیوی، آگ کی دیوی، غرض بے شمار دیویاں تسلیم کی جاتی ہیں اور قوم کے جانباز سپاہیوں اور شاہی خاندان کے وفادار خادموں کی بھی پرستش ہوتی ہے لیکن شنٹو مذہب کا اصل الاصول شاہی خاندان کی سب سے پہلی بزرگ دیوی اور اس کے رشتہ داروں اور اس کی اولاد کی پوجا کرنا ہے۔

چین کا بڑا حصہ تاوی مذہب، کنفیوشنزم اور بدھ مذہب کا پیرو ہے۔ قدیم زمانوں سے آباؤ اجداد اور بھوتوں اور شیطانوں، دیویوں اور دیوتاؤں کی پرستش ان مذاہب کی اصلی خصوصیت رہی ہے۔ مقدم الذکر دونوں مذہب آبا پرستی اور نیچر پرستی کو اصولاً تسلیم کرتے ہیں۔ بدھ مذہب اگرچہ اصلاً آبا پرستی کا حامی

نہیں ہے لیکن چین میں پہنچ کر وہاں کے قدیم مذہب نے اسے بھی اپنے رنگ میں رنگ لیا اور اب یہ تینوں مذاہب چین کی آباء پرستی، مظاہر پرستی اور شیاطین پرستی کے مذہب ہیں۔ جادو، منتر، سحر، شعبدے ان کی مشترک خصوصیت ہیں اور ان کے پیرؤوں کے اوہام و خرافات کی داستان اتنی طولانی ہے کہ پڑھنے والا تھک جاتا ہے۔

تاوی مذہب کا بانی لاؤتزے ہے۔ اس کا اصلی فلسفہ نفی کا فلسفہ ہے۔ اس کا مذہبی صحیفہ مشکل سے مرقس کی انجیل کے نصف کے برابر ہوگا۔ لیکن اس مذہب کے پیرؤوں نے بعد میں اس پر جن اوہام کا اضافہ کیا ہے ان کی تفصیلات ضخیم مجلدات میں بھی نہیں سما سکتیں۔ تاوی فقراء ۱۰۰ برس قبل مسیح سے مشرقی سمندر میں پریوں کے ایک ایسے جزیرہ کے سراغ میں سرگرداں ہیں جہاں شجرۃ الخلد اگتا ہے۔ انھوں نے سارے آسمان کو دیویوں اور دیوتاؤں سے اور ساری زمین کو جادوگروں اور شعبدہ بازوں سے بھر دیا ہے۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ انسان اگر اپنے احساسات کی نفی اور جاوداں زندگی کا راز پا جائے تو آسمانی دیوتاؤں کے زمرہ میں شامل ہو جاتا ہے۔ ان کی آسمانی دیویوں میں "آسمان کی ملکہ" یا "مقدس ماں" کو سب سے زیادہ عظمت و اہمیت حاصل ہے۔ یہی سمندروں کی دیوی اور موجوں اور طوفانوں کی ملکہ ہے۔ ہر چینی ملّاح، ہر ماہی گیر، ہر جہاز ران اور ہر بحری سیاح کی یہ محافظ ہے۔ جب سمندر میں کوئی مصیبت پیش آتی ہے تو اس کی دہائی دی جاتی ہے اور وہ فوراً آسمانوں میں نمودار ہو کر بڑے بڑے طوفانوں کو اپنی تلوار سے دفع کر دیتی ہے سمندر کی تاریکیوں میں گم کردہ راہ جہاز رانوں کی رہنمائی کے لیے یہ سرخ لالٹین لے کر نمودار ہوا کرتی ہے۔

کنفیوشزم کا بانی کنفیوشس ہے۔ چین کا اصلی مذہب آباء پرستی ہے اور

کنفیوشزم کی حقیقت اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ وہ آباء پرستی کے لیے ایک سند تصدیق ہے۔ آباء پرستی چینی میتھالوجی کی ریڑھ کی ہڈی ہے۔ ان کے ہاں سب سے زیادہ عظمت واہمیت مُردوں کی ارواح کو حاصل ہے۔ چین کی اصلی خدائی انھیں کے ہاتھ میں ہے۔ یوں تو چینی اپنے سارے ہی دیوتاؤں کو قربانیاں اور چڑھاوے پیش کرتے ہیں لیکن سب سے زیادہ صدق دل کے ساتھ وہ اپنے باپ دادا کی روحوں کی عبادت کرتے ہیں۔

چینی عقیدہ کے مطابق مُردوں کی روحیں زمین پر باقی رہتی ہیں اور ان کا خیال یہ ہے کہ اگر ان کو کھلایا پلایا نہ جائے، ان کو راضی نہ رکھا جائے اور ان کی عبادت نہ کی جائے تو وہ خفا ہو جاتی ہیں اور ان کی خفگی بہت سی آفتیں لاتی ہے۔ ان کے عقیدہ کے لحاظ سے جس شخص کی روح کی اس کی اولاد کی طرف سے تعظیم اور پرستش نہیں کی جاتی وہ روح ایک ابدی شقاوت میں مبتلا ہو جاتی ہے۔

چین میں فرد کی انفرادی ہستی کا تصوّر معدوم ہے۔ ہر فرد اپنے آباء و اجداد کے اس طویل سلسلہ کے ساتھ مربوط سمجھا جاتا ہے جو ابتدائے آفرینش سے لے کر خود اس کے وجود تک پھیلا ہوا ہے۔ ہر زندہ چینی کی ہستی یکسر مُردوں کی ارواح کے رحم و کرم پر منحصر ہے۔ اگر مردوں کی تعظیم، تمام مراسم مقررہ کے مطابق بجالانے میں معمولی کوتاہی بھی ہو جائے تو بس قیامت ٹوٹ پڑتی ہے۔

ہزارہا برس گزر چکے ہیں۔ چینیوں کے آباؤ اجداد دورِ حجری کی بدویانہ زندگی سے نکل کر دورِ جدید کی حضری زندگی میں داخل ہو چکے۔ پچیس شاہی خاندان ملک پر حکومت کر چکے، خوفناک جنگوں اور عظیم الشان انقلابات نے ملک کے آسمان و زمین بدل دیے ہیں لیکن چین کی آباء پرستی روزِ اول سے آج تک بدستور قائم ہے۔ اس میں سرِ مُو تغیر نہیں ہُوا۔

کنفیوشسس نے بہت سے عمدہ اخلاقی اصولوں کی بھی تعلیم دی ہے۔ لیکن اس کی تمام تعلیمات کی بنیاد آبا پرستی پر ہے۔ وہ کہتا ہے کہ "ہمیں اپنے آباؤ اجداد کے لیے ان کو حاضر و ناظر سمجھ کر قربانیاں پیش کرنی چاہئیں"۔ "ہمیں ارواح کی اس طرح عبادت کرنی چاہیے گویا وہ ہمارے اندر موجود ہیں"۔

اگرچہ اس نے کہیں اپنی تعلیمات میں اپنے خدا ہونے کا دعویٰ نہیں کیا ہے لیکن ملک کے ہمہ گیر مذہب اور اپنی مذکورہ تعلیمات کی بدولت مرنے کے بعد وہ خود بھی لاؤ تزے کی طرح ایک دیوتا بن گیا اور آج چین میں ایک بڑے دیوتا کی حیثیت سے اس کی بھی عبادت ہوتی ہے۔

بودھ مذہب کی جائے پیدائش ہندوستان کی سرزمین ہے لیکن برہمنوں نے اس کو اس ملک سے اس طرح نکالا کہ پھر اس نے ادھر کا رُخ کرنے کی جرأت نہیں کی۔ یہاں سے جلا وطن ہونے کے بعد اس کو ہندوستان کے مشرقی جزائر، برما، چین، جاپان، تبت وغیرہ میں پناہ ملی اور اب جاپان کے سوا، جہاں سترھویں صدی کی تحریک قومیت سے اس نے شکست کھائی، تقریباً ہر جگہ نمایاں حیثیت میں موجود ہے اور چین و تبت وغیرہ میں اس کے پیرؤوں کی ایک عظیم تعداد پائی جاتی ہے۔

گوتم بدھ کے متعلق عام خیال یہ ہے کہ وہ خدا کا قائل نہیں تھا۔ لیکن یہ بات صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ دنیا کی قدیم تاریخ ہمیں مشرکوں سے تو بھری نظر آتی ہے لیکن خدا کے منکروں کا کہیں بھی کوئی نشان نہیں ملتا۔ خدا کا انکار کرنے والے اگر کچھ بلید ملتے ہیں تو صرف موجودہ دور میں ملتے ہیں۔ گوتم بدھ جیسے فلسفی کے متعلق کیسے گمان کیا جا سکتا ہے کہ وہ خدا کا منکر ہوگا؟ ہم نے گوتم بدھ کے عہد کی تاریخ اور اس کے مذہب کا جو تھوڑا بہت مطالعہ کیا ہے اس سے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ وہ وحدۃ الوجود کا قائل تھا۔ گوتم بدھ سے پہلے ہندوستان میں

اپنیشدوں کے ذریعہ سے وحدۃ الوجود کا فلسفہ اچھی طرح پھیل چکا تھا۔

وحدۃ الوجود کے قائل کے لیے خدا کے اقرار و انکار کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے نزدیک "انا" کے سوا تمام کائنات وہم و فریب ہے۔ یوگی کا کام یہ ہے کہ وہ زندگی اور موت کے چکر اور مایا کے جال سے چھوٹ کر روح کائنات یا بالفاظ دیگر "انا" میں ضم ہو جائے۔ گوتم بدھ کے دور سے پہلے ہندو جوگیوں کی ریاضتوں کی جو تاریخ ہمیں ملتی ہے وہ تمام اسی عقیدہ کا مظاہرہ ہے۔ وہ طرح طرح کی خوفناک ریاضتوں کے ذریعہ سے مایا کے جال سے نکلنے اور روح کائنات میں ضم ہونے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ جب گوتم بدھ کی آنکھیں کھلیں اور نجات کے لیے اس کے دل میں تڑپ پیدا ہوئی تو اس کے سامنے بھی یہی فلسفہ آیا اور اس نے برہمنوں ہی کے طریقہ پر زندگی اور موت کی کشاکش اور خواہشوں کے جنجال سے نکلنے کے لیے نہایت جان گسل ریاضتیں شروع کیں۔ لیکن کچھ ہی دنوں کے تجربہ کے بعد اس پر یہ حقیقت کھل گئی کہ مادیت کے غلاف سے نکلنے کے لیے یہ ہولناک ریاضتیں غیر ضروری ہیں۔ اصل شے نفس کا خواہشوں سے پاک ہونا اور روح و دل کا محسوسات کی محبت سے آزاد ہونا ہے۔ چنانچہ جہاں تک تکلیف دہ ریاضتوں کا تعلق ہے اس نے برہمنوں کے طریقہ کی اصلاح کر دی اور تزکیہ نفس اور تجرد کے حصول کے لیے ایسے ضابطے بنائے جن میں ظاہری ترک سے زیادہ باطنی ترک پر زور دیا گیا تھا۔

وحدت الوجود کی آخری تان انا اللہ اور انا الحق ہے۔ چنانچہ اسی چیز نے ہر ہندو یوگی کو عبد کے بجائے طاغوت بنا دیا۔ گوتم بدھ کی جد و جہد بھی اسی مقصد کے لیے تھی۔ چنانچہ وہ بھی اپنے خیال کے مطابق مادیت کا جامہ اتار کر روح کائنات میں ضم ہو گیا۔ اس کے مرنے کے بعد اس کے معتقدین نے اس کو خدا بنا دیا اور اس

کی ولادت سے متعلق بہت سے بے سروپا افسانے پھیلا کر اسے ایک اوتار کی حیثیت سے پیش کیا۔ جو دُنیا کو نئی زندگی بخشنے آیا تھا۔ اب چین، جاپان، تبت، برما وغیرہ میں اس کی پرستش خدا کی حیثیت سے ہوتی ہے اور اس کے شاندار مندر اور عظیم الشان بت دیکھنے والوں پر حیرت طاری کر دیتے ہیں۔ چین میں اس کے پرستار ہر قسم کے بھوتوں اور دیوتاؤں اور دیویوں کی پرستشوں میں مبتلا ہیں۔ تبت وغیرہ میں اور بھی برا حال ہے۔ تبت کا سب سے بڑا پیشوائے مذہبی (ڈلائی لامہ) خود گوتم بدھ کا اوتار خیال کیا جاتا ہے اور اسی طرح خدائی کرتا ہے جس طرح گوتم بدھ۔ وہاں کا ڈلائی لامہ جب مرتا ہے تو ہر حاملہ عورت ایک نیا خدا جننے کی آرزو سے معمور ہو جاتی ہے اور اس دور میں جو بچے پیدا ہوتے ہیں، قُرعہ اندازی کے ایک خاص طریقہ سے، ان میں سے ایک نئے الٰہ کا انتخاب ہوتا ہے۔

## ہندوستان

ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھتے ہوئے جی ڈرتا ہے۔ یہاں کا ہر ذرّہ دیوتا ہے۔ چیونٹی سے لے کر ہاتھی تک اور ذرّہ سے لے کر آفتاب تک سب یہاں معبود اور مقدس ہیں۔ دریا، پہاڑ، شجر، حجر، چرند، پرند، بلی، چوہے یہاں تک کہ ناقابلِ ذکر انسانی اعضا تک کے پرستار یہاں مل جائیں گے۔

ویدوں میں ہمارے سامنے سب سے پہلے "ہزار چشم" اندرا آتا ہے، جس نے اپنے عملی نمونہ سے اپنے پرستاروں کو "بدمستی" اور نشہ بازی کی تعلیم دی۔ اس کے بعد برھما، وشنو اور شیو کی تثلیث نظر آتی ہے۔ مقدم الذکر خالق ہے، ثانی الذکر محافظ ہے اور تیسرا مارنے والا اور جلانے والا ہے۔

برھما اپنے ہر کلپ کے بعد دنیا کو فنا کر کے از سرِ نو وجود بخشتا ہے۔ اس کا

مندر آج تک راجپوتانہ میں مرجع خلائق ہے۔

وشنو جب دنیا پر کوئی بڑی آفت آتی ہے تو خلق کی نجات کے لیے اترتا ہے۔ اس مقصد کے لیے وہ بار بار اوتاروں کی صورت میں جنم لیتا ہے۔ اس کے دس اوتار ہندو میتھالوجی میں مشہور ہیں۔ سری کرشن بھی وشنو کے اوتار خیال کیے جاتے ہیں اور ان کی زندگی کو جس رنگ میں پیش کیا گیا ہے اور اس سے جو مذہبی روایات ہندو قوم میں پھیلی ہوئی ہیں ان کے بیان سے بھی شرم آتی ہے۔

شیو، وشنو کا حریف مقابل ہے۔ یہ ایک ہی ساتھ دو متضاد فطرتیں رکھتا ہے۔ اس کے قبضۂ قدرت میں تعمیر و تخریب دونوں ہیں۔ اس کے اندر عورت اور مرد دونوں کی خصوصیات جمع ہیں۔

اس کے بعد ہمارے سامنے پتنجلی کا فلسفہ یا ہندو تصوف آتا ہے۔ اس کی بنیاد وحدۃ الوجود پر ہے۔ اس فلسفہ میں موجود صرف "انا" ہے۔ اس کے ماسوا سب وہم و فریب ہے۔ اس کی غایت یہ ہے کہ ذرہ آفتاب، قطرہ دریا اور بندہ خدا بن جائے۔ اس کا راستہ یہ ہے کہ ریاضات شاقہ کے ذریعہ سے روح کو مادہ سے مجرد کیا جائے۔ اس مقصد کے لیے ہندو یوگیوں اور فقیروں نے جو طریقے پیدا کیے ہیں ان کی تفصیلات سن کر کلیجہ منہ کو آتا ہے اور اس کے لیے عملاً انھوں نے جو کچھ کر دکھایا ہے اس کے تصور سے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ لیکن جو انسان اپنے معمولی مقاصد کے لیے جان کی بازی کھیل جایا کرتا ہے وہ خدا بننے کے لیے جو کچھ بھی کر گزرے کم ہے۔ چنانچہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ان ہندو جوگیوں نے جس طرح کی ریاضتیں کی ہیں اس کی مثالیں دُنیا کی تاریخ میں مشکل سے مل سکیں گی۔ لیکن یہ سب کچھ خدا کی بندگی کے لیے نہیں کیا گیا بلکہ خدا بننے کے لیے کیا گیا۔

دیوتاؤں کے بعد ہندو میتھالوجی میں دیویوں کی باری آتی ہے اور ان کی

تعداد بھی کچھ کم نہیں ہے۔ ان سب کی خصوصیات کی تفصیل میں پڑنا تو لاحاصل ہوگا البتہ لکشمی، درگا، بھیروی اور کالی مائی کے نام ہم یاد دلائے دیتے ہیں، بالخصوص ان میں سے موخر الذکر کو ہندؤوں کے نزدیک بڑی اہمیت حاصل ہے۔ چیچک ہیضہ وغیرہ جیسی خطرناک بیماریاں سب انہی کی غضبناکیوں کے مظاہر ہیں۔

ہندؤوں کے اندر جس قدر بھی فرقے ہیں وہ یا تو ان دیویوں اور دیوتاؤں کے پرستار ہیں یا گیتا اور پتنجلی کے فلسفہ سے متاثر ہیں۔ بعض فرقے کسی قدر مختلف نظر آتے ہیں لیکن ان کا اختلاف محض ظاہری ہے، حقیقت اور مغز کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہے۔ صرف دو فرقے کسی قدر مستثنیٰ حالت رکھتے ہیں۔ ایک آریا سماجی دوسرے سکھ۔ یہ دونوں اسلام سے متاثر ہوئے ہیں۔ اور توحید کے مفہوم سے کسی قدر قریب آئے ہیں۔ لیکن اسلام سے ان کی قربت ایک دفاعی جذبہ کے تحت وجود میں آئی ہے۔ اس وجہ سے اس قربت کے باوجود وہ اسلام سے دور ہی ہیں۔ ان فرقوں کے بانیوں کو یہ اندیشہ ہوا کہ مسلمانوں کا مقابلہ بت پرستی پر قائم رہ کر مشکل ہے اس لیے انھوں نے مورتیوں وغیرہ کی پوجا ترک کر کے فی الجملہ ایک ایسی اصلاح قبول کر لی جس کے بعد وہ اپنے خیال کے مطابق روح زمانہ اور عقل سے قریب آگئے اور اپنے تئیں اس قابل خیال کرنے لگے کہ اب وہ مسلمانوں کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ان دونوں فرقوں کو مسلمانوں سے جو عداوت ابتدا سے ہے وہ کسی اور فرقہ کو نہیں ہے۔ حالانکہ ان کو مسلمانوں کے اصل الاصول سے قریب ہونے کی وجہ سے ان سے محبت کرنی تھی۔ بہر حال یہ اصلاح انھوں نے کسی جذبہ کے تحت قبول کی ہو۔ ایک اہم اصلاح ہے اور اس کی وجہ سے وہ اسلام کی بنیادی تعلیم سے قریب آگئے ہیں۔ اب ان کو توحید اور اس کے مقتضیات کی تعلیم دینا آسان کام ہے بشرطیکہ حق ان کے سامنے اس راستے

سے آئے جو اس کا اصلی راستہ ہو۔

مذہب پرست ہندوستان کا یہ حال ہے۔ عوام و خواص سب اسی طرح کے توہمات مشرکانہ میں گرفتار ہیں۔ یہاں کے اچھے دناغوں پر گیتا کے وحدت الوجود کا تسلط ہے جو بجائے خود ایک عظیم فتنہ ہے۔ آریوں اور سکھوں کی آخری معراج یہ ہے کہ یہ مورتی پوجا کے منکر ہیں لیکن ہمارے اوپر کے مباحث پر جن لوگوں کی نظر ہے وہ جانتے ہیں کہ حقیقی توحید تک پہنچنے کے لیے ابھی ان کو بہت سے مرحلے طے کرنے باقی ہیں۔

جس طرح ہندوستان پر مسلمانوں کے غلبہ کے اثر سے سکھ اور آریہ سماجی وجود میں آئے اسی طرح انگریزوں کے غلبہ اور مغرب کے جدید افکار و نظریات کے اثر سے ایک نیا گروہ وجود میں آیا جو فی الجملہ زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ اس نے بہت حد تک قدیم ہندو میتھالوجی کے توہمات سے اپنے دماغ کو آزاد کر لیا ہے لیکن یہ ایک دوسری میتھالوجی تیار کر رہا ہے جس کا مواد اس نے مغرب سے لیا ہے۔ اس میں پرانے دیوتاؤں اور دیویوں کی جگہ نئے دیوی دیوتا ہیں۔ اس میں انسان خود اپنا الٰہ ہے۔ خود اپنے لیے قانون بناتا ہے، خود اپنے اوپر فرمانروائی کرتا ہے اور خدا کی زمین پر اپنی بادشاہی کا ڈنکا بجاتا ہے۔ اس کا نام ڈیموکریسی ہے۔

## مغربی یورپ اور امریکہ

مغربی یورپ اور امریکہ کا اصلی مذہب عیسائیت ہے۔ عیسائیت کے بگاڑ کی ابتدائی تاریخ ہم پچھلے صفحات میں بیان کر چکے ہیں۔ نیقیہ کی کونسل کے بعد سے تثلیث کا عقیدہ باضابطہ اسٹیٹ کا مذہب بنا اور پوپ اور کلیسا کی خدائی کا دور شروع ہوا۔ نیز ہم یہ واضح کر چکے ہیں کہ مذکورہ بالا کونسل کے بعد

آریوس اور اور اس کی پارٹی جو حضرت مسیح علیہ السلام کے سچے خلیفہ پیٹر (شمعون صفا) کے عقائد کی وارث اور صحیح نصرانیت کی حامل تھی نہایت اقلیت بلکہ مظلومیت و مقہوریت کی حالت[1] میں آگئی اور پال کی باطنیت اور تحریفات کی بنیاد پر کلیسا کے رسوم و عقائد کی عمارت کھڑی ہوئی۔

اب ہمیں ایک سرسری نظر بیچ کی صدیوں سے لے کر اصلاح (REFORMATION) کے عہد تک کی تاریخ پر ڈالنی ہے۔

اس بیچ میں ہمیں دو باتیں نہایت نمایاں طور پر نظر آتی ہیں ایک کیتھولک چرچ کی وحدت، دوسری اس کا ہمہ گیر اقتدار۔ قرون متوسطہ میں کلیسا کا اقتدار ایسا غالب اور ہمہ گیر ہو گیا تھا کہ تمام چھوٹی بڑی سلطنتیں اس کے ہاتھ میں بالکل ایک آلۂ بے جان بن کر رہ گئی تھیں اور اس کے آگے مقدس رومی شہنشاہی کا جاہ و جلال بھی ماند پڑ گیا۔ لیکن کلیسا نے اس اقتدار سے نہایت غلط فائدہ اٹھایا۔ اس اقتدار کے نشہ میں اس نے وہ جنگ صلیبی شروع کر دی، جس نے دو سو برس سے زیادہ تک پورے یورپ کو زیر و زبر رکھا۔ اس دوران میں خداوندانِ کلیسا نے جو جرائم کیے، جس طرح خلقِ خدا کا بے دریغ خون بہایا، جس طرح نوخیز بچوں تک کو جنگ کے نشہ سے سرشار کر کے تباہ کیا، جس طرح وقت کی تمام تعمیری قابلیتوں کو تخریب کی راہ پر ڈال دیا، اس کا ردِ عمل اہل یورپ کے دماغوں پر کلیسا کے خلاف ہُوا۔ جنگ کی ناکامیوں اور تباہ کاریوں نے اہلِ فکر کے دماغوں میں ایک بحران سا پیدا کر دیا۔ ہر شخص کو یہ محسوس ہونے لگا کہ ارباب کلیسا کا اقتدار دنیا کی

---

[1] اسی پارٹی کے باقیات صالحات تھے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد آپ پر ایمان لائے اور ان ہی لوگوں کی قرآن نے جگہ جگہ تعریف کی ہے نہ کہ پال کے متبعین کی جو ہمیشہ توحید دشمنی کے سرخیل رہے ہیں۔

تباہی کا سبب ہے، علم و تحقیق کے شیدائیوں کو یہ محسوس ہونے لگا کہ کلیسا تمام ذہن و فکر پر کابوس کی طرح مسلط ہو گیا ہے اور جب تک یہ کابوس دور نہ ہوگا اس وقت تک فکر و نظر کی تمام راہیں مسدود رہیں گی۔ ارباب سیاست یہ سوچنے لگے کہ حکومتوں پر کلیسا کا اقتدار بالکل خلافِ عقل اور خلاف فطرت ہے۔ سیاست کو مذہب سے بالکل بے تعلق ہونا چاہیے۔ یورپ کی مختلف قومیں محسوس کرنے لگیں کہ رومن کیتھولک چرچ دنیا پر رومی اقتدار کا ایک بہانہ ہے اس کو ختم ہونا چاہیے۔ یہاں تک کہ خود کلیسا کے اندر ایک ایسی جماعت پیدا ہو گئی جس نے یہ محسوس کرنا شروع کر دیا کہ ہم مسیح کی زندگی سے ہٹ کر دنیا داری کی تمام شیطنتوں میں مبتلا ہو گئے ہیں اور ہمارا مقصد اب صرف دولت کے انبار اکٹھا کرنا اور اپنے عظمت و جلال کی نمائش کرنا اور دنیا کو تباہ کرنا رہ گیا ہے۔ ہمیں غربت کی زندگی، خدمت خلق، ترک دنیا اور اتباع مسیح کی طرف لوٹنا چاہیے۔

ان تمام چیزوں نے مل ملا کر یورپ میں وہ بحران کا دور پیدا کر دیا جس کو ہم نشاۃ ثانیہ (RENAISSANCE) کے نام سے جانتے ہیں۔ بیکن وغیرہ جیسے اہل علم میکیاولی اور ہیوگو گروٹیس وغیرہ جیسے ارباب سیاست، گارڈینو برونو جیسے آزاد خیال مفکرین اسی بحرانی دور کی پیداوار ہیں۔ کلیسا نے ان لوگوں کی مخالفتوں کا جواب مذہبی جرائم کا فیصلہ کرنے والی عدالتوں (INQUISITION) سے دیا اور مذہبی و سیاسی اصلاح کے داعیوں اور علم و تحقیق کے شیدائیوں کو ایسی خطرناک سزائیں دیں کہ ان کے تصوّر سے بھی رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ لیکن ان سزاؤں نے کلیسا کی مخالفت اور پاپائیت کے ختم کرنے کے مطالبہ کو اور زیادہ قوی کر دیا۔ مختلف قوموں میں اپنی قومیت کے تحفظ کا جذبہ تیز سے تیز تر ہو گیا۔ ارباب علم کا جوشِ تحقیق و اکتشاف قوی سے قوی تر ہو گیا اور فلسفہ نے تو گویا سر جوڑ کے کلیسائی توہمات کی بیخ کنی کا ......کرا!

اور خود کلیسائی حلقہ کے اندر اصلاح اور تبدیلی کا مطالبہ درجہ بدرجہ اتنا قوی ہو گیا کہ سولہویں صدی کے شروع ہوتے ہوتے وائی کلف ہس اور لیوتھر جیسے زبردست حامیانِ اصلاح پیدا ہو گئے اور انھوں نے متحدہ کرسچین چرچ کو پھاڑ کر دو حصوں میں بانٹ دیا اور باضابطہ پروٹسٹنٹ فرقہ کی بنیاد ڈال دی جس کا بنیادی تخیل یہ تھا کہ مسیح اور خدا کے درمیان کسی واسطہ کی ضرورت نہیں ہے۔ انجیل کے سمجھنے اور مراسم مذہبی کے بجا لانے کا حق ایک عام آدمی کو بھی اسی طرح حاصل ہے جس طرح پاپائے روم کو۔

قومی حکومتوں کا آغاز تو تیرھویں صدی ہی میں ہو چکا تھا۔ سولہویں اور سترھویں صدی تک پہنچتے پہنچتے نیشنلزم، متحدہ قومیت، مذہب اور سیاست کی علیحدگی اور مذہبی رواداری کا زور اس قدر بڑھا کہ کلیسا کو، خواہ وہ کیتھولک ہو یا پروٹسٹنٹ، اپنا تمام کاروبار سمیٹنا پڑا۔ علم و سیاست اور معاش و معیشت کے تمام گوشے چرچ کے تسلط سے یک قلم آزاد ہو گئے اور اس کی جگہ اٹھارہویں اور انیسویں صدی کی وہ سیاسی تنظیمات وجود میں آگئیں جن میں مذہب پرائیویٹ زندگی کا ایک مشغلہ رہ گیا اور اجتماعی زندگی پر احبار و رہبان کی خدائی کی جگہ عوام الناس اور پارلیمنٹوں کی خدائی شروع ہو گئی۔

اس تفصیل سے یہ امر واضح ہو گیا کہ عیسائیوں کو خالص خدا پرستی کی سعادت کبھی حاصل نہیں ہوئی۔ پال نے ان کو مسیحؑ، مریمؑ، کاہنِ اعظم اور طاغوت کی پرستش میں مبتلا کیا اور رومن کیتھولک چرچ کی مشرکانہ خرافات کا دروازہ کھولا اور لوتھر کی اصلاحات نے کلیسا کو اجتماعی زندگی سے بے دخل کر کے اس کی جگہ عوام الناس، پارلیمنٹوں کے ممبروں، بادشاہوں اور پریسیڈنٹوں کو بخش دی اور اس طرح پرائیویٹ اور پبلک زندگی کے الگ الگ ارباب بنا لیے گئے۔

۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم نے جب جمہوریتوں کا ضعف واضح کیا تو یورپ کے

بعض ممالک میں ڈکٹیٹر شپ کا آغاز ہوا۔ جمہوریت اور ڈکٹیٹر شپ میں فرق صرف ارباب کی تعداد کا ہے۔ جمہوریت میں بہت سے الٰہ مل کر قانون بناتے اور خدائی کرتے ہیں۔ ڈکٹیٹر شپ میں صرف ایک الٰہ اپنے شرکاء و اعوان کی مدد سے خدائی کرتا ہے۔

## روس

روس میں اشتراکیت کا دور دورہ ہے۔ اشتراکیت جمہوریت کا آخری قدم ہے۔ جمہوریت نے مذہب اور خدا کو پرائیویٹ زندگی کے ساتھ مخصوص کر دیا تھا۔ اشتراکیت نے یہ رشتہ بھی کاٹ دیا۔ انسانی زندگی کے ہر شعبہ پر انسان کی حاکمیت کو مسلط کر دیا۔ وہاں عیسائی تثلیث کی جگہ مارکس، لینن، اسٹالن کی تثلیث ہے ان اقانیم ثلاثہ نے جو نظامِ عقائد، جو نظامِ اخلاق اور جو نظامِ معاش و معیشت وضع کر دیا وہی روس کا دین ہے۔

# ۶۔ مسلمانوں کی موجودہ حالت کا جائزہ

یہ تو ان گروہوں کے شرک کا حال تھا اور سے جو شرک کے دشمن کے مدعی بھی نہیں ہیں اب ہمیں اس گروہ کی حالت دیکھنی ہے جو خالص توحید کی بنیاد پر بنا تھا اور جس کے قیام کی واحد غرض ہی یہی تھی کہ دنیا سے شرک کو مٹا کر توحید قائم کرے۔

یہ امر بالکل قطعی ہے کہ محل کے بدل جانے سے کسی شے کی حقیقت نہیں بدل جاتی۔ جو چیز مشرکین کے اندر شرک ہے، اہل کتاب کے اندر شرک ہے، منافقین کے اندر شرک ہے وہی چیز اگر مسلمانوں کے اندر پائی جائے گی، تو وہ توحید نہیں بن جائے گی۔ شرک ہی رہے گی۔ نجاست کسی ٹھیکرے میں ہو یا سونے چاندی کے کسی خوشنما ظرف کے اندر، دونوں جگہ نجاست ہے۔ اس تبدیلی سے اس کی حقیقت و ماہیت میں کوئی تبدیلی نہیں ہو گی۔ البتہ حالات کی تبدیلی سے اس کا حکم ضرور بدل جائے گا خنزیر و خمر نجس ہیں اور ہر حال میں نجس ہیں لیکن ایک مضطر و مجبور اگر جان بچانے کے لیے بقدر سدرمق ان میں سے کچھ کھا لیتا ہے تو شریعت اس پر گرفت نہیں کرتی۔ پس ایک چیز ہے واقعہ اور ایک چیز ہے حالات کی تبدیلی کے اعتبار سے اس کا حکم۔ اس فصل میں ہم صورت واقعہ جائزہ لیں گے اور اس کے بعد والی فصل میں اس کا حکم بیان کریں گے۔

مسلمانوں کی موجودہ حالت کا اگر جائزہ لیا جائے اور بیجا غرور اعتراف حق سے مانع نہ ہو تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ عرب جاہلیت سے لے کر منافقین تک شرک کی جتنی قسمیں بیان ہوئی ہیں اگر وہ سب نہیں تو ان کا بڑا حصہ مسلمانوں کے اندر موجود ہے۔

صرف شکلیں بدلی ہوئی ہیں۔ عرب جاہلیت کی جنات پرستی، کواکب پرستی، آباء پرستی، خود پرستی، اہل کتاب کی علماء پرستی، جبت پرستی، طاغوت پرستی، قوم پرستی اور حمایت شرک۔ منافقین کی طاغوت پرستی، انا پرستی اور مفاد پرستی، ان تمام "پرستیوں" میں کون سی پرستی ہے جو آج مسلمانوں کے اندر موجود نہیں ہے۔

کتنے مسلمان ہیں جو علوم سفلیہ کی لعنتوں میں گرفتار ہیں۔ انھوں نے ٹونے ٹوٹکے گنڈے، تعویذ[1]، سحر اور طلسمات وغیرہ کو کسب معاش کا ذریعہ بنا رکھا ہے۔ تسخیر جن و شیاطین کے وظائف و عملیات کا علم ہی ان کے نزدیک اصلی علم ہے۔ جنات کی تسخیر کے لیے وہ طرح طرح کی ریاضتیں کرتے ہیں، چلہ کشی کرتے ہیں، نذریں اور چڑھاوے پیش کرتے ہیں۔ ان کو علم غیب کا وسیلہ سمجھتے ہیں۔ ان کو مستقل بالذات نافع و ضار خیال کرتے ہیں۔ ان کی دہائی دیتے ہیں۔ ان کے تعلق سے خدا کی کتنی جائز چیزوں کو حرام قرار دیتے ہیں اور کتنی ناجائز باتوں کو جائز کر دیتے ہیں۔

---

[1] احادیث نبوی سے جن تعویذوں کے لیے زیادہ سے زیادہ رخصت ملتی ہے اولاً تو وہ خاص خاص حالات کے لیے ہیں۔ ثانیاً ان کی اصل روح اللہ واحد سے استعاذہ، اس کی طرف تفویض اور غیر اللہ سے اظہار برأت ہے۔ باقی رہے وہ تعویذ جن میں لایعنی کلمات ہوتے ہیں اور جن میں شرک کی آمیزش کا ظن یا علم ہے ان کے جواز کا شرع شریف میں کوئی امکان بھی نہیں ہے لیکن یہ دیکھ کر نہایت قلق ہوتا ہے کہ تعویذ فروشی کی موجودہ دوکانیں بیشتر ایسے ہی تعویذوں سے چل رہی ہیں جو عموماً مشرکانہ اور غیر مفہوم عجمی الفاظ پر مشتمل ہوتی ہیں اور اگر آیات قرآن سے بھی استعاذہ کیا جاتا ہے تو عموماً تحریف کر کے۔ ایک بزرگ نے خود مجھ کو بچھو کا ایک عمل بتانا چاہا جس میں سورۂ ناس کے ہر لفظ کا آخری حرف غائب کر دیا گیا تھا۔ میں نے ان سے کہا، حضرت قرآن کو مسخ و بے معنی کرنے کی ذمہ داری آپ ہی اٹھائیے، مجھے اس سے معاف ہی رکھیے تو میری اس ناقدری سے وہ مجھ سے بہت مایوس ہوئے۔

اسی طرح کتنے ہیں جو علم اسماء اور خواص کلمات و اشیاء کے چکر میں رہتے ہیں اور اس علم کو بعینہٖ اسی طرح کے بڑے مقاصد میں استعمال کرتے ہیں جن میں ان کے پیش رو بیہودہ استعمال کرتے تھے یہاں تک کہ بعض ظالموں نے خود قرآن عزیز کو بھی حب و بغض، تسخیر و تفریق اور وضع و استقرار حتی کہ امساک کے عملیات کا دفتر بنا رکھا ہے۔ اس قسم کی عملیات کے شائق خدا کی نعمتوں کو بعض اوقات عارضی طور پر اور بعض حالات میں مستقلاً حرام کر لیتے ہیں۔ اس طائفہ کے بعض اشخاص کے سامنے جب میں نے ذکر کیا کہ اذن الٰہی کے بغیر کسی شے کو حرام و حلال کرنا شرک ہے تو ان کو بڑا تعجب ہوا۔

وباؤں کے زمانوں میں یا خاص خاص بیماریوں کے مریضوں کی موجودگی کی حالت میں، کتنی چیزیں ہیں جو گھروں کے اندر اس ڈر سے استعمال نہیں کی جاتیں کہ جو ارواح ان بیماریوں کا باعث ہیں ان کو ان چیزوں سے چڑ ہے اور ان کو دیکھ کر ان کا غضب اور بڑھتا ہے۔

نکھتروں، دنوں اور مہینوں اور کسوف و خسوف سے متعلق کتنے مشرکانہ توہمات ہیں جن میں عورتوں سے گزر کر عاقل مردوں تک کو ہم نے گرفتار پایا ہے۔

کتنے مسلمان ہیں جو آبار پرستی کی لعنتوں میں مبتلا ہیں۔ مشائخ اور بزرگوں کی قبریں گوشہ گوشہ میں موجود ہیں اور علانیہ ان کی پوجا ہو رہی ہے، ان پر نذریں پیش ہوتی ہیں، قربانیاں کی جاتی ہیں، چادریں چڑھائی جاتی ہیں، دعائیں مانگی جاتی ہیں۔ مصائب اور نقصانات کو اصحاب قبور کی ناراضی پر محمول کیا جاتا ہے۔ ان کی زیارت کے لیے لوگ دُور دُور کا سفر کر کے جاتے ہیں۔ ان پر مراقبہ کرتے ہیں، سجدہ کرتے ہیں اور دوسرے بے شمار محرمات کا ارتکاب کرتے ہیں جن کا حرام ہونا شریعت میں معلوم ہے۔ تقرب الٰہی کے لیے ان کا وسیلہ ناگزیر خیال کیا جاتا ہے بہتیرے ان کو سمیع و بصیر خیال کرتے ہیں۔ خطرات اور مصائب کے وقت ان کو

مدد کے لیے پکارتے ہیں۔ ان کو خدا کے ہاں سفارشی سمجھتے ہیں، ان سے دنیا کی کامیابی مقدمات میں فتح، تجارت میں فروغ اور آل و اولاد کی برکت مانگتے ہیں۔ ان کی خدمت میں مختلف اغراض و مقاصد کے لیے درخواستیں پیش کی جاتی ہیں، یہاں تک کہ بعض مزارات پر سائلین کی درخواستوں کو پیش کرنے کے لیے باضابطہ اہتمام ہے۔

کتنی مشرکانہ بدعتیں ہیں جو حضرات صحابہ کرام، صحابیات عظام اور رسول اکرم صلعم اور ازواج مطہراتِ رسُول کے نام سے موجود ہیں۔ ان کے نام سے خاص خاص پکوان پکتے ہیں اور ان کے کھانے میں اسی قسم کی تفریقیں ملحوظ ہوتی ہیں جو مشرکین کے یہاں ملحوظ ہوتی تھیں[۲] اور جن کا قرآن نے سورہ انعام میں ذکر فرمایا ہے۔

کتنے ہیں جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان صفات میں شریک قرار دیتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص ہیں۔ حد یہ ہے کہ[۱]

---

[۱] ایک ثقہ عالم دین دوست راوی ہیں کہ وہ ایک مرتبہ ایک "اسلامی" ریاست کے مفتی صاحب کے ساتھ موٹر پر جا رہے تھے، سامنے یکایک ایک بچہ آگیا۔ مفتی صاحب بے اختیار پکار اٹھے "یاغوث" انھوں نے دریافت کیا۔ آپ نے کس غوث کو مدد کے لیے پکارا؟ مفتی صاحب نے فرمایا شیخ عبدالقادر جیلانی کو۔

ایک دوسرے بزرگ عالم دین نے ایک مرتبہ ایک عالم دین اور پیشوائے طریقت کے گہرے رنگ تصوف کا ذکر کرتے ہوئے مجھ سے بیان فرمایا کہ ہم اور وہ دونوں ٹم ٹم پر جا رہے تھے۔ راستہ میں گھوڑا بدکا اور ہم دونوں کے لیے سخت خطرہ پیش آگیا۔ اس وقت بے اختیار انھوں نے یاغوث پکارا۔ میں نے بر سبیل مدح اس واقعہ کو سن کر اپنے دل میں ان دونوں صاحبوں کی حالت پر انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا۔

[۲] مثلاً یہ کہ فلاں نیاز کو مرد نہ کھائیں اور فلاں نیاز کو فلاں قسم کی عورت نہ کھائے اور فلاں نیاز صرف دن ہی میں کھائی جا سکتی ہے اور فلاں نیاز رات ہی کے وقت کھائی جا سکتی ہے۔

وہی جو مستوی عرش تھا خدا ہو کر
اُتر پڑا وہ مدینہ میں مصطفیٰ ہو کر

کتنی جگہیں ہیں جہاں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے تبرکات بتائے جاتے ہیں اور ان کی زیارت کی تقریبات مستقل فتنہ بنی ہوئی ہیں۔ بعض مقامات پر بزرگوں کی قبروں اور ان کے تبرکات کے صندوقوں یا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نشان قدم کا غُسالہ زائرین میں تقسیم ہوتا ہے اور لوگ اس کو بہت سے امراض روحانی و جسمانی کا واحد علاج سمجھ کر پیتے ہیں۔ آنکھوں میں لگاتے ہیں، داڑھیوں میں ملتے ہیں۔ محرم اور تعزیہ داری کی مشرکانہ بدعتیں ہر شہر اور دیہات میں موجود ہیں اور ان کا کم و بیش تجربہ ہر شخص کو ہے۔

کتنے ہیں جو اپنے نسب کو ذریعۂ نجات یا کم از کم ذریعہ تقرب الٰہی سمجھتے ہیں۔ آباء کا طریقہ کتنوں کے یہاں دین و شرع کی حیثیت رکھتا ہے۔ شرع اور رواج کی اصطلاحیں ہر زبان پر چڑھی ہوئی ہیں اور شرع کے مقابل میں علی الاعلان رواج کو ترجیح دینے والے مسلمانوں کے ہر طبقہ میں موجود ہیں۔

دینی معاملات میں اللہ کی ہدایت کی تلاش اور طلب تقریباً بالکل مفقود ہے۔ مسلمانوں میں مختلف فرقے ہیں اور ہر فرقہ میں عوام سے گزر کر علماء تک ایسے غالی مل جائیں گے جو اپنے خاص طریقہ، اپنے مخصوص فرقہ کے علماء اور اپنے متعین امام پر اس طرح جامد اور ان کی عصبیت میں اس طرح گرفتار ہیں کہ ان کے دائرہ سے باہر ان کے لیے حق و ہدایت کا تصور بھی دشوار ہے۔ بعض غالیوں کا تو یہ حال ہے کہ نصوص کتاب و سنت کی قطع و برید پر وہ صرف کر ڈالیں گے لیکن اپنے امام کے کسی قول پر حرف نہیں آنے دیں گے۔ بعض یہاں تک کہہ گزرتے ہیں کہ یہ آیت اور یہ حدیث لازماً ہمارے امام کے سامنے رہی ہو گی لیکن اس کے

باوجود جب ان کا فتویٰ یہی ہوا تو ہم ان ہی کی پیروی کریں گے۔ آیت وحدیث کے اسرار کے سمجھنے کی ذمہ داری ان پر ہے۔

کتنے ہیں جو اللہ کے فضل سے دین کا علم بھی رکھتے ہیں لیکن وہ حق کا معیار اپنے شیوخ واکابر ہی کو سمجھتے ہیں۔ ان کے شیوخ جس مسلک پر ہوں اس کا غلط ہونا ان کے نزدیک ناممکن ہے اور جس مسلک پر ان کے شیوخ نہ ہوں اس کی صحت پر کتنے ہی دلائل اللہ کی کتاب سے، رسول کی سنت سے، عقل سے، نقل سے جمع کر دیجیے، وہ اس سے مطمئن نہیں ہوں گے۔ جو عصبیت اللہ اور اس کے رسول کے لیے ہونی چاہیے وہ عصبیت ان کے اندر اپنے شیوخ واکابر کے لیے ہے اور جو حمیت اللہ کی ہدایت اور اس کے رسول کے طریقے کے لیے مطلوب ہے وہ حمیت ان کے اندر اپنے علما اور ائمہ کے طریقے کے لیے ہے اور اچھے خاصے ذہین لوگ بھی اس فتنہ کی اہمیت کو نہیں سمجھتے ہیں۔

اوپر مشرکین کی خود پرستی اور یہود کی قوم پرستی کا بھی ذکر ہوا ہے اور وہاں ہم نے دکھایا ہے کہ ایک متوارث عظمت دینی و دنیاوی کے بعد کس طرح قومیں اور جماعتیں خود طاغوت بن جایا کرتی ہیں۔ کس طرح وہ اللہ کے تمام وعدوں اور اس کی ساری برکتوں کو ایمان باللہ اور عمل صالح کی جگہ اپنے نسب اور خاندان سے وابستہ کر دیتی ہیں۔ کس طرح اپنے دائرہ کو نجات کا دائرہ اور اپنے طریقہ کو ہدی اللہ کا قائم مقام بنا دیتی ہیں۔ ٹھیک یہی حال اس وقت مسلمانوں کا ہے۔ یہ جو کچھ کرتے ہیں وہ آپ سے آپ اسلامی ہو جاتا ہے۔ اس کے لیے اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کے طریقے سے مطابق ہونا ضروری نہیں۔ یہ جو رنگ ڈھنگ اختیار کر لیں وہ صبغۃ اللہ ہے اگرچہ وہ مغرب کی جاہلی تہذیب کی بھونڈی نقالی ہی کیوں نہ ہو۔ یہ جو تعلیم اپنے بچوں کو دیں وہ اسلامی تعلیم ہے اگرچہ وہ تعلیم بچے کے دل کے اندر سے

اسلام کی جڑ اکھاڑ کر پھینک دے۔ یہ جو ادارے قائم کردیں وہ اسلامی ہیں اگرچہ ان کے اندر شب و روز اسلام اور اسلامی تعلیمات کا مذاق اُڑایا جاتا ہو۔ یہ جس اساس پر بھی اپنی اجتماعی زندگی کی تشکیل کرلیں اور جس شرع و آئین کو بھی اختیار کرلیں ان کی اسلامیت کسی حال میں بھی ان سے جُدا نہیں ہوسکتی۔ ترکی نے پرسنل لا سوئٹزرلینڈ سے، تعزیرات اٹلی سے اور قانونِ تجارت جرمنی سے مستعار لے لیا۔ تاہم اس کا ایک اہم ترین اسلامی حکومت ہونا مسلم رہا اور جن لوگوں کے ہاتھوں یہ کارنامے انجام پائے وہ دین کے غازی، مجاہد اور محسنِ اعظم سب کچھ سمجھے جاتے ہیں۔

اسی نقطۂ نظر کا غلبہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمان سمجھتے ہیں کہ اگر انھوں نے چند مخصوص دائرے ایسے بنالیے ہیں جن میں مسلمانوں کی اکثریت حکومت کی مشینری اور مجالس قانون سازی میں حاوی رہی اور اجتماعی اور معاشرتی امور میں انہیں اپنے رنگ کو چمکانے کا موقع ملا تو یہ دائرے پاکستان بن جائیں گے اگرچہ حکومت کا نظام کسی جاہلی نظام کی نقالی ہی اور اگرچہ نہ مجالس قانون سازی میں اللہ کی کتاب کو کوئی درخور حاصل ہوا اور نہ ثقافتی اور تہذیبی دائروں میں دین کا کوئی دخل ہو۔ یہود اور مشرکین کے ادعائے پاکی و برتری (یزکون انفسھم) کو قرآن نے ان کے اقسامِ شرک میں گنایا تھا۔ اس کی تفسیر حال کے مسلمانوں نے کتنی خوبی کے ساتھ سمجھا دی ہے۔ وہ خدا کے محبوبوں کی اولاد اور افضل امت تھے اس لیے سمجھنے لگ گئے تھے کہ وہ جو کچھ کر گزریں وہ آپ سے آپ محبوب و مطبوع ہو جاتا ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ ہدی اللہ اور کتاب اللہ کے مطابق بھی ہو۔ اسی طرح مسلمان سمجھنے لگ گئے ہیں کہ وہ خیر الامم ہیں اس لیے ان کا ہر کام بہتر اور پاک ہے، خواہ اسے شریعت سے کوئی لگاؤ ہو یا نہ ہو۔ وہ جس سرزمین کو اپنا مستقر بنالیں وہ پاک ہے، ان کی اکثریت جو قانون وضع کردے وہ خدا کا قانون

ہے، وہ جو پالش مسلمانوں کے چہروں کے لیے تیار کر دیں وہ صبغۃ اللہ ہے اور اس راہ میں جو ان کی قیادت کرے وہ قائد اعظم ہے ؎

رند جو ظرف اٹھا لیں وہی ساغر بن جائے
جس جگہ بیٹھ کے پی لیں وہی میخانہ بنے

گویا مسلمان نامی گروہ میں ہونا ہی راہ یاب ہو جانا ہے اگرچہ زندگی خدا سے بغاوت اور نافرمانیوں ہی میں گزرے۔ یہ حلقہ بجائے خود خدا سے نافرمانی کے لیے امن ہے۔ جو اس سے باہر ہیں وہ دوزخی اور جہنمی ہیں، لیکن جو اس کے اندر ہیں وہ عبد کے بجائے طاغوت بن کر بھی خدا کی رحمت کے حق دار ہیں۔ حضرت صادق مصدوق علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ تم اپنے اگلوں (یہود) کے ہر نقش قدم کی پیروی کرو گے، غور کیجیے مسلمانوں کی اس ذہنیت اور کُونُوا هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ تَهْتَدُوا[1] الآیہ اور لَن تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّامًا مَّعْدُودَةً[2] کی ذہنیت میں کیسا حیرت انگیز تشابہ ہے۔

قرآن نے یہود اور منافقین کی طاغوت پرستی اور حمایت شرک کو بھی شرک قرار دیا ہے یہود کی طاغوت پرستی یہ تھی کہ وہ ایسے لیڈروں کی پیروی کرتے تھے جو اللہ کی ہدایت کی جگہ لوگوں سے اپنی ہوائے نفس کی پیروی کراتے تھے۔ مسلمانوں کا بھی یہی حال ہے۔ ان میں کتنے ہیں جو آج ایسے ہی لیڈروں کی پیروی کر رہے ہیں جو ان سے اپنے ہوائے نفس کی پیروی کرا رہے ہیں۔ کتاب اللہ اور سنت رسول کی اطاعت کے وہ داعی ہیں، نہ ان سے واقف ہیں، نہ ان پر عامل ہیں کتنے سادہ لوح ایسے ہیں جو برملا کہتے ہیں کہ ان کا راستہ اللہ اور رسول کا راستہ نہ

---

[1] یہودی یا نصرانی بن جاؤ راہ یاب ہو جاؤ گے۔

[2] ہم کو تو جہنم کی آگ صرف چند دن چھوئے گی۔

سہی لیکن ان کے اندر مسلمانوں کی خیر خواہی کا جذبہ تو ہے۔ طاغوت بننے کی اس سے زیادہ بری مثال اور کیا ہو سکتی ہے کہ آج مسلمانوں کو اللہ، اس کے دین اور اس کے رسول کی خیر خواہی سے زیادہ خود اپنی خیر خواہی مطلوب ہے۔ اگر ان کی اپنی بات بنتی ہے تو کچھ پروا نہیں گو خدا کی بات بگڑ جائے۔ اگر ایک شخص ان کو ایک ایسی راہ پر لیے جا رہا ہے جس میں ان کو اپنے غرور کا سر اونچا نظر آتا ہے تو دین کا جھنڈا سرنگوں ہو جائے تو کچھ غم نہیں۔ اللہ اکبر، کیسے شدید فتنہ کا زمانہ ہے کہ مسلمان خدا کی عبدیت سے نکل کر بھی اپنے مسلمان ہونے کا مدعی ہے اور ان لوگوں کو وہ اپنا بہترین خیر خواہ سمجھتا ہے جو کھلم کھلا اس کو اللہ کے دین کے سوا کسی اور راستہ پر لے جا رہے ہیں۔

منافقین کی طاغوت پرستی یہ تھی کہ وہ اپنے بعض معاملات یہود کی عدالتوں میں لے جاتے تھے۔ اللہ اور اس کے رسول کی عدالت میں نہیں لاتے تھے۔ یہاں یہ حال ہے کہ زندگی کے ہر شعبہ پر طاغوت کا غلبہ ہے۔ عدالتیں طاغوتی ہیں اور مسلمان ہر طرح کے معاملات میں ان ہی سے رجوع کرتے ہیں۔ درس گاہیں طاغوتی ہیں اور مسلمانوں کا بڑا طبقہ اپنے بچوں کو ان ہی کے حوالہ کرتا ہے۔ نظام حکومت طاغوتی ہے اور مسلمان نہ صرف اس کے کل پرزے بنے ہوئے ہیں بلکہ اس کے اندر ترقی درجات کے لیے مقابلہ کرتے ہیں اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ تہذیب طاغوتی ہے اور مسلمان اس غازۂ جمال کو لیپنے میں بھی سب سے زیادہ مصرف ہیں۔ نظامِ معاش و معیشت طاغوتی ہے اور مسلمان اس کو اپنانے میں بھی پیش پیش ہے۔ ادب اور آرٹ طاغوتی ہے اور مسلمان اس میں بھی اپنے حصہ کے لیے بے قرار ہے اور شاید گنتی کے نفوس ہوں گے جو ان چیزوں کے اندر کوئی قباحت محسوس کرتے ہیں۔

اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ شرک کی حمایت و تائید بھی شرک ہے لیکن یہاں کتنے مسلمان ہیں جو اپنے ذہن و دماغ اور اعضاء و جوارح کی ساری قوتیں ایک طاغوتی نظام و تمدن کی کامیابی و ترقی میں صرف کر رہے ہیں۔ کتنے ہیں جو اپنے مال سے اس کی سربلندی اور استحکام میں ساعی ہیں۔ کتنے ہیں جو اس کلمہ کفر کے اعلاء کی راہ میں اپنی جانیں تک قربان کر رہے ہیں۔

اسلامی احکام و تعلیمات کے خلاف منافقین کی سرگوشیوں اور اہل ایمان کے طریقہ کے خلاف ان کی خود رائیوں کو بھی قرآن نے شرک قرار دیا ہے لیکن آج کتنے مسلمان ہیں جو اللہ و رسول کے احکام کے خلاف صرف نجوٰی پر قانع نہیں ہیں بلکہ علانیہ ان کا مذاق اڑاتے ہیں، شریعت کے احکام کو فرسودہ ناقابل عمل اور خلاف عقل و تہذیب قرار دیتے ہیں۔ اسلامی تعزیرات اور اسلامی نظام معاش و معیشت کو صرف ساڑھے تیرہ سو برس پہلے کے حالات کے لیے سازگار بتاتے ہیں۔ قرآن کی عقلیت کو بہتیرے زمانہ کے معیار سے فروتر سمجھتے ہیں اور اپنی زندگی کے ہر شعبہ میں، خواہ وہ ظاہر سے متعلق ہو یا باطن سے، اس جادہ سے منحرف ہیں جو اللہ اور اس کے رسول نے اہل ایمان کے لیے متعین کیا ہے۔ ان کا فکر غیر اسلامی ہے ان کی معاشرت غیر اسلامی ہے۔ ان کی تعلیم و تربیت غیر اسلامی ہے۔ ان کا معیار رد و قبول غیر اسلامی ہے۔ جو چیز اللہ و رسول کے ہاں مطلوب ہے ان کے ہاں مبغوض و مہجور ہے۔ جو اللہ و رسول کے نزدیک مبغوض و مردود ہے وہ ان کے ہاں مطلوب و مقبول ہے۔ انھوں نے یا تو اپنے نفس کو الٰہ بنا رکھا ہے یا ان لوگوں کو الٰہ بنا رکھا ہے جن کی تعلیم و تہذیب سے وہ مرعوب ہیں۔ اسلام کے ساتھ ان کی نسبت صرف اس قدر ہے کہ وہ ان تمام باتوں کے باوجود اپنے تئیں مسلمان بھی کہتے ہیں۔

منافقین کی مفاد پرستی کو بھی شرک قرار دیا گیا۔ آج کتنے مسلمان ہیں جو اللہ کی

بندگی کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن وہ بالکل ومن الناس من یعبد اللہ علیٰ حرف کی تصویر ہیں۔ جس حد تک اسلام کے اقرار اور اس کی پیروی میں کوئی خرخشہ نہیں ہے اس حد تک وہ مسلمان ہیں لیکن جہاں سے اسلام کے وہ مطالبات شروع ہوتے ہیں جن سے ان کے کسی دنیوی مفاد کو نقصان پہنچتا نظر آتا ہے یا زندگی کو آزمائشوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے وہیں سے وہ کٹ کے الگ ہو جاتے ہیں۔ انھوں نے اپنے آپ کو پورے طور پر اللہ اور رسول کے حوالے نہیں کیا ہے۔ وہ رسول کو صرف اعتقاد کے حد تک رسول مان لینا کافی سمجھتے ہیں۔ اس کی لائی ہوئی تعلیم اور اس کی بخشی ہوئی ہدایت کا زندگی کے ہر شعبہ میں واجب الاطاعت ہونا ان کے نزدیک توحید اور ایمان بالرسالت کا جزو نہیں ہے۔ حالانکہ ہر رسول اعبدوا اللہ (اللہ کی بندگی کرو) کے ساتھ واطیعون (اور میری اطاعت کرو) کا بھی حکم دیتا ہے اور یہ بھی واضح کر دیتا ہے کہ جو میرے طریقہ کے خلاف ہیں ان سے بغاوت کرو ولا تطیعوا امر المسرفین

یہی وہ نقطہ ہے جہاں سے کفر و اسلام کی اصلی نزاع شروع ہوتی ہے، ورنہ مجرد اس اعتقاد میں کہ اللہ ایک ہے۔ رسول، اللہ کے بھیجے ہوئے ہیں، ہم اللہ، اس کے فرشتوں، اس کے نبیوں اور اس کی کتابوں اور آخرت پر ایمان لاتے ہیں، ایسی کیا بات ہے جس پر گردنیں کٹیں، تلواریں چمکیں اور ہجرت، جہاد اور قتال کے مرحلے پیش آئیں؟ عرب میں آنحضرت صلعم سے پہلے ایسے لوگ موجود تھے جو بت پرستی کے کھلم کھلا منکر تھے اور ان میں بعض مشہور خطیب بھی تھے جو علانیہ اپنے خطبوں میں توحید کا ذکر کرتے تھے لیکن قریش کو ان سے کوئی خاص پرخاش نہ تھی۔ پس کوئی وجہ نہیں ہے کہ وہ آنحضرت صلعم سے مجرد اس بات پر لڑائی کرتے کہ وہ اپنے آپ کو اللہ کا رسول سمجھتے ہیں اور بتوں کے مخالف ہیں۔ ان کی ساری لڑائی تو اسی بات پر تھی کہ یہ خدا کی اطاعت کو اس کی بندگی کا ضروری جز قرار دیتے ہیں اور اس اطاعت

کا راستہ اپنی اطاعت بناتے ہیں اور ہم سے بغاوت اس کی شرط لازم قرار دیتے ہیں۔

دین کا یہی حصہ ہے جو پرائیویٹ نہیں ہو سکتا اور جو لازماً اپنے پیرؤوں سے اپنی اقامت کے لیے سرفروشی اور جانبازی کا مطالبہ کرتا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ تھی کہ اہلِ عرب اپنے اندر دینِ حنیفی کے پیرؤوں کو برداشت کر سکے۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کو گوارا نہ کر سکے۔ پس جو مسلمان اپنے ایمان باللہ و ایمان بالرسول کے ساتھ دوسرے دینوں کی اطاعت جمع کر لینے میں شرک کا کوئی شائبہ نہیں پاتے، جن کا دین کوبے میں ایک مسجد اور لندن میں ایک قبرستان سے زیادہ کا طلب گار نہیں ہے، جن کے لا الٰہ کی زد صرف مردہ خداؤں ہی پر پڑتی ہے زندہ خداؤں کو اس سے کوئی ضرر نہیں پہنچتا ہے۔ انھیں اطمینان رکھنا چاہیے کہ ان کے لیے نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام دنیا دار الامن ہے۔ ایسی بے دھار کی تلوار سے نہ عرب جاہلیت کو کچھ اندیشہ ہو سکتا تھا نہ جاہلیت جدیدہ کو اس سے کوئی اندیشہ ہو سکتا ہے اور اگر جاہل عربوں کو اس سے کچھ چڑھ تھی بھی تو موجودہ زمانہ کے متمدن انسان کو اس بے دہانہ کی توپ اور اس ڈاٹنا بندوق کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ وہ اس بات پر راضی ہے کہ پوجا جس کی چاہے ہوتی رہے البتہ اطاعت صرف اُسی کی کی جائے۔

---

# ۷۔ وقت کا اصلی فرض

## اور

# بعض شبہات کا ازالہ

جو چیزیں شرک ہیں یا جن چیزوں میں شرک کا کوئی ادنیٰ شائبہ بھی ہے ان کے ساتھ ایک مسلمان کا فطری تعلق وصل کا نہیں فصل کا ہے۔ دوستی کا نہیں دشمنی کا ہے۔ محبت کا نہیں عداوت کا ہے۔ حمایت و نصرت کا نہیں نفرت اور بغاوت کا ہے۔ مسلمان کا فرض ہے کہ اگر اس کے پاس طاقت ہے تو طاقت سے اس کو مٹا دے۔ اگر طاقت نہیں ہے تو زبان سے اس کے خلاف آواز بلند کرے۔ اگر اس کی قدرت بھی اس کو حاصل نہیں ہے تو دل میں اس سے بغض و نفرت رکھے اس سے نیچے عزم و ایمان کا کوئی درجہ نہیں ہے۔

پچھلی فصل میں مسلمانوں کی جو حالت بیان ہوئی ہے اس سے واضح ہے کہ ان کی اکثریت کا حال اس کے بالکل برعکس ہے۔ مسلمان نہ صرف عزم اور ایمان کے آخری درجہ سے گرتے جا رہے ہیں بلکہ ان کے اوپر آہستہ آہستہ شرکیہ اعمال و عقائد کی تہیں جمتی جا رہی ہیں۔ اور اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ ایک مدت سے کسی صحیح دینی نظام کے موجود نہ ہوئے اور طاغوت کے غلبہ کی وجہ سے توحید اور اس کے مقتضیات کا صحیح شعور ان میں غائب ہوتا جا رہا ہے۔ پس وقت کا اصلی فرض یہ ہے کہ ایک ایسی صالح و مصلح جماعت کھڑی ہو جو مسلمانوں میں توحید صحیح شعور پیدا کرے۔ جو لوگوں کو عبادت اور عبدیت کا اصلی مفہوم بتائے جو

خدا کی حاکمیت اور رسول کے مطاع ہونے کا لوگوں کو مطلب سمجھائے، جو دنیا پر واضح کر دے کہ اسلام اور ایمان کے مقتضیات و لوازم کیا ہیں۔ جو خدا کی زمین پر اس فرض کو انجام دے جو بحکم خداوندی وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا[1]۔ رسول خاتم صلعم کی امت پر عائد ہوتا ہے۔ جو خلق خدا کو خدا کی وہ امانت ادا کر دے جس کے ادا نہ کرنے کی وجہ سے یہود ملعون ہوئے۔ لَوْلَا يَنْهٰهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ بِمَا اسْتُحْفِظُوْا[2] (الایۃ) اور جو اللہ تعالیٰ کے اس منشا کو پورا کرے جس کی تکمیل کے لیے اس نے بار بار اپنے انبیاء مبعوث فرمائے اور جس کے لیے کتنی قوموں کو اس نے معزول اور کتنی امتوں کو مامور فرمایا۔ وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ[3]۔

یہ جماعت تنہا زبان و قلم سے نہیں بلکہ اپنے عمل سے خدا کی توحید کی شہادت دے۔ یہ دنیا کو اللہ کے رنگ میں رنگنے کے لیے اٹھے اور خود اس رنگ میں رنگی ہوئی ہو۔ قوم و وطن کی ساری عصبیتیں اور نسل و خاندان کی ساری بندشیں اس نے توڑ ڈالی ہوں۔ کسی خاص قوم کی سیاسی برتری، عددی اکثریت اور معاشی فوقیت کی کوئی ادنیٰ خواہش بھی اس کے دل کے کسی گوشہ میں چھپی ہوئی نہ ہو۔ اس کی ساری جدوجہد کا مقصود صرف اللہ کا کلمہ اور اس کے رسولوں کی دعوت کو بلند کرنا ہو۔ اس کی دشمنی دنیا کے کسی ایک ہی باطل سے نہ ہو بلکہ دنیا کے ہر باطل اور زمین کے

---

[1] اسی طرح ہم نے تم کو ایک بیچ کی امت بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہی دو اور رسول تم پر گواہی دے۔ [2] ان کو علماء و فقہاء کیوں نہیں روکتے جب کہ وہ کتاب الٰہی کے امین بنائے گئے۔ [3] اور چاہیے کہ تم میں سے ایک گروہ ہو جو بھلائی کی دعوت دے۔ معروف کا حکم کرے اور منکر سے روکے۔

ہر فساد سے ہو۔ اس کی ضرب بیک وقت ہر جاہلی اور طاغوتی نظام پر پڑے، یہاں تک کہ وہ طاغوت بھی اس سے کسی چشم پوشی اور رعایت کا امیدوار نہ ہو جو اس قوم کے اندر ہو، جس کے اندر سے وہ خود اٹھی ہو۔ وہ باطل کو ایک ایک کر کے الگ کرے اور حق کا ایک ایک کر کے انتخاب کرے اور حق کے لیے اپنی دوستی کا اور باطل کے لیے اپنی دشمنی کا اعلان کر دے۔ اس راہ میں اپنی ساری آرزوؤں، ساری تمناؤں، ساری دوستیوں اور تمام رشتوں اور ناطوں کو قطع کر لے اور جو کچھ اس کے صلہ میں اللہ کے پاس ہے اس پر قانع ہو جائے۔ اس کی دعوت ساری خدائی کے لیے یکساں اور عام ہو۔ اس کی جھولی کی روٹی اور اس کی چھاگل کے پانی میں ہر بھوکے اور پیاسے کے لیے آسودگی اور سیرابی ہو۔ اس کا چراغ پہاڑی کے چراغ کی طرح چمکے اور ہر گم گشتہ راہ کی رہنمائی کے لیے اشارہ کرے۔ اس کی ہدایت کی ضیا پاشیاں خدا کے سورج کی طرح عام و ہمہ گیر ہوں۔ اس کا ابر کرم آسمان کی بارش کی طرح ہر دشت و جبل کو سیراب کرے۔ اس کی گفتگو ہر بولی میں اس کی مخاطب تمام نسلِ انسانی ہو۔ وہ چیخ چیخ کے پکارے اور لپٹ لپٹ کر سمجھائے اور نوعِ انسانی کی رُوحانی بیماریاں اس کو اس درجہ بے قرار کر دیں کہ وہ خلوت کے سجدوں میں اس کی نجات کے لیے پھوٹ پھوٹ کے روئے۔ اس کی راتیں بستر کی لذتوں سے محروم ہو جائیں اور اس کے دن فراغت کی گھڑیوں سے بے نصیب ہو جائیں۔ وہ مخلوق خدا کی گردن میں اتنے بے شمار ارباب و آلہہ کی غلامی کا بوجھل طوق دیکھ کر دکھ اور درد سے بھر جائے اور ہر سننے والے کان اور ہر دیکھنے والی آنکھ تک اللہ کی وہ دعوت قولاً و عملاً پہنچا دے جو ان تمام مصائب کا واحد علاج ہے۔

ایک ایسی بے ہمہ و باہمہ جماعت اپنے مقصد میں ناکامیاب نہیں ہو سکتی

طاغوت کے ہمہ گیر غلبہ کے باوجود انسان کی فطرت مردہ نہیں ہوگئی ہے۔ خدا کے کتنے بندے ایسے ہیں جن کے دلوں میں توحید اور اس کے لوازم کا شعور آج بھی زندہ ہے لیکن ان کے اندر وہ عزم و ہمت نہیں ہے جو انھیں وقت کے حالات سے پیکار کے لیے بے چین کردے۔ وہ امرِ حق کو قبول کرنے کے لیے کسی دلیل و برہان کے منتظر نہیں ہیں۔ ان کو صرف اس بات کی ضرورت ہے کہ خدا کا کوئی مخلص بندہ حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃ کی آواز بلند کردے اور اپنے عزمِ راسخ اور حسنِ نیت سے ان کو یقین دلادے کہ وہ جو کچھ کہتا ہے وہی چاہتا بھی ہے۔ جوں ہی یہ حقیقت ان کے سامنے روشن ہوجائے گی وہ اپنی غفلت کے بستروں کو تہ کرکے اور علائق کی ساری زنجیروں کو توڑ کر اس کے ساتھ ہولیں گے۔

کتنے ایسے ہیں جن میں شرک سے پوری پوری بیزاری موجود ہے لیکن توحید کے تمام مقتضیات و لوازم کا ان کو پورا علم نہیں ہے۔ انھوں نے انسان کی عبدیت، خدا کی حاکمیت، رسول کی رسالت اور اسلام و ایمان کا حقیقی مفہوم اچھی طرح نہیں سمجھا ہے۔ مذہب کا مطالعہ یا تو انھوں نے کیا نہیں ہے یا کیا ہے تو مجتہدانہ بصیرت کے ساتھ نہیں کیا ہے۔ اس وجہ سے وہ اپنی موجودہ زندگی کو خدا کے راستہ سے الگ نہیں سمجھتے اور اگر سمجھتے ہیں تو کم از کم اس علیحدگی کی اصلی نوعیت ان کے سامنے نہیں ہے۔ وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ اگرچہ انھوں نے خدا کے راستہ سے کچھ الگ ہوکر ایک راہ ضرور نکال لی ہے لیکن یہ انفصال ایسا نہیں کہ پھر اتصال ناممکن ہوجائے۔ وہ جونہی محسوس کریں گے کہ یہ دو مستقل خط دو مختلف سمتوں میں بڑھ رہے ہیں اور جس قدر آگے بڑھتے جائیں گے۔ ایک دوسرے سے ان کی دوری بڑھتی ہی جائے گی، یہاں تک کہ آخرت میں پہنچ کر وہ "اضل سبیلا" کے حکم میں ہوجائیں، وہ فوراً اپنی پوزیشن پر غور کریں گے اور ان کی بڑی تعداد ان شاء اللہ

حق کا ساتھ دے گی۔

بہت سے لوگ ایسے ہیں جو حق کو حق سمجھنے میں غبی نہیں ہیں لیکن اپنی مشکلات کا اندازہ کرنے میں غبی واقع ہوئے ہیں۔ وہ صحیح دعوت کے ذریعہ سے خدا اور اس کی اعلیٰ صفتوں کا علم جتنا پاتے جائیں گے اپنے نفس کی زنجیروں سے اسی قدر چھوٹتے جائیں گے۔ یہاں تک کہ ان میں اللہ کے کتنے بندے ایسے نکل آئیں گے جو روح کو جسم پر، ایمان کو پیٹ و تن پر اور خدا اور اس کی بندگی کو دنیا اور اس کی جھوٹی عزتوں اور نمائشوں پر ترجیح دیں گے اور صرف خدا ہی کے راستہ میں ان کو سلامتی نظر آئے گی۔ اور جو زیادہ پست ہمت ہوں گے ان میں اہل حق کی ایک جماعت کے عملی مظاہرے سے ہمت و قوت پیدا ہو گی۔ وہ جب دیکھیں گے کہ اس آسمان کے نیچے خدا کے ایسے بندے بھی ہیں جنھوں نے اپنے خالق کی بندگی کی راہ میں جھوٹی عزتوں پر لات ماری ہے، دنیا کو ٹھکرایا ہے، طاغوت سے سرکشی کی ہے، اپنے دنیاوی مفاد اور اپنے اہل و عیال کے لیے ہر خطرہ کو دعوت دے رہی ہے، تو ان کے ضمیر میں بھی قوت پیدا ہو گی۔ وہ بھی اپنے بازوؤں کی قوت اور اپنے پروں کی قوت پرواز کی آزمائش کریں گے۔

چونکہ اس جماعت پر کسی خاص قومیت کا لیبل چپکا ہوا نہ ہو گا بلکہ اس کا تمام تر رشتہ صرف اللہ کے دین اور اس کے اصولوں سے ہی ہو گا۔ اس لیے خدا کا ہر بندہ اس کی دعوت پر مجرد اس دعوت کی صفات کے لحاظ سے غور کرے گا۔ اس کو کسی قوم کی عددی اکثریت یا سیاسی برتری کی جد و جہد سمجھ کر اس سے بدگمان نہ ہو گا اور یہ حقیقت جس رفتار کے ساتھ نمایاں ہوتی جائے گی اسی رفتار سے اس دعوت کی مقبولیت بڑھتی جائے گی۔ ایک عیسائی، ایک انگریز، ایک جرمن، ایک اطالوی، ایک ہندو، ایک جین، ایک بدھ سب اس پر مجرد اس پہلو

سے غور کریں گے کہ اس دعوت کی عقلی قدر و قیمت کیا ہے؟ اس کا اخلاقی معیار کیا ہے؟ معاشی اور سیاسی نقطۂ نظر سے اس کا درجہ کیا ہے؟ دنیا کے تمام آزمائے ہوئے طریقوں اور دینوں میں اس کو کیا امتیاز حاصل ہے اور کس حد تک یہ دنیا کی مشکلات کا علاج ہے؟ یہ چیز دفعتہً اسلام کو ایک متحرک چیز بنا دے گی اور جو چیز ایک بند تالاب کے پانی کی طرح ساکن و جامد ہے وہ ایک سیلاب کے جوش و طوفان کی طرح ہر پست و بلند پر چھا جائے گی۔

اس جماعت کی دعوت اس مفروضہ سے نہیں شروع ہو گی کہ ہندوستان میں ۱۰ کروڑ بنے بنائے مسلمان موجود ہیں۔ ان کو ۱۲ یا ۱۶ کروڑ کی تعداد تک پہنچانا چاہیے بلکہ وہ ان مسلمانوں کے درمیان ان کے عقائد و اعمال کی بنا پر فرق کرے گی۔ لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ اس کی دعوت یاایھا المشرکون وحدوا اللہ (اے مشرکو، اللہ کو ایک مانو) یاایھا الکفرون امنوا باللہ (اے کافرو، اللہ پر ایمان لاؤ) سے شروع ہو گی۔ جو لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں وہ اس طریق دعوت سے بالکل ناواقف ہیں جو حضرات انبیاء کرام علیہم السلام سے ماخوذ ہے اور جس کی سب سے زیادہ مکمل تصویر خود قرآن پاک میں موجود ہے۔

قرآنی دعوت کے تدریجی مراحل پر جن لوگوں کی نظر ہے وہ جانتے ہیں کہ جب آنحضرت صلعم کی بعثت ہوئی تو باوجودیکہ آپ کی پوری قوم کافر و مشرک تھی لیکن آپ نے دعوت کا آغاز "اے کافرو" اور "اے مشرکو" کے الفاظ سے نہیں کیا تو پھر ان لوگوں کو جو آپ کے امتی ہیں ان لوگوں نے اندر جو پشتہا پشت سے مسلمان ہیں اور نہیں معلوم ان میں کتنی عظیم تعداد بندگان حق کی ہے، یہ حق کیسے حاصل ہو سکتا ہے کہ وہ ان کو کافر یا مشرک فرض کر کے اپنی دعوت کا آغاز کریں۔ آنحضرت صلعم نے دعوت حق کا آغاز "اے میری قوم، اے لوگو، اے انسانو" سے کیا۔ اور

پہلے لوگوں کے اندر ان کے اصولی مسلمات کے مقتضیات و لوازم کا احساس بیدار کیا اور کفر و شرک کے قبیل کی جو باتیں ان کے اندر پیدا ہو گئی تھیں ان کا کفر و شرک ہونا واضح کیا۔ یہ کام جب تک اللہ تعالیٰ نے چاہا جاری رہا یہاں تک کہ قوم پر اللہ کی حجت تمام ہو گئی۔ جن لوگوں کے اندر صلاحیت قوی تھی وہ رفتہ رفتہ حق کے ساتھ ہو گئے اور جن کے قلوب مردہ ہو گئے تھے یا جن کے حجابات سخت تھے انھوں نے نہ صرف یہ کہ خود اپنی زبان سے اپنے کفر کا اعلان کر دیا بلکہ آنحضرت صلعم کے قتل کا ارادہ کر لیا۔ اس وقت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو ہجرت کا حکم ہوا اور یہ پہلا موقع ہے کہ آپ کی زبان سے اپنی قوم کے لیے اے کافرو کا لفظ نکلا جو ہجرت و برأت کی عظیم الشان سورہ قُلْ یٰاَیُّهَا الْکٰفِرُوْنَ میں ہے۔ اس سے پہلے قرآن میں ہم کو آنحضرت صلعم کی طرف سے اپنی قوم کے لیے یہ خطاب نہیں ملتا۔ اسی طرح مشرکین کا لفظ بھی اہل مکہ کے لیے بالکل ہجرت کے وقت یا اس کے بعد استعمال ہوا ہے۔

علیٰ ہذا القیاس اہل کتاب کو جو دعوت دی گئی وہ بھی اے کافرو اور اے مشرکو سے نہیں شروع ہوئی بلکہ اے اہل کتاب اور اے لوگو سے شروع ہوئی اور جب تک ان پر ان کے مسلمات کے تمام مقتضیات پوری طرح واضح نہیں کر دیے گئے اور نبی اور ایک صالح جماعت کی ایک طویل جد و جہد نے ان کے لیے حق کی توضیح اور اتمام حجت کا فرض ادا نہیں کر دیا اس وقت تک نہ ان کے کفر و شرک کا اعلان ہوا اور نہ ان سے جنگ و قتال کی نوبت آئی۔

بالکل یہی معاملہ منافقین کے ساتھ ہوا۔ یہ لوگ اسلام کے تمام اصولوں کے ظاہری طور پر ماننے والے تھے اس لیے قرآن نے ان کو ہمیشہ اے ایمان والو، کہہ کر خطاب کیا اور ان کے سامنے ایمان، اسلام، توحید اور ایمان بالرسالت کے مقتضیات کی

تشریح فرمائی تاکہ جو لوگ غفلت اور جہالت کی وجہ سے غلطیاں کر رہے ہیں وہ متنبہ ہو جائیں۔ اس کے بعد ان کو دھمکی دی کہ جو لوگ اپنی شرارتوں اور بدعہدیوں سے باز نہ آئیں گے ان کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا جائے گا۔ غزوہ بدر کے زمانہ سے لے کر غزوہ تبوک تک ضعفائے قلوب اور منافقین کے بارہ میں یہی روش رہی۔ اس بیچ میں اگر کبھی پرجوش مسلمانوں سے اس کا اندیشہ ہوا کہ وہ ان کے بارہ میں سختی کی روش اختیار کر لیں گے تو انھیں اس سے روکا گیا۔ قرآن اور احادیث دونوں میں اس کی شہادتیں موجود ہیں۔ اس طرح جو لوگ متنبہ ہو گئے اور انھوں نے اپنے معاملہ کی اصلاح کر لی وہ مسلمان اور خادمِ اسلام سمجھے گئے لیکن جو لوگ ان تنبیہات کے بعد بھی اپنی حرکتوں سے باز نہ آئے ان کا راز طشت از بام کر دیا گیا اور ان کے معاملہ کا فیصلہ کر دیا گیا۔

آنحضرت صلعم نے یہ طریقہ جو اختیار فرمایا تو یہ محض نفسیاتِ تبلیغ و دعوت کی کوئی جھوٹی نمائش نہیں تھی بلکہ یہ بات ایک نہایت اہم اصل پر مبنی ہے جس سے لوگ بالعموم اس عہد میں ناواقف ہیں۔ ایک شے اگر کفر یا شرک یا نفاق ہے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کا مرتکب کافر یا مشرک یا منافق ہو جائے۔ ایک حرام شے کا کھانے والا لازماً حرام خور یا فاسق ہی نہیں ہو جاتا۔ ممکن ہے اس کو اس کی حرمت کا علم نہ ہو، ممکن ہے اس کی حالت مجبوری اور اضطرار کی ہو، ممکن ہے وہ تاویل کی کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو گیا ہو، ممکن ہے کوئی اور بات ہو۔ بالخصوص انبیاء کے فترہ کے زمانہ میں ایک طویل مدت تک دعوتِ حق کا کاروبار معطل رہنے کی وجہ سے ایک ایسی اندھیاری چھا جاتی ہے کہ آنکھ والوں کو بھی راہ سوجھائی نہیں دیتی چہ جائے کہ عوام کالانعام۔ ایسے زمانوں کا فطری تقاضا یہ ہوتا ہے کہ جو نبی آتا ہے وہ کفر، شرک، یا نفاق کے الگ الگ ٹھپے لے کر نہیں آتا کہ جس اللہ کے بندے پر

جو ڈھیہ چپاں ہوجائے، اس پر وہ ڈھپہ چپاں کرتا چلا جائے کہ تو کافر ہے، تو منافق ہے اور تو مشرک ہو گیا ہے بلکہ وہ دینِ حق کے آثار اجاگر کرتا ہے، اٹے ہوئے نشاناتِ راہ کو نمایاں کرتا ہے، بند راہوں کو کھولتا ہے اور ایک مستقل جدوجہد، ایک مسلسل جہاد اور ایک پاک اور بے داغ زندگی کی بے لوث کارگزاریوں سے حق کو نورِ صبح کی طرح نمایاں کر دیتا ہے۔ اس جدوجہد سے قوم کے اندر سے صالح الفطرت انسانوں کا عطر کھنچ کر علیحدہ ہو جاتا ہے اور ان کا امتیازی وجود حق کے حق ہونے اور باطل کے باطل ہونے کا ایک اور عملی ثبوت ہوتا ہے۔ اس وقت جن کے اندر شعورِ حق کی کچھ بھی صلاحیت ہوتی ہے وہ آنکھوں سے دیکھ لیتے ہیں کہ خدا کا راستہ یہ ہے اور اس پر چلنا ممکن بھی ہے۔ تب ان لوگوں کے کفر کا فیصلہ ہو جاتا ہے جو اس راہ کو اختیار کرنے سے انکار کر دیتے ہیں اور اس کے بعد ان کا فیصلہ کر دینے کے لیے یا تو اللہ کا عذاب نمودار ہوتا ہے یا اہلِ حق کی تلوار چمکتی ہے۔ حضرات انبیاء کرام کی زندگی سے ہمیں یہی سبق ملتا ہے۔

آج جو لوگ تجدید دین و احیائے سنت کے مبارک عزم کے ساتھ اُٹھیں گے وہ اسی طریقۂ نبوت سے رہنمائی حاصل کریں گے۔ ظاہر ہے کہ اس امت کو اب کسی نبی کی بعثت کا انتظار نہیں ہے۔ اس کے اندر اقامتِ دین و تجدید دین کا شرعی نظام طریقہ نبوی پر کام کرنے والی خلافت کا نظام ہے۔ وہی نظام تھا جو مسلمانوں کو وسط راہ پر قائم رکھتا اور پھر وہی خلق خدا پر اللہ کی حجت تمام کرتا ہے۔ لیکن یہ نظام ایک مدت سے درہم برہم ہو چکا ہے۔ اس کی جگہ ایک طاغوتی نظام کا قبضہ و تسلط ہے۔ اس نظام نے مسلمانوں کی زندگی کے ہر شعبہ کو نجس کر دیا ہے۔ کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جو اس طاغوت کی ماتحتی سے آزاد ہو۔ ہمارے اندر سے جو لوگ طوعاً اس کی اطاعت نہیں کر رہے ہیں انھیں کرہاً اس کی اطاعت کرنی پڑ رہی ہے متقی

سے متقی انسان کا دامن بھی اس کی نجاست کے چھینٹوں سے پاک نہیں ہے۔ دینی تعلیم و تربیت کا سارا انظام معطل ہے جو موجود ہے وہ بھی نظامِ غالب کی سطوت سے اسی کا خادم و چاکر ہے۔ قلم و زبان کلمۂ حق کے سوا ہر خرافات کے لیے آزاد ہے، دین و مذہب کے نام سے آج جو کچھ لکھا یا سنایا جا رہا ہے اس کا بڑا حصہ موجودہ سوسائٹی اور موجودہ نظامِ جاہلی کے لیے مذہب کی طرف سے ایک لائسنس ہے۔

ایسے پر آشوب و پرفتن عہد میں اگر مسلمان دین اور اس کے لوازم، توحید اور اس کے مقتضیات سے ناآشنا ہو جائیں تو کچھ بعید نہیں ہے۔ ایک چمن اگر مالیوں کی نگہداشت سے محروم ہو گیا ہو یا جو اس کے مالی ہوں ایک مدت سے اس کی صفائی، اس کے درختوں کی کانٹ چھانٹ، اس کی خودرو گھاسوں کے استیصال، اس کے ننھے پودوں کی دیکھ بھال کے بجائے جنگلی گھاسوں اور درختوں ہی کو چمن کے اصلی پودے سمجھ کر انہی کو پانی دینے اور انہی کی تربیت کرنے لگ گئے ہوں تو اس چمن کا جنگل بن جانا ایک قدرتی بات ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فرض کی صحیح مثال یہی ہے۔ وہ ایک قدرتی فرض ہے جو ایک کسان اپنے کھیت میں، ایک مالی اپنے چمن میں، ایک باغبان اپنے باغ میں، ایک راعی اپنے گلہ میں، ایک ہادی اپنی قوم میں، ایک امت کے اربابِ حل و عقد اس امت کے اندر انجام دیتے ہیں اور نظامِ خلافت اسی فرض کی ادائیگی کے لیے ایک قدرتی اور فطری نظام ہے۔ اس کے بغیر نہ مسلمانوں کا صحیح نہج پر قائم رہنا ممکن ہے اور نہ اس کے بغیر دنیا پر دین کی حجت تمام ہو سکتی ہے۔ پس آج نہ مسلمانوں کا صراطِ مستقیم سے انحراف قابلِ ملامت ہے نہ خلقِ خدا کی ضلالت قابلِ سرزنش ہے۔ مسلمان اس سرزمین کے لیے نمک تھے، جب ان کی نمکینی خود جاتی رہی تو اب کوئی چیز نمکین کس چیز سے بنائی جائے گی۔

پس آج جو جماعت مسلمانوں میں توحید اور اس کے مقتضیات کی دعوت کے

لیے اُٹھے وہ انتہائی حد تک بے رحم ہو گی اگر وہ یہ فرض کر کے اٹھے کہ یہ سارے کے سارے مسلمان کافر و بے دین ہو چکے ہیں۔ اگر وہ ایسا کرے گی تو اپنے اس طرزِ عمل سے اس بات کا ثبوت بہم پہنچائے گی کہ نہ اسے حالات کا صحیح اندازہ ہے اور نہ انبیاء کرام کے طریق دعوت سے اسے کوئی مس ہے۔ کسی کے کفر و فسق کا فیصلہ کرنے سے پہلے اس کا فرض یہ ہے کہ وہ کتابِ الٰہی کی اچھی طرح وضاحت کرے۔ ایک صالح جماعت کے قیام کے لیے اپنی پوری جدوجہد صرف کر دے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس ظلمت کو دور کر دے جو ہر طرف چھائی ہوئی ہے اور حق و باطل کا امتیاز ہر طالبِ حق کے لیے آسان ہو جائے۔

تکفیر کا اصلی مفہوم تو یہ ہے کہ کسی شخص کو مرتد قرار دے کر اس کو وہ سزا دی جائے جو اسلام میں ارتداد کے لیے مقرر ہے۔ یہ سزا ایک صالح اور با اختیار جماعت اپنے اندر کے ان افراد کو دیتی ہے جو اس کی دعوت اور اس کے نظام کے بنیادی اصولوں سے علانیہ اور دیدہ و دانستہ بغاوت کرتے ہیں۔ اس سزا کے نفاذ کے لیے شرط ہے کہ ایک جماعت موجود ہو جو صالح ہو۔ ایک غیر صالح جماعت کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ دوسروں کو غیر صالح قرار دے۔ دوسری شرط یہ ہے کہ وہ جماعت با اختیار ہو۔ کوئی بے اختیار جماعت تعزیرات و حدود کے اجرا کا حق نہیں رکھتی۔ تیسری شرط یہ ہے کہ ایک صالح جماعت کے قیام سے ماحول ایسا بن چکا ہو کہ وہ منکرات و معاصی کے لیے سازگار نہ رہ گیا ہو اور خدا کے بندوں پر دین کی حجت تمام کرنے اور حق کی توضیح کے ضروری وسائل برسرِ کار ہوں۔ بغیر اس کے نہ چوری پر ہاتھ کاٹنے کی سزا دی جا سکتی ہے، نہ زانی کو سنگسار کیا جا سکتا ہے، نہ شراب پینے والے کو کوڑے مارے جا سکتے ہیں۔ یہاں تک کہ اگر ایک صالح و با اختیار جماعت برسرِ اقتدار بھی ہو اور وقت کی مذہبی فضا بھی ایسی ہو کہ جرائم کے لیے اخلاقی رکاوٹیں موجود ہوں لیکن کسی عارضی سبب

سے جرم کے محرکات پیدا ہو جائیں تو اس جرم کی شرعی سزا حکومت جاری نہیں کرے گی۔ چنانچہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ایک مرتبہ سخت قحط پڑ گیا اور آپ کی انتہائی کوشش کے باوجود ملک کا معاشی توازن قائم نہیں رہ سکا تو آپ نے حالات کی درستگی تک کے لیے چوری پر ہاتھ کاٹنے کی سزا ملتوی کر دی۔

حضرت مسیح علیہ السلام کے عہد میں ایک عورت زنا کے جرم میں پکڑ کر لائی گئی علمائے یہود نے اس کو سنگسار کیے جانے کا مطالبہ کیا۔ حضرت نے فرمایا۔ ہاں، اس کو سنگسار کر دو، مگر اس کو تم میں سے وہ شخص پتھر مارے جو خود پاک ہو۔ حضرت مسیح کا مطلب یہ نہیں تھا کہ اس عہد میں سب زانی ہی زانی ہیں۔ کوئی عفیف اور پاکدامن نہیں رہ گیا ہے بلکہ ان کا اشارہ وقت کی فضا کی طرف تھا کہ اس وقت نہ کوئی صالح جماعت موجود ہے، نہ صالح نظام قائم ہے، نہ شرعی ماحول ہے۔ اگر یہ عورت اپنے شوہر سے خیانت کی گنہ گار ہے تو تم میں سے کون ہے جو اس سے بڑے گناہ یعنی اپنے خدا سے خیانت اور بے وفائی کا مجرم نہیں ہے۔ تم نے خدا کے عہد کو توڑا ہے اور اس جرم کی سزا میں خدا نے مشرک رومیوں کو تم پر مسلط کر دیا ہے تو تمہیں یہ حق کب پہنچتا ہے کہ ایک عورت کو اس کی بے وفائی پر سزا دو۔

پس تکفیر جو ایک سخت ترین سزا ہے جس کے بعد ایک شخص جماعت سے ہمیشہ کے لیے کٹ جاتا ہے جس کے بعد وہ واجب القتل مرتد ہو جاتا ہے۔ اس زمانہ میں کسی کو دینا اصولاً غلط ہے۔ اس وقت نہ تو کوئی صالح و با اختیار جماعت ہی موجود ہے اور نہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا وہ شرعی نظام ہی قائم و زندہ ہے جو لوگوں کے اندر کفر و شرک کا احساس و امتیاز زندہ رکھے۔ زندگی کے ہر شعبہ پر طاغوت کی سیاہی چھائی ہوئی ہے اور حق و باطل میں نہ صرف امتیاز معدوم ہے بلکہ باطل کو حق بنا کر چمکانے کی سعی کے لحاظ سے شاید یہ تاریخ کا سب سے کامیاب دور ہے۔ ایسے

زمانہ میں جو لوگ تکفیر و تفسیق کے کھیل کھیل رہے ہیں وہ وقت کی حالت، تکفیر کی اہمیت اور اس کے شرائط و قواعد سے بالکل بے خبر ہیں اور موجودہ دور جہل و فساد کی قدرتی پیداوار ہیں۔ اپنے جن بندوں کو اللہ تعالیٰ نے صحیح کام کی طرف توجہ کرنے کی توفیق و ہمت بخشی ہے وہ مسلمانوں کی تکفیر کی فکر میں نہیں ہیں۔ ان کی دعوت کا نقطہ آغاز

(اے لوگو جو ایمان لائے ہو حقیقی ایمان لاؤ) ہے۔

جہاں سب ایک گندے حوض کے اندر گرے ہوئے ہوں کسی کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ دوسرے کو نجس قرار دے اور اس کو سزا کا مستحق سمجھے، صرف گندگی کو گندگی بتانے اور اس سے باہر نکلنے کی جدوجہد کے لیے دعوت دینے کا حق ہے اور یہ کام جاری رہنا چاہیے تا آنکہ مسلمانوں کو جو ہندوستان کو ایک دارالامن سمجھ کر چین کی نیند سو رہے ہیں، محسوس ہو جائے کہ یہ دارالامن نہیں ہے بلکہ ایک ایسا مکان ہے جس میں دھواں ہی دھواں بھرا ہوا ہے یا ایک سنڈاس ہے جس کے اندر بدبو سے سانس لینا دشوار ہے۔ ع

صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

انسان کی فطرت میں شرک نہیں ہے جیسا کہ ہم آئندہ فصل میں بیان کریں گے، اور مسلمان تو شرک کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ پس کوئی وجہ نہیں ہے کہ یہ فطرت جو وقت کی تاریکیوں اور بیگانوں و بے گانوں کی تھپکیوں اور ان کے انجکشنوں کے اثر سے ماؤف ہو کر سو رہی ہے بیدار نہ ہو جائے اور انسان خدا کی سچی بندگی کی لذت سے پھر آشنا نہ ہو جائے۔

---

# ۸۔ کیا شرک تقاضائے فطرت ہے؟

اس زمانہ میں ہر علم وفن کی تحقیق میں اصلی رہنما نظریہ ارتقاء خیال جاتا ہے۔ تاریخ ہو یا قانون، معاشیات ہو یا سیاسیات، فلسفہ و مذہب ہو یا علم عمران و تمدن ہر ایک کی ابتدائی کڑیوں کی تلاش کا شوق اس عہد کے ذوق پر اس درجہ غالب ہے کہ اس کے بغیر ہر علم ادھورا اور ناقص ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ہر علم و فن کا مدون سرمایہ، جو پوری روشنی میں موجود ہے، اپنی صحیح قدر و قیمت بتانے کے لیے نہ صرف ناکافی سمجھا جاتا ہے بلکہ اکثر حالات میں وہ بالکل غلط اور مہمل قرار دے دیا گیا ہے۔ آج اصل شے یہ ہے کہ انسانی زندگی کے ہر شعبہ سے متعلق اس عہد میں تحقیق کی جائے جب انسان بالکل حالت طفولیت میں تھا اور جس کی کوئی لکھی ہوئی تاریخ ہمارے سامنے نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ عہد ایک عہد ظلمت ہے۔ اس کے متعلق جو کچھ بھی کہا جائے گا اس کی حیثیت رجماً بالغیب باتوں اور اٹکل کے تیر تکوں سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔ اس ظلمات میں خضر راہ آرکیالوجی (علم الآثار) اور بیالوجی (علم الحیوۃ) کے ماہرین سمجھے جاتے ہیں جو زمین کے طبقات چٹانوں کے پرت، غاروں کے اندر کے آثار و علامات، گڑی ہوئی ہڈیوں، ابتدائی زمانہ کے آلات و اوزار اور قدیم انسان کے کھنچے ہوئے آڑے ترچھے نقوش کو علم کا اصلی سرمایہ قرار دیتے ہیں اور اس پر ظن و تخمین کی عمارتیں کھڑی کرتے ہیں۔

اس بات کا اعتراف سب کو ہے کہ اس کی حیثیت ظن و تخمین (GUESSWORK) سے زیادہ نہیں ہے تاہم اس کی اہمیت کا یہ عالم ہے کہ ہر علم و فن میں وہی حقیقت ہے جو ان مظنونات سے ہم آہنگ ہو جائے۔ جو بات ان سے میل نہ پیدا کر سکے

وہ بے اصل اور ارتقاء کی راہ میں گویا ایک غیر فطرتی بیرونی مداخلت ہے جس کا وجود نہیں بلکہ عدم مطلوب ہے۔

اس خیال کے غلبہ کا اثر یہ ہوا ہے کہ ایک عرصے سے دنیا میں سیاسی اور سماجی تبدیلیوں کے جتنے دعوے ابھرے ہیں ان میں سے ہر ایک کو نظریہ ارتقاء کا سہارا لینا پڑا ہے اور یہ اتنا مرنجاں مرنج واقع ہوا ہے کہ سب کے ساتھ اس کی سازگاری رہی ہے۔ جمہوریت کے حامیوں نے انسان کی ابتدائی زندگی کا نقشہ اس طرح پیش کیا ہے کہ جمہوریت ہی کو انسان کا فطری تقاضا ثابت کر دیا ہے، ملوکیت کے ہمدردوں نے اس کی تقریر اپنے رنگ میں کر ڈالی ہے۔ نراج کے علمبرداروں نے اس کی تصویر اپنے رنگ میں کھینچی ہے۔ اشتراکیت نے اس کو اپنے رنگ میں پیش کیا ہے۔ البتہ غریب مذہب اس کو اپنی حمایت میں نہیں استعمال کر سکا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ کلیسا سے پہلے ہی مرحلہ میں اس نظریہ کے علمبرداروں سے ان بن ہو گئی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے شاطر حامیوں نے شروع ہی سے اس کو ایک مخالفِ مذہب نظریہ کی شکل دے دی تاکہ اس کو ان مذاہب کی حمایت میں نہ استعمال کیا جا سکے جو اپنی مخصوص انفرادیت کے مدعی ہیں اور جو اپنے عقائد و مسلمات کی بنیاد وحی پر قرار دیتے ہیں اور دوسرے مذاہب کے ساتھ کسی رواداری کے لیے تیار نہیں ہیں۔ چنانچہ اس نظریہ کی آڑ میں ملاحدہ نے یہودیت، مسیحیت اور اسلام کی جڑ اکھاڑنے کی پوری کوشش کی اور اس مقصد کے لیے مذہب کے ارتقاء کو انھوں نے اس طرح پیش کیا ہے جس سے آسمانی مذاہب کے تمام مسلمات ڈھے جاتے ہیں۔

یہاں ہم کو نظریۂ ارتقاء کی تمام تفصیلات سے بحث کرنے کا موقع نہیں ہے۔ البتہ ہم اس کے اتنے حصہ سے تعرض کریں گے جس کا تعلق شرک و توحید سے ہے۔

یہ لوگ مذہب کے ارتقاء کی تقریر یوں کرتے ہیں کہ مذہب نے انسان کے اولین نقش قدم کے ساتھ دنیا میں قدم رکھا۔ جس وقت انسان نے یہ محسوس کرنا شروع کیا کہ وہ مجرد ایک جسم نہیں ہے بلکہ اپنے اندر اس سے ایک برتر عنصر روح بھی رکھتا ہے اسی وقت مذہب کی پہلی بنیادی اینٹ رکھ دی گئی۔ اس کی ابتدائی تشکیل دو عنصروں سے ہوئی۔ ایک جذبۂ خوف دوسرا تصور۔ خوف ان دیکھی قوتوں کا جن کے اندر انسان نے اپنے آپ کو گھرا ہوا محسوس کیا اور جن کو زور و قوت میں اپنے سے کہیں بڑھ چڑھ کر پایا اور تصور اس بات کا کہ اس کی تعظیم اور بندگی کرنی چاہیے۔

جس طرح ان تمام چیزوں کی تاریخ جو جسم و جسمانیات سے تعلق رکھتی ہیں۔ زندگی کے اس ابتدائی ذرہ سے وابستہ ہے جس نے مادہ کو زندگی کی حرکت بخشی ہے اسی طرح ان تمام چیزوں کی تاریخ جو روح و روحانیات سے وابستہ ہیں، اس ذرۂ روح سے متعلق ہے جس کے جذبۂ خوف اور تصور کے باہمی تفاعل سے مذہب وجود میں آیا ہے۔ اس مذہبی تصور نے جب مذہبی عمل کی صورتیں اختیار کیں تو اس کے نتیجے کے طور پر مذہب کے فرائض اور اس کے رسوم و مناسک وجود میں آئے۔ پس مذہب ایک عمل ارتقاء کا نتیجہ ہے۔ وہ زندگی کا ارتقاء تھا یہ روح کا ارتقاء ہے اور جس طرح یہ بات معلوم ہے کہ زندگی ایک زمانہ میں رینگنے والے جانوروں کی شکلوں (REPTILIOUS LIFE FORM) میں چھپی ہوئی تھی اور درجہ بدرجہ انسان کی احسن تقویم میں بے نقاب ہوئی۔ اسی طرح روح ابتدا میں مظاہر پرستی، اشیاء پرستی اور سحر و ساحری کی زنجیروں میں گرفتار تھی اور آہستہ آہستہ خالص خدا پرستی تک پہنچی۔

اس تقریر سے جو نتائج علمائے ارتقاء نکالتے ہیں وہ بھی ہم اپنے لفظوں میں بیان کیے دیتے ہیں۔

۱۔ مذہب کا نقطۂ آغاز خوف کا جذبہ ہے۔ یہ خوف مظاہرِ قدرت سے پیدا ہوا بادلوں کی گرج، بجلی کی کڑک، آندھیوں کے شور، آتش فشاں پہاڑوں کے ہولناک نظاروں نے انسان کو ڈرایا اور وہ ان کو زندہ قوتیں سمجھ کر ان کی آفتوں سے اپنے آپ کو بچانے کے لیے ان کی عبادت کرنے لگا۔

۲۔ خالص خدا پرستی کے تقاضائے فطرت ہونے کا دعویٰ غلط ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو انسان خدا پرستی کی جگہ مظاہر پرستی اور اشیاء پرستی وغیرہ سے مذہب کا آغاز نہ کرتا اور نہ دنیا میں بت پرستی اور مردہ پرستی کی یہ کثرت ہوتی جو ہم تاریخ میں دیکھ رہے ہیں۔

۳۔ تمام مذاہب کی اصل ایک ہے۔ اس پہلو سے اسلام اور یہودیت اور افریقہ کے وحشیوں کی سحر پرستی (VOODOO WORSHIP) میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اس لیے تمام مذاہب اور تمام عقائد مختلفہ میں رواداری کو اصل الاصول ہونا چاہیے۔

اوپر کی تقریر اس قدر دلکش تھی کہ اس نے ہمارے حال کے بعض علمائے دین کی کتابوں میں بھی جگہ پالی ہے۔ حالانکہ ہے یہ بالکل مہمل اور غلط۔ عقل و نقل دونوں اس کے خلاف ہیں۔

یہ بات کہ مذہب کا آغاز ان دیکھی قوتوں کے خوف سے ہوا ہے اور یہی جذبہ انسان کے جذبات میں اولین اور قدیم ترین ہے بالکل بے سرو پا ہے۔ انسان میں جو خوف پایا جاتا ہے اس کی اصل حقیقت زوال نعمت کا اندیشہ ہے۔ انسان کو اپنی زندگی عزیز ہے، زندگی کا سروسامان عزیز ہے، اپنے بیوی بچے عزیز ہیں، اس لیے وہ ان چیزوں کی طرف سے اندیشہ میں ہوتا ہے کہ کہیں یہ چیزیں اس سے چھن نہ جائیں۔ جس کے معنی دوسرے لفظوں میں یہ ہوئے کہ ان چیزوں کے بارہ میں خوف و اندیشہ میں مبتلا ہونے سے پہلے وہ ان چیزوں کے نعمت ہونے کا

شعور رکھتا ہے اور پھر اس سے یہ بات بھی لازم آتی ہے کہ ان نعمتوں کی وجہ سے اس کو ایک منعم کا بھی شعور ہوا ہوگا اور پھر لازماً اس کے لیے شکر گزاری کا جذبہ اور عبادت کا تصور بھی پیدا ہوا ہوگا۔ اس لیے خوف سے پہلے نعمت اور منعم کا شعور ناگزیر ہے۔ جب تک ہمیں زندگی اور اس کے اسباب و وسائل کے نعمت ہونے کا احساس نہ ہو، اس وقت تک ہمیں زندگی کے متعلق کوئی خوف نہیں ہوتا۔ چنانچہ جو لوگ اپنی زندگی سے بیزار ہو جاتے ہیں وہ موت جیسی خوفناک چیز سے ذرا بھی نہیں ڈرتے۔ کتنے آدمی آگ میں کود پڑتے ہیں۔ کتنے دریاؤں اور سمندروں میں ڈوب مرتے ہیں۔ جاپان میں کتنے ہیں جو آتش فشاں پہاڑوں کے دہانوں میں چھلانگ لگا کے ختم ہو جاتے ہیں۔

پس اگر ابتدائی انسان کو بجلی کی کڑک، بادلوں کی گرج اور طوفانوں کے شور سے کوئی خطرہ محسوس ہوا اور اسے اپنے آپ کو ان کے خطرات سے بچانے کی فکر لاحق ہوئی تو اس سے یہ لازم آتا ہے کہ اسے زندگی اور زندگی کے اسباب و وسائل کے نعمت ہونے کا شعور تھا۔ کیونکہ جب تک کوئی شے عزیز نہ ہو اس کی حفاظت کی فکر بالکل بے معنی ہے۔ خالی گھر میں کوئی بھی قفل نہیں لگایا کرتا اور پھر اس سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ اسے ایک منعم کا بھی شعور تھا، کیونکہ نعمت کا وجود ایک منعم کے شعور کو متلزم ہے اور اگر یہ بات صحیح ہے کہ وہ قدرت کے ان مظاہر کی اس ڈر سے عبادت کرنے لگا کہ وہ اس سے زندگی کی نعمت یا اس کے اسباب کہیں چھین نہ لیں تو اس سے زیادہ صحیح یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ان نعمتوں کے شعور نے اس کے اندر اپنے منعم کے لیے محبت اور شکر گزاری کا جذبہ بھی پیدا کیا ہوگا۔ پس ثابت ہوا کہ ایک منعم کا شعور، اس کی محبت اور شکر گزاری کا جذبہ اور اس کی عبادت کا تصور خوف کے جذبہ اور مظاہر قدرت کی عبادت کے تصور پر مقدم ہے۔

بہرحال انسان نے جب سے خوف کا احساس کیا ہے اس سے پہلے زندگی کے نعمت ہونے اور ایک منعم کا اور اس کی محبت کا احساس کیا ہے اور جس وقت اس کے تصور نے اس کو ورغلایا کہ وہ ان مظاہر قدرت کی عبادت کرے یقیناً اس سے پہلے جذبۂ محبت سے ایک تصور نے ابھر کر اسے اکسایا ہوگا کہ وہ اپنے منعم کا شکر ادا کرے۔ اور محبت اور شکر گزاری کا یہ جذبہ و تصور توحید اور خالص خدا پرستی کی بنیاد رکھتا ہے نہ کہ شرک کی۔ چنانچہ یہی راز ہے کہ قرآن مجید نے حمد و شکر کو انسان کی اولین صدائے فطرت بتایا ہے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ[1]

ہمارے اس نظریہ کی تائید اس امر واقعہ سے بھی ہوتی ہے کہ جو چیزیں انسان کے اندر خوف کی حالت پیدا کرتی ہیں وہ دنیا کے عامۃ الورود واقعات میں سے نہیں ہیں۔ زلزلے روز نہیں آیا کرتے، آتش فشاں پہاڑ روز نہیں پھٹتے۔ بجلیاں روز نہیں کڑکتیں اور طوفانوں کا شور بھی کوئی روزمرہ کا واقعہ نہیں ہے۔ برعکس اس کے تارے روز چھٹکتے ہیں، سورج روز چمکتا ہے، آسمان کی نیلگونی ہر لمحہ باصرہ نوازی کرتی ہے، چاندرو پہلی چاندنی کی چادر دشت و جبل میں روز بچھاتا ہے۔ ابر کرم کی تر دستیاں اور درختوں کی ثمر باریاں ہر موسم میں موجود ہیں۔ پھر کس قدر حیرت کی بات ہے کہ مظاہر قدرت کی گاہ گاہ کی گھرکیاں اور دھمکیاں تو انسان کو اس درجہ مرعوب کر دیں کہ وہ ان کی پوجا کرنے لگ جائے لیکن منعم غیب کی یہ ساری فیاضیاں بالکل بے اثر رہ جائیں اور انسان میں شکر و سپاس کا کوئی ولولہ نہ پیدا کریں۔

بیالوجی کے علماء نے اس زمانہ کی دنیا کی تصویر بہت بھیانک کھینچی ہے اور یہ دکھانا چاہا ہے کہ اس وقت کے قدرتی مظاہر خوف ہی کے جذبہ کا باعث

---

[1] شکر ہے اللہ کے لیے جو عالم کا خداوند ہے۔ رحمان اور رحیم ہے۔

ہو سکتے تھے لیکن یہ ایک صریحی مغالطہ ہے۔ اس زمانہ کی دنیا اگر بہت بھیانک تھی تو ظاہر ہے کہ اس زمانہ کا انسان بھی آج کا انسان نہ تھا۔ اگر اس وقت یہ کائنات اتنی حسین نہ تھی جتنی اب ہے تو اس وقت کا انسان اتنا جمال پرست بھی نہ تھا جتنا کہ اب ہے۔ اگر اس وقت یہ زمین آج کی طرح زرخیز و معمورہ نہ تھی تو اس وقت کا انسان بھی آج کی طرح عشرت پسند اور مجلسی نہیں ہوا تھا۔ اگر اس وقت خطرے اور تکلیفیں بہت تھیں تو آج کے انسان کی طرح اس عہد کا انسان نازک بدن اور تن آسان بھی نہ تھا۔ وہ ہر خطرہ سے بچاؤ کے لیے کوسوں بھاگ سکتا تھا، گلہریوں اور بندروں کی سی چستی کے ساتھ درختوں پر چڑھ سکتا تھا، آگ جلا کر اور پتے سی کر اپنے جسم کو سردی اور گرمی کی تکلیف سے بچا سکتا تھا، برفباری اور درندوں کی آفتوں سے بچنے کے لیے غاروں میں چھپ سکتا تھا، بھوک میں ہر طرح کے جانداروں کے شکار سے اپنا پیٹ بھر سکتا تھا۔ اس لیے یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ اس وقت کے حالات خوف ہی کے جذبہ کی نشوونما کے لیے سازگار تھے۔ اس میں حاضر کو ماضی میں داخل کر دینے کا مغالطہ چھپا ہوا ہے۔ زمانہ تو قدیم ترین دور حجری سے بھی پہلے کا فرض کر لیا گیا ہے اور انسان اس کے اندر اسی بیسویں صدی کا فرض کیا گیا ہے۔

بعض علمائے ارتقاء نے خاندان کے بڑے بوڑھے کے خوف کو انسان کے تمام ابتدائی تصورات (EARLY THOUGHTS) کی اصل قرار دیا ہے لیکن ہمارے نزدیک خاندان کے بزرگ کا یہ خوف بھی محبت ہی پر مبنی ہوتا ہے۔ بچوں کو تمام لذتیں اور تمام راحتیں ماں باپ سے حاصل ہوتی ہیں اس وجہ سے وہ ان سے محبت کرنے لگتے ہیں اور اس محبت ہی کی وجہ سے ان سے ڈرنے بھی لگتے ہیں۔ پس یہ جذبہ بھی اپنی اصل کے لحاظ سے محبت ہی کا جذبہ ہے اور اس سے

بلاشبہ ماں باپ کی تعظیم کا تصور پیدا ہوتا ہے لیکن یہ حقیقت نظر انداز نہیں کرنی چاہیے کہ بچہ جب تک بچہ رہتا ہے اس وقت تک تو بلاشبہ ساری کائنات باپ ہی کو سمجھتا ہے۔ لیکن جوں ہی وہ خود باپ بنتا ہے یا باپ بننے کے قابل ہو جاتا ہے اسے محسوس ہونے لگتا ہے کہ باپ کا وجود صرف ایک حد تک ہی اس کی لذتوں اور راحتوں کا کفیل ہے۔ اس حد سے باہر قدم رکھنے کے بعد جو کچھ اسے حاصل ہوا ہے اس کا سرچشمہ کوئی اور ہی، ان دیکھی ہستی ہے۔ یہاں تک کہ خود باپ کا وجود بھی اسے اس ان دیکھی ہستی کی بے پایاں بخشائشوں میں سے ایک بخشش معلوم ہونے لگتا ہے۔ پس جس جذبۂ محبت نے اس کے اندر باپ سے محبت، تعظیم اور خوف کی وابستگی پیدا کی ہوگی لازماً اسی جذبہ نے بچپنے کے حدود سے نکلنے کے بعد اس کے اندر ایک ان دیکھی ہستی کے ساتھ محبت، تعظیم اور خوف کی وابستگی بھی پیدا کی ہوگی۔ اگر انسان ہمیشہ دورِ طفولیت ہی میں رہتا تب تو مذہب بلاشبہ پدر پرستی ہی سے شروع ہوتا اور پدر پرستی ہی پر ختم ہو جاتا۔ لیکن بچہ سیانا بھی ہوتا ہے اور مذہب سیانوں ہی کی ایجاد ہو سکتا ہے تو سیانوں کے اندر اگر باپ کے احسانات کی وجہ سے اس کی تعظیم اور اس کے وقار و احترام کا تصور پیدا ہو سکتا تھا تو اس سے بدرجہا اقرب ہے کہ ان عظیم احسانات کا اثر بھی اسی جذبہ ۔۔۔ ۔۔۔ کی شکل میں ظاہر ہو جن میں باپ کو کوئی دخل نہیں تھا۔ لیکن وہ موجود تھے اور باپ سے کہیں بڑھ کر کسی مہر و محبت والی ہستی ہی کے ہو سکتے تھے۔[1]

---

[1] مذہب کی اصل کے متعلق علمائے ارتقاء کے ہاں مقبول عام نظریے یہی دو ہیں اور انہی دونوں کو نسبتاً علمی انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اسی وجہ سے ہم نے بھی انہی دونوں سے تعرض کیا ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی بعض نظریات ہیں۔ مثلاً بعضوں نے مذہب کا نقطۂ آغاز طوطمیت (TOTEMISM) کو قرار دیا ہے۔ بعضوں نے اس کی اصل اول اول (باقی اگلے صفحہ پر)

مطلوب ومحبوب ہے وہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ اس خوف وتقویٰ کی بنیاد محبت پر ہوتی ہے۔ یہ مجرد خدا کے قہر وغضب کے تصور سے پیدا نہیں ہوتا بلکہ اس کے بے پایاں افضال وعنایات کے تصور اور اس کے اسمائے حسنیٰ کے تذکرے سے پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ اس کی اعلیٰ صفتوں کو سب سے زیادہ جانتے ہیں وہی لوگ اس سے سب سے زیادہ محبت کرتے ہیں اور جو اس سے سب سے زیادہ محبت کرتے ہیں وہی اس سے سب سے زیادہ ڈرتے ہیں۔ اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمَاءُ (اللہ سے اس کے بندوں میں سے علماء ہی ڈرتے ہیں)

ہماری اس بحث سے علماء ارتقاء کے نظریہ کی تو پوری تردید ہوگئی کہ مذہب کا آغاز خوف کے جذبہ اور مظاہر پرستی سے ہوا ہے۔ لیکن ایک شبہ یہ ضرور پیدا ہوتا ہے کہ اگر انسان کی فطرت خالص خدا پرستی ہے اور اس کے روحانی ارتقا کا اصلی رخ یہی ہے تو اس کی کیا وجہ ہے کہ دنیا میں کثرت سے شہادت بت پرستی اور مردہ پرستی وغیرہ ہی کی ملتی ہے؟ تاریخ کے عہدِ ظلمت کے آثار وقرائن بھی اسی بات کی گواہی دیتے ہیں اور جس عہد کا مدوّن سرمایہ ہمارے ہاتھوں میں موجود ہے اس کی شہادت بھی یہی ہے۔ نصاریٰ پر پوری چھ صدیاں بھی نہ گزرنے پائیں کہ ان میں تصویر پرستی رائج ہوگئی حالانکہ تورات میں اس کی سخت ممانعت تھی۔ یہود باوجودیکہ تورات کا پہلا حکم توحید تھا، بارہا کھلم کھلا بت پرستی میں مبتلا ہوئے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے محض توحید کے لیے وطن چھوڑا اور ایک سنسان جگہ میں اللہ واحد کی عبادت کے لیے ایک گھر بنایا، لیکن انہی کی اولاد نے بہت مدت نہیں گزری کہ اسی گھر میں بتوں کو لا بسایا۔ جبکہ قرآن کا دعویٰ یہ ہے کہ خالص توحید ہی انسان کی فطرت ہے لیکن واقعات کی شہادت اس کے خلاف ہے تو اس کا جواب دینا ضروری ہے۔ اسی جواب سے علماء ارتقاء کے اس دوسرے نتیجہ بحث

کی تردید ہوگی جو ہم اوپر نقل کر آئے ہیں۔

یہ بات کہ دنیا میں، ابتدا سے کثرت بت پرستی اور شرک ہی کی رہی ہے اور اب تک ہے اس بات کی دلیل نہیں ہو سکتی کہ شرک و بت پرستی انسان کی فطرت ہے۔ آدمی کا بچہ جب تک بچہ رہتا ہے سامنے کی ہر چیز بلا امتیاز اس کے کہ وہ اینٹ ہے یا پتھر، لکڑی ہے یا لوہا، پاک ہے یا ناپاک، منہ میں ڈالنے کی کوشش کرتا ہے اور خیال کرتا ہے کہ یہ ماں کی چھاتی ہی ہے۔ کچھ دیر تک اس کو چوستا ہے پھر کوئی دوسری چیز اٹھا لیتا ہے، پھر کوئی تیسری چیز اٹھا لیتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکال لینا کہ یہ ساری چیزیں بچہ کو فطرۃً مطلوب ہیں محض حماقت ہے۔ بچہ کی فطری غذا تو ماں کی چھاتی کے اندر ہوتی ہے لیکن چونکہ اس کو ابھی پورا پورا امتیاز نہیں ہوتا ہے اس وجہ سے وہ ہر چیز کو ماں کی چھاتی ہی خیال کرنے لگتا ہے پس اگر انسان اپنے عہد طفولیت میں بت پرستی اور مظاہر پرستی وغیرہ کی نجاستوں میں آلودہ رہا تو اس کے معنی یہ نہیں ہو سکتے کہ یہی اس کی فطرت کا تقاضا تھا بلکہ درحقیقت اس کی یہ ساری پریشانی و سرگردانی معبود حقیقی کی تلاش میں تھی۔ اسی کی طلب نے اس کو تمام کوچوں کی خاک چھنوائی۔ بچہ کی یہ خصوصیت بھی قابل لحاظ ہے کہ بسا اوقات ماں اس کو پکارتی بھی ہے لیکن وہ جس چیز میں مشغول ہوتا ہے اسی میں مشغول رہتا ہے تا آنکہ ماں اسے گود میں نہ اٹھا لے اور اپنی چھاتی اس کے منہ سے نہ لگا دے۔ پھر جوں ہی اس کو سینہ سے الگ کر دیتی ہے وہ حسب سابق ہر چیز منہ میں ڈالنے اور نگلنے لگ جاتا ہے۔

پس یہ بات بالکل مطابق عقل معلوم ہوتی ہے کہ تاریخ کے عہد ظلمت میں بھی خدا کے ایسے بندے آئے جو خود بھی بیدار تھے اور جنھوں نے دوسروں کو بھی بیدار کیا لیکن تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد، جیسا کہ بچوں کی فطرت ہے، کھلونوں

کی دلچسپی عود کرتی رہی اور انسان کی جستجو اپنا مدعا پا پا کے کھوتی رہی۔

یہاں پہنچ کر بعض لوگوں کو ایک اور شبہ بھی ہوتا ہے وہ یہ کہ جو چیز انسان کی فطرت ہے چاہیے کہ وہ اسی پہ پیدا ہو، اسی پہ بڑھے اور اسی پہ مرے۔ یہ پا پا کر کھونا اور کھو کھو کے پانا کیا معنی؟ کم از کم یہ تو ہو کہ جستجوئے بسیار کے بعد جب پا جائے تو پھر اسے نہ کھو سکے۔

یہ شبہ محض اس وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ لوگ حیوانات کی جبلت اور انسانوں کی فطرت کے فرق کو نہیں سمجھتے۔ حیوانات کی جبلت اپنے بندھے ٹکے قاعدے رکھتی ہے اگر کوئی طبعی خلل نہ واقع ہو تو انھیں قاعدوں پر ابھرتی، نشوونما پاتی اور اپنے مقررہ درجۂ کمال تک پہنچتی ہے۔ قدرت نے ان کو اس سے انحراف کرنے، اس کو بدل دینے، یا اس میں ترقی کرنے کا موقع نہیں بخشا ہے۔ وہ اپنے دھڑے کے پابند اور اپنے طبعی نظام کے اندر جکڑے ہوئے ہیں۔ ایک کبوتر کو اگر آپ گوشت کی دکان کے اندر بند کردیں تو وہاں وہ بھوکا مر جائے گا لیکن گوشت کے سارے ذخیرے سے فائدہ نہ اٹھا سکے گا۔ ایک بلّی کو اگر آپ پھلوں کی الماری کے اندر بند کردیں تو وہ بھی بھوکی مر جائے گی لیکن پھلوں کے ذخیرہ سے کوئی فائدہ نہ اٹھا سکے گی لیکن انسان کی فطرت اس سے بالکل مختلف ہے۔ یہاں ہم انسانی فطرت کی نوعیت واضح کرنے کے لیے تھوڑی دیر کے لیے استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ مستعار لے لیتے ہیں جو انھوں نے تفسیر سورۂ اخلاص میں مذکورہ بالا سوال کا جواب دیتے ہوئے لکھے ہیں اور سورۂ روم کی آیات (۴۸-۵۴) کی روشنی میں لکھے ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں۔

حکمت اور رحمت کی نشانیاں جو انسان کو تمام عالم میں نظر آرہی ہیں اور اپنے رب کی طرف کشش، جسے وہ مصیبت کے وقت محسوس کرتا ہے بتا

رہی ہیں کہ کسی حاکم مطلق ہستی پر اسے اپنے اندر اور باہر سے گواہی مل رہی ہے۔ ایسی کوئی شہادت بتوں یا مردوں کے لیے نہیں ملتی مگر انسان کی فطرت مثل اور حیوانات کے نہیں۔ وہ غلام بنائے گئے اور اس کو آزادی بخشی گئی جس کا لازمہ تھا کہ وہ اپنی کوشش سے ترقی کرے۔ پس ان کو جس ڈگر پر چلانا تھا ہانک دیا اور وہ ویسے ہی چل رہے ہیں مگر انسان کو چراغِ عقل اور توشۂ قابلیت دے کر میدان عالم میں چھوڑ دیا۔ پس اس کی فطرت اس کی قابلیت ہے۔ جس قدر انسان نے آج تک ترقی کی ہے یہ سب اس کی قابلیت ہی کے آثار ہیں اور اس کی قابلیت ہی کے برگ و بار۔ یہ امر کہ قابلیت کا نام فطرت ہے کچھ انسان کے ساتھ مخصوص نہیں۔ بچہ طاؤس جو ایک مضغۂ گوشت ہے جب جوان ہوتا ہے تو اس کے پروں کی گلکاری کو ہم فطرت ہی کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔ اسی طرح بچۂ انسان جو اکثر جانوروں کی نسبت زیادہ ضعیف الجثہ ہے اور اس سے بڑھ کر ضعیف العقل ہے۔ جب اپنے شباب پر پہنچتا ہے تو کیا اس کی دانائی اور توانائی کو ہم اس کی اعلیٰ فطرت کا نتیجہ نہ سمجھیں؟ پس انسان اور دیگر چیزوں میں فطرت کے ایک ہی معنی ہیں، البتہ اس کی فطرت میں ایک جداگانہ بات ہے جو اوروں میں نہیں۔ یہ اول میں نہایت کمزور اور بے حقیقت ہوتا ہے مگر آخر میں سب پر فائق ہو جاتا ہے۔ اس کی طاقت کی تھاہ اب تک نہیں ملی۔ مگر یہ سب دو ناتوانیوں کے درمیان ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو انسان سے دعوائے فرعونی بھی ناموزوں نہ ہوتا۔ پس محض اس بات سے کہ انسان کی فطرت ترقی کے انتہائی مراحل طے کرتی ہے۔ یہ امر قرین قیاس ہے کہ وہ اکثر غلط راستہ پر پڑ جائے۔ پس آزادی لے لئے اور پھر درازئ راہ

اس کے حصہ میں آئی۔ ان دو مشکلوں کے ساتھ ایک تیسری مشکل بھی لگ گئی جو ان دونوں سے کبھی جدا ہو ہی نہیں سکتی۔ یعنی انسان نیکی اور بدی کے دوراہہ پر کھڑا کیا گیا جس کے بغیر اس کے حق آزادی لفظ بے معنی ہوتی اور مراتب کے لیے عرصہ تنگ ہوتا۔ پس کوشش اور کشش انسان کی فطرت کا لازمہ ہوا اور نیکی اور بدی کی کشمکش میں آگے بڑھنا اور نفس امارہ اور عقل آوارہ کو جادہ طاعت پر لانا اس کا فریضہ ٹھہرا۔"

"انسان کو خدائے تعالیٰ نے ان دقتوں میں ڈال کر اس کی دستگیری کا وعدہ کیا ہے۔ اس کے اندر اور باہر سامان ہدایت موجود کر دیے ہیں۔ جس طرح بچہ ناتواں کے لیے ماں کا آغوش مہیا کیا اسی طرح نوع انسان کے لیے پیغمبروں کو مبعوث فرمایا۔ جو خدا زمین مردہ کو بارش سے سیراب کرتا ہے وہی خدا اپنے کلام سے دلوں کو آباد کرتا ہے۔ جس طرح وہ بعض بلند پہاڑوں میں سے قدرتی چشمے نکالتا ہے اسی طرح بعض اعلیٰ دلوں میں سے الٰہی کلمے جاری فرماتا ہے۔ پس اس قدر سامان مہیا کر دینے کے بعد اگر انسان خدا سے روگرداں ہو تو یہ نتیجہ فطرت نہیں بلکہ اس کی غفلت ہے۔ اگر تاریخ سے بت پرستی کی مثالیں ملتی ہیں تو اس سے کہیں زیادہ پر زور اس کے ابطال کی مثالیں ملتی ہیں۔ توحید پر شرک کا غبار آہستہ جمتا ہے مگر توحید کا ذرا سا چمکارا شرک کی ظلمت پر غالب ہو جاتا ہے جس سے یہ نتیجہ بدیہی طور پر نکلتا ہے کہ فطرت انسانی کو توحید سے مناسبت ہے ورنہ وہ کیوں اس طرف تیزی سے دوڑتا اور دوسری طرف آہستہ آہستہ کھسکتا ہے۔"

اس تقریر سے واضح طور پر معلوم ہو گیا کہ انسان کی فطرت اور حیوانات کی

جبلت میں چند بنیادی فرق ہیں۔

پہلا فرق یہ ہے کہ انسان کو اعلیٰ فطرت اور اعلیٰ خلقت کے ساتھ آزادی بھی ملی ہے۔ اس آزادی کی وجہ سے وہ اگر چاہے تو احسن تقویم میں ہونے کے باوجود اسفل سافلین کے گڑھے میں گر جائے۔

دوسرا فرق یہ ہے کہ انسان کی قوتیں اور قابلیتیں اتھاہ ہیں۔ اس کو ترقی کی ایک لمبی منزل طے کرنی پڑتی ہے۔ حیوانات کی طرح اس کا راستہ کوس دو کوس کا نہیں ہے کہ چلے اور پہنچ گئے۔ اس درازی راہ اور آزادی رائے کے ساتھ اس کا گرنا اور اٹھنا، ڈوبنا اور اچھلنا بالکل قدرتی بات ہے۔

تیسرا فرق یہ ہے کہ آزادی رائے اور درازی منزل کے ساتھ ساتھ اس کی آزمائش بھی کی گئی ہے۔ اس کے سامنے دنیا کو نقد، آخرت کو نسیہ، نیکی کو دشوار، بدی کو آسان، حرام کو لذیذ اور کثیر اور حلال کو بے مزہ اور قلیل، ثمرۂ حق کو آجل اور نتیجہ باطل کو عاجل، حقیقت کو مستور اور وہم و فریب کو دلکش اور پرجمال بنا کر رکھ دیا گیا ہے تاکہ اس کا امتحان ہو کہ وہ خیر کی طرف لپکتا ہے یا شر کی طرف۔ اپنی فطرت کے مخفی مگر پُرحقیقت اشاروں کی طرف بڑھتا ہے یا نفس کی خلاف فطرت مگر پُرفریب دعوتوں کی طرف۔ بلاشبہ یہ امتحان بڑا کڑا ہے۔ لیکن فطرت کا نفس لوامہ بھی ضعیف نہیں ہے۔ وہ ہر تاریکی کے اندر جھانکنے کی راہ پیدا کر لیتا ہے اور انسان کی رہنمائی کے لیے اشارے کرتا ہے اور آدمی محسوسات کے کتنے ہی نقاب اپنے اوپر ڈال لے لیکن اس کے اشارے دیکھتا اور اس کی صدائیں سنتا ہے اگرچہ اس کی صدائیں سنتے ہوئے اس کی نافرمانیاں کرتا ہے اور اس کی حجتوں کو دیکھتے ہوئے اپنے لیے عذرات تلاش کر لیتا ہے۔ یہی حقیقت ہے جو سورۂ قیامہ کی آیات (وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ [1] - بَلْ يُرِيْدُ الْاِنْسَانُ لِيَفْجُرَ اَمَامَهٗ [2])

---

[1] اور نہیں میں قسم کھاتا ہوں نفس ملامت گر کی۔ [2] بلکہ انسان چاہتا (باقی اگلے صفحہ پر)

اور (بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِہٖ بَصِیْرَۃٌ وَّلَوْ اَلْقٰی مَعَاذِیْرَہٗ ؀) میں بیان ہوئی ہے اور تفصیل اس اجمال کی استاذ امام مولانا حمیدالدین فراہی کی تفسیر سورۂ قیامہ میں دیکھنی چاہیے۔

امتحان کی یہ سختی اس بات کی متقضی ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی رہنمائی کے لیے انبیاء مبعوث فرمائے۔ ہر چند فطرت کی کشش خدا کی طرف ضعیف نہیں تھی لیکن دنیا اور اس کی گیرائیاں، نفس اور اس کی فریب کاریاں، شیطان اور اس کی دلربائیاں بھی اپنے اندر اتنا وزن رکھتی تھیں کہ رحمت الٰہی مقتضی ہوئی کہ اس کسر کا جبر مہیا کرے اور نفس کے پہلو پر جو ثقل ہے اس کی تلافی فطرت کے پلڑے میں پاسنگ رکھ کے کر دے۔ چنانچہ قرآن مجید میں مذکور ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے آدم کو شیطان کے ساتھ اس آزمائش گاہ دنیا میں اتارا تو ساتھ ہی اپنی ہدایتیں اور اپنے انبیاء بھیجنے کا وعدہ فرمایا (فَاِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ مِّنِّیْ ھُدًی) تاکہ اس میدان مقابلہ میں انسان کی فطرت تنہا نہ پڑ جائے بلکہ اس کے ساتھ اللہ کے نبیوں اس کی کتابوں اور اس کے ملائکہ کی نصرت بھی ہو۔ یہ فطرت کی تائید میں ایک مزید کمک مہیا کی گئی جس کے بعد انسان پر اللہ کی حجت تمام ہو گئی اور اس کی ہدایت کا معاملہ اتفاق و امکان پر نہیں رہ گیا۔ اب اس کے لیے قیامت کے دن یہ عذر باقی نہیں رہا کہ تاریکی اتنی سخت تھی کہ اس سے اپنی فطرت کے مدھم نقوش پڑھے نہ جا سکے۔ بلاشبہ تاریکی سخت تھی لیکن نور مبین اور سراج منیر بھی موجود تھے جو فطرت کے باریک سے باریک نقوش کو اجاگر کر رہے تھے۔

قدرت کسی گوشہ میں بھی اپنی فیض بخشیوں میں بخیل نہیں ہے۔ یہ ممکن تھا کہ اللہ

---

(حاشیہ صفحہ گزشتہ) ہے کہ خدا کے سامنے نافرمانی کرے۔

؎ انسان خود اپنے اوپر حجت ہے اگرچہ کتنے ہی عذرات پیش کرے۔

کو سننے کے لیے ایک ہی کان دیا جاتا یا دیکھنے کے لیے ایک ہی آنکھ ملتی لیکن قدرت نے دو کان بخشے اور دو آنکھیں عنایت کیں۔ اسی طرح یہ بھی ممکن تھا کہ انسان کی رہنمائی اس کی فطرت ہی پر چھوڑ دی جاتی لیکن رحمت الٰہی نے اس معاملہ کو امکان و اتفاق پر نہیں چھوڑا بلکہ اپنے نبیوں اور رسولوں کے ذریعہ سے ہدایت کا بہتر سے بہتر سامان مہیا کر دیا۔ اندر اور باہر کی اتنی قوتیں رکھنے کے باوجود اگر انسان خدا پرستی کی حمایت میں شیطان سے لڑنے کے لیے تیار نہ ہوا بلکہ اس کے ساتھ اس نے سازگاری ہی چاہی تو ظاہر ہے کہ یہ فطرت کی خرابی نہیں ہے بلکہ اس کے اسباب دوسرے ہیں جو انشاء اللہ تفصیل کے ساتھ آئندہ فصل میں بیان ہوں گے۔

اس تقریر کے بعد اب اس بات کی تردید کی ضرورت باقی نہیں رہی کہ تمام مذاہب کی اصل ایک ہے۔ اوپر کے مباحث سے یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو چکی ہے کہ اسلام اور دوسرے آسمانی مذاہب کا نقطۂ آغاز خوف کا جذبہ نہیں ہے بلکہ محبت الٰہی کا جذبہ ہے اور شرک و بت پرستی کی بنیاد ایک بالکل دوسری ہی شے ہے جس کی تفصیل آگے آئے گی۔ پس اسلام (اور تمام مذاہب حقہ کا اصلی نام اسلام ہے اور یہی ابتدائے آفرینش سے خدا کا اصلی دین ہے) اور شرک و بت پرستی میں اصل و نسل کا فرق ہے اور ان کا قدرتی تعلق صلح و آشتی کا نہیں بلکہ نفرت و عداوت کا ہے۔ ایک فطرت کا ارتقاء ہے۔ دوسرا فطرت کی رجعت قہقری۔ دونوں کی سمت سفر اور منزل بالکل مختلف ہے۔ ان میں رواداری اور مسالمت کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

دنیا میں انسان محض جینے نہیں آیا ہے۔ اس لیے آیا ہے کہ اس کی فطرت میں جو اعلیٰ صلاحیتیں ودیعت ہیں ان کو ارتقاء کے اس نقطۂ کمال تک پہنچا دے جہاں تک وہ اس عالم آب و گل میں رہتے ہوئے پہنچ سکتی ہیں۔ اسی مقصد کے

لیے انسان کو دنیا میں جینے کی ایک مہلت ملی ہے۔ اگر یہ مقصد پورا نہ ہو رہا ہو تو اس کا جینا لاحاصل اور اس کا زندہ رکھنا عبث ہے اور قدرت جو ہر گوشہ میں نہایت حکیم واقع ہوئی ہے۔ وہ ایک کارِ عبث نہیں کر سکتی۔ انسان کے ارتقائے روحانی کا نقطۂ آغاز جیسا کہ اوپر معلوم ہو چکا ہے، خالص خدا پرستی کا جذبہ ہے جب انسان اپنے اس رخ پر بڑھ چلتا ہے تو وہ ارتقائے روحانی کی اصلی شاہراہ پر گامزن ہو جاتا ہے۔ اگر اس سے اس نے رخ پھیر لیا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ ارتقائے فطری کی راہ کے خلاف بہ چلا ہے۔ چونکہ قدرت حد درجہ مہربان ہے اس لیے اس نے فطری ہدایت بخشنے کے ساتھ ساتھ اس کا بھی سامان کیا ہے کہ وہ اپنے انبیاء و رُسل بھیجتی رہی ہے جو انسانوں کو ان کے ارتقاء کی صحیح سمت میں ہانکتے رہے ہیں یعنی ان کو خالص خدا پرستی کے نقطہ تک لانے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔

انبیاء کے متعلق اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ وہ جس گروہ کی طرف بھیجے جاتے ہیں اس کے نخلِ فطرت کے بہترین ثمر ہوتے ہیں۔ بہترین سیرت رکھتے ہیں، بہترین کلام سناتے ہیں، بہترین عمل دکھاتے ہیں اور ایک طویل مدت تک ایک اعلیٰ ترین فطرت کا اعلیٰ ترین مظاہرہ کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ ایک بہترین جماعت تیار کر دیتے ہیں جو فطری ارتقاء کی اصلی شاہراہ پر اپنا مارچ بھی شروع کر دیتی ہے اب اس کے بعد بھی اگر کچھ بلید ایسے ہیں جن کے کان فطرت کی صداؤں اور نبی کی نداؤں سے بالکل غافل ہیں تو ان کو قدرت کس کام کے لیے باقی رکھے! انسان بنا کے محض جینے، کھانے پینے اور بچے پیدا کرنے کے لیے تو ان کو رکھ چھوڑنا لاحاصل ہے۔ اس کے لیے تو حیوانات موجود ہی ہیں جو یہ سارے کام بھی کر رہے ہیں اور اپنے سے برتر نوع کی خدمت کر کے ارتقاء کی شاہراہ پر بڑھ بھی رہے ہیں۔ ان کی ہدایت کے لیے جو جتن کیے جا سکتے تھے وہ کیے جا چکے۔ اب صرف یہ چیز باقی رہ گئی کہ اللہ تعالیٰ

اپنی قدرت کاملہ سے یا تو حقائق کے تمام پردے اٹھا دے اور انھیں تمام عالم غیب و شہادت کی سیر کرا دے یا ہدایت پر مجبور کر دے۔ لیکن یہ اکراہ اور کشف حجاب اس آزادی اور اس قانون آزمائش کے خلاف ہے جس کو ہم اوپر بیان کر چکے ہیں تو اب قدرت ان کو کس کام کے لیے جینے کی مہلت دے؟ یہ انسان بجز اس کے اب کیا کرے گا کہ جس غلط راہ پر خود چل پڑا ہے اسی پر ان کو بھی چلائے گا جن پر اس کا قابو چلے گا اور ان کو بھی جو اس کی صلب سے پیدا ہوں گے (اِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا)[1] اسی وجہ سے جن قوموں کے اندر انبیاء اور رسل بھیجے گئے، ان کے بارہ میں خدا کا قانون یہ رہا ہے کہ تکمیل دعوت اور اتمام حجت کے بعد ان کے صالحین کو چھانٹ کر الگ کر لیا گیا اور ان کے فاسقین و اشرار کو عذاب الٰہی کے ذریعے سے یا اہل حق کے ہاتھوں ختم کر دیا گیا اور بقائے اصلح کا قانون اسی کا مقتضی ہے۔

یہ سنت اللہ انبیاء کے ساتھ مخصوص ہے اور اس کے متعین ضوابط ہیں جو قرآن حکیم میں تفصیل کے ساتھ بیان ہوئے ہیں اور استاذ امام مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر سورۂ کافرون میں اس پر اجمالی اشارات ملیں گے۔ انبیاء کے علاوہ دوسرے اشخاص اور دوسری جماعتیں اس درجہ کا اتمام حجت نہیں کر سکتے کہ یہ طے ہو جائے کہ اب اس قوم میں قبول ہدایت کی صلاحیت باقی نہیں رہ گئی ہے اس لیے ان کو یہ حق نہیں ملا کہ وہ غیر صالح افراد کو ختم کر دیں الا آنکہ ایک شخص نے قبول ہدایت کے بعد جبت و ارتداد اختیار کیا ہو، کیونکہ اس کا ایک مرتبہ ہدایت کو قبول کرنا ہی اس امر کا ثبوت ہے کہ اس پر حق روشن ہو چکا ہے۔ ان کو غیر صالح افراد کے باب میں صرف

---

[1] اگر تو نے ان کو چھوڑے رکھا تو یہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے اور نہیں پیدا کریں گے مگر نابکار اور ناشکرے۔

یہ حق ملا ہے کہ ان کے ہاتھوں سے قیادت کی باگ چھین کر ان کو اپنی ماتحتی میں رکھیں تاکہ وہ زمین میں فساد پھیلانے کے بجائے ایک صالح قیادت میں رہ کر اور ایک سازگار ماحول میں پل کر، اگر کچھ گنجائش ہے تو اپنی اصلاح کر سکیں۔

اس تمام تفصیل سے یہ بات واضح ہو گئی کہ مذہب کا آغاز محبت کے جذبہ سے ہوا جو بچہ کی فطرت میں والدین کے لیے اور بالغوں کی فطرت میں والدین کے سوا منعم حقیقی کے لیے پیدا ہوا۔ اس محبت سے منعم حقیقی کے لیے شکر و حمد کا اور والدین کے ساتھ احسان کا جذبہ پیدا ہوا۔ منعم حقیقی کی حمد کے جذبہ نے اللہ کی عبادت کا تصور پیدا کیا۔ جس نے نماز کی صورت اختیار کی اور والدین کے ساتھ احسان کے جذبہ نے ان کی خدمت اور ان کے لیے انفاق کا تصور پیدا کیا جس نے ترقی کر کے ایتاء ذی القربی اور زکوٰۃ کی شکل اختیار کر لی۔ اس طرح روح انسانی کا ارتقاء شروع ہوا۔ حقوق اللہ کی ادائیگی کے تصور نے تمام عقائد و عبادات کو استوار کیا اور حقوق العباد کی ادائیگی کے تصور نے تمام اخلاق و معاملات کو استوار کیا۔ یہ فطرت اور خدا پرستی کی صراط مستقیم ہے یہی ارتقائے روح کی اصلی شاہراہ ہے۔ اس کے ایک سرے پر ابونا آدم علیہ السلام ہیں اور دوسرے پر خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلعم ہیں اور اس کے بیچ میں، وسط راہ پر، خدا کے ہزاروں لاکھوں انبیاء و رسل اور داعیانِ حق تھوڑے تھوڑے فاصلہ سے کھڑے ہیں۔ انھوں نے اپنے اپنے زمانہ میں اسی راہ پر چلنے کی دعوت دی لیکن انسان بار بار اس راہ پر آ کر اس سے منحرف ہوتا رہا اور زمین کی اصلاح کے بعد اس میں خرابیاں پیدا کرتا رہا۔ چنانچہ ہر نبی کو یہ کہنا پڑا (لَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا) زمین کی اصلاح کے بعد اس میں خرابی مت پیدا کرو۔

# ۹۔ شرک کا اصلی سبب

پچھلی فصل میں یہ بات نہایت وضاحت کے ساتھ بیان ہو چکی ہے کہ انسان کی فطرت کی اندر ایک منعم حقیقی کی محبت اور اس کے حمد و شکر کا جذبہ سب سے زیادہ قدیم اور سب سے زیادہ راسخ ہے۔ چنانچہ اسی بنیاد پر قرآن کا دعوی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام بنی آدم سے اپنی ربوبیت کا اقرار لیا ہے اور ہر ابن آدم نے بلیٰ کہہ کر اس عہد و اقرار میں شرکت کی ہے۔

| | |
|---|---|
| وَإِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِي آدَمَ | اور یاد کرو جب لیا تمھارے پروردگار |
| مِنْ ظُهُورِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ | نے بنی آدم سے یعنی ان کی پیٹھوں سے |
| وَأَشْهَدَهُمْ عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ | ان کی اولاد کو اور ان کو گواہ ٹھیرایا ان |
| أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوا بَلَىٰ | کے اوپر، کیا میں تمھارا پروردگار نہیں |
| شَهِدْنَا أَنْ تَقُولُوا يَوْمَ | ہوں، بولے ہاں ہم گواہ ہیں، یہ اس |
| الْقِيَامَةِ إِنَّا كُنَّا عَنْ هَٰذَا | لیے کہ تم قیامت کے دن یہ نہ کہہ سکو کہ |
| غَافِلِينَ (اعراف ۔ ۱۷۲) | ہم تو اس سے بے خبر تھے |

بعض لوگ اس پر شبہ وارد کرتے ہیں کہ کیا معلوم اس قسم کا کوئی عہد ہوا ہے یا نہیں نہ تو اس اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ کے سوال کی کوئی خبر ہے اور نہ یہی یاد ہے کہ ہم نے بلیٰ کہہ کر کسی عہد کی ذمہ داری اٹھائی ہے۔ یہ دونوں باتیں محتاج ثبوت ہیں۔ بالخصوص جب کہ اس کی اہمیت اس درجہ ہے کہ قیامت کے دن بہر شکل یہ عہد ہر ابن آدم پر حجت ہوگا۔

حیرت ہے کہ لوگوں کو کیا بات نہیں معلوم ہے؟ ایک انسان پانی کی ایک حقیر بوند کی شکل میں ماں کے پیٹ میں پڑتا ہے۔ ماں، نہیں معلوم کتنے مصائب جھیل کر

اور کتنے دکھ اٹھا کر نو مہینے اس کو پیٹ کے اندر ہی پالتی ہے۔ اپنے گوشت و خون سے اس کی پرورش کرتی ہے۔ پھر جان کی بازی کھیل کر ایک مضغۂ گوشت کی صورت میں اس کو جنتی ہے۔ پھر اپنے جسم کا ایک ایک قطرہ خون دودھ بنا کر اس کو پلاتی ہے اور برسوں کی جان کاہیوں کے بعد اس کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ زمین پر چل پھر سکے۔ اس کے بعد باپ کے ایثار، اس کی شفقتوں، اس کی غور پرداخت اور تربیت و نگہداشت کا دور آتا ہے جو ایک طویل عرصہ تک جاری رہتا ہے۔ اس عرصہ میں باپ جو کچھ اپنے لیے چاہتا ہے اس سے زیادہ بچہ کے لیے چاہتا ہے۔ وہ خود کم کھاتا ہے تاکہ بچہ کو کھلائے۔ وہ خود تکلیف اٹھاتا ہے تاکہ بچہ کو آرام پہنچائے۔ وہ اپنی جان جوکھوں میں ڈالتا ہے تاکہ بچہ ہر خطرہ سے محفوظ رہے۔ ماں باپ کی محبتوں، شفقتوں اور جانبازیوں کا یہ سلسلہ ہے جو ایک بچہ کو پال کر جوان بناتا ہے۔ اگر اس میں سے ایک کڑی بھی ٹوٹ جائے تو بچہ کی زندگی ہی خطرہ میں پڑ جائے۔

اب فرض کیجیے بچہ جوان ہوا اور والدین بڑھاپے کو پہنچے۔ اب یہ محتاج ہیں اور وہ مستغنی۔ لیکن بیٹا ان کا کوئی خیال نہیں کرتا اور اگر کوئی شخص اس کو والدین کے حقوق و فرائض یاد دلاتا ہے تو وہ جواب دیتا ہے کہ مجھے معلوم نہیں کہ ماں باپ کے کچھ حقوق و فرائض بھی ہیں۔ مجھے اس قسم کے کسی فرض یا ذمہ داری کی کوئی خبر نہیں ہے۔ میں نے اس قسم کے کسی حق کا کبھی اقرار نہیں کیا ہے تو کیا اس کا یہ جواب معقول ہوگا؟ ہر شخص ایسے بیٹے کو کمینہ اور لئیم کہے گا۔ کیونکہ وہ ایک ایسے حق اور ایسی ذمہ داری کا انکار کر رہا ہے جس سے زیادہ ثابت حق اور مسلم ذمہ داری کوئی اور نہیں ہے۔ یہ ذمہ داری ہر استحقاق کے ساتھ لگی ہوتی ہے۔ یہ بغیر تحریر کے نوشتہ بغیر گواہی کے ثابت اور بغیر مطالبہ کے مسلم ہے۔ یہ استحقاق (PRIVILEGE) اور ذمہ داری (RESPONSIBILITY) کا وہ فطری عہد ہے

جس سے زیادہ انسان پر کسی عہد کی بھی پابندی عائد نہیں ہوتی۔

اسی بنیاد پر ایک انسان اس عورت کے لیے نان نفقہ اور حفاظت وحرمت کا حق تسلیم کرتا ہے جس سے متمتع ہوتا ہے۔ اسی بنیاد پر آدمی پر اس کے خاندان اور قبیلہ کی حفاظت و نصرت کے فرائض عائد ہوتے ہیں۔ اسی بنیاد پر ایک شہر کی میونسپلٹی اپنے شہریوں کی کمائی میں حصہ دار بنتی ہے۔ اسی بنیاد پر ایک سلطنت اپنی رعایا سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ اپنے علم و قابلیت، اپنے وقت اور آزادی اور اپنے جان و مال میں اس کو شریک کریں اور اگر سلطنت کا وجود کسی خطرہ میں پڑ جائے تو رعایا اس کے بچاؤ کے لیے سب کچھ قربان کر دے۔

اب فرض کیجیے ایک شخص ایک عورت کی حرمت کا مالک تو بن بیٹھا، لیکن اس کے نان و نفقہ کی ذمہ داری اور اس کے حقوق و فرائض سے انکار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میں نے اس قسم کا کوئی اقرار نہیں کیا ہے۔ یا ایک شہری میونسپلٹی کی سڑکوں پر چلتا تو ہے، اس کے حفظانِ صحت کے انتظام سے فائدہ تو اٹھاتا ہے، اس کے پارکوں اور چمنوں سے متمتع تو ہوتا ہے، اس کی جلائی ہوئی لالٹینوں سے روشنی تو حاصل کرتا ہے، اس کے قائم کیے ہوئے مدرسوں سے منتفع تو ہوتا ہے لیکن جب اس کے مطالبات کا وقت آئے تو کہہ دے کہ میں اس قسم کی کوئی ذمہ داری تسلیم نہیں کرتا۔ یا اسی طرح ایک آدمی ایک سلطنت کے اندر شہریت کے جملہ حقوق سے متمتع ہو رہا ہے۔ اس کے امن و عدل سے فائدہ اٹھا رہا ہے، اس کے قانون اور نظام کی بدولت وہ ایک ملکیت کا مالک، ایک بیٹے کا باپ، ایک بیوی کا شوہر، ایک سلطنت کا شہری تو بنا ہوا ہے لیکن جب سلطنت کے مطالبات کا وقت آئے تو وہ جواب دے دے کہ میں اس مطالبہ کی ذمہ داری سے بری ہوں۔ میں نے اس قسم کے بار اٹھانے اور قسم کی جوکھم میں پڑنے کا کبھی اقرار نہیں کیا تھا تو کیا اس کے

جوابات صحیح ہوں گے؟ بیوی کہے گی یہ عذر غلط ہے۔ جس دن تونے میری حرمت پر آزادانہ تصرف کیا اور میں نے اپنا جسم تیرے سپرد کیا اسی دن تونے ان ساری ذمہ داریوں کے لیے مجھ سے ایک میثاقِ غلیظ کیا ہے اور زبانِ خلق بیوی کو برحق اور شوہر کو لئیم اور کمینہ قرار دے گی۔ یہی جواب ایک قبیلہ اپنے بزدل اور حق ناشناس فرد کو دے گا۔ یہی جواب ایک میونسپلٹی اپنے نادہند شہری کو ایک حکومت اپنے نمک حرام باشندے کو دے گی۔ اور تمام دنیا اس جواب کو بالکل جائز اور ایسے کمینوں کے لیے ہر سزا کو بالکل واجبی قرار دے گی۔ کیونکہ ہر استحقاق کے ساتھ ذمہ داری کا لزوم اس قدر بدیہی ہے کہ آسمان کا سورج بھی اتنا بدیہی نہیں ہے۔

اسی استحقاق اور ذمہ داری کے فطری اور ہمہ گیر قانون کی بنا پر ہمارے گھر کی پلی ہوئی مرغی، ہمارے تھان پر بندھی ہوئی گائے اور گھوڑے، ہمارے چمن میں لگے ہوئے پودے اور ہمارے باغ میں اُگے ہوئے درخت کے بھی ہم پر حقوق ہیں اور ہم نہایت لئیم ٹھہریں گے، اگر ان حقوق کا انکار کردیں۔ جس مرغی کے انڈے اور چوزے ہم کھاتے ہیں لازم ہے کہ بلّیوں اور کتوں سے اس کی حفاظت کریں۔ ہم جس گائے کا دودھ پیتے ہیں اور جس گھوڑے پر سوار ہوتے ہیں ہم پر حق ہے کہ ہم ان کے گھانس اور دانے کے کفیل ہوں۔ ہم جس پودے کے پھول سے معطر مشام اور جس درخت کے پھل سے لذت اندوز اور خوش کام ہوتے ہیں ہم پر واجب ہے کہ ان کو سینچیں، ان کو گوڑیں اور ان کو کھاد دیں اور سردی کی آفتوں اور لو کی مصیبتوں سے ان کو بچائیں۔ ہم ان کے حقوق کا انکار نہیں کر سکتے۔ ہم نے جس دن ان کے وجود سے کسی قسم کی لذت و راحت حاصل کی اسی دن ان کے حقوق کا اقرار کر لیا۔ یہ استحقاق اور ذمہ داری کا عہد ہے جو ہر نافع اور متنفع میں نہ خود واقع ہو جاتا ہے اور انسان کی فطرت اور دنیا کے معروف میں اس سے زیادہ کوئی چیز

اہم اور واجب الاحترام نہیں ہے۔

اب غور کیجیے کہ جب ہم کو ماں باپ کے حقوق سے انکار کا حق نہیں ہے تو ان سے کہیں بڑھ کر اس کا حق ہے جس نے ماں باپ کو پیدا کیا ہے۔ جب ہمارے لیے بیوی کے حقوق سے انکار کی گنجائش نہیں ہے تو اس کے حق سے کیسے انکار ممکن ہے جس نے مرد کی سکینت کے لیے عورت کو وجود بخشا؟ جب ہم خاندان اور قبیلہ، بادشاہ اور سلطنت کے حقوق مانتے ہیں تو وہ جس نے خاندان اور قبیلہ کو وجود بخشا، جس نے بادشاہی اور سلطنت کی شیرازہ بندی کے لیے انسانی فطرت کے اندر عصبیت کی چسپیدگی اور اجتماعیت پسندی کی پیوستگی بخشی، ان سے کہیں بڑھ کر اس بات کا حق دار ہے کہ ہم اس کے عہد ربوبیت کا اقرار کریں۔ جب ہم مرغی اور بلّی تک کا حق مانتے ہیں، گائے اور گھوڑے تک سے ایک خاموش معاہدۂ استحقاق و ذمہ داری کا اعتراف کرتے ہیں تو آخر اس کے عہد سے ہمیں کیوں انکار ہو جس نے گائے اور گھوڑے، دشت و چمن، دریا اور پہاڑ، سورج اور چاند، ہوا اور پانی، آگ اور مٹی سب کو وجود بخشا اور سب کو ہماری ہستی کے قیام کے لیے سازگار اور نفع رساں بنایا۔

پس یہ بات تو بالکل غلط ہے کہ انسان کو اس عہد کا علم نہیں ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اس عہد سے عہدہ برا ہونا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ ہم پچھلی فصل میں بیان کر چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر اپنی محبت اور طلب کا جذبہ دے کر اس کی راہ میں خوف اور طمع، رغبت اور رہبت کے بہت سے عقبات ڈال دیے ہیں تاکہ اس کے اختیار و آزادی کا امتحان ہو اور ہر شخص اپنی ہمت و قابلیت

---

[1] یہاں اس بات کو یاد رکھنا چاہیے کہ گیتا میں اس شخص کی مثال چور سے دی گئی ہے جو خدا کی نعمتوں سے فائدہ تو اٹھاتا ہے لیکن اس کے لیے قربانی نہیں کرتا ہے۔

کے اعتبار سے خدا کے یہاں درجہ اور عزت حاصل کر سکے۔ یہی عقبات ہیں جو ایک طالبِ صادق اور ایک بوالہوس کے درمیان امتیاز کی کسوٹی ہیں۔ جو اہل ہمت ہوتے ہیں وہ تو ہر پست و بلند اور ہر سہل و صعب کو طے کرتے ہوئے خدا تک پہنچ کر ہی دم لیتے ہیں۔ نہ راہ کے کسی خطرہ کی پروا کرتے اور نہ کسی طمع کی طرف ملتفت ہوتے ہیں۔ وہ اپنی فطرت کی صدائے جرس برابر سنتے ہیں اور اس کی کشش انہیں اتنی مہلت ہی نہیں دیتی کہ وہ تلوے کے آبلوں اور کانٹوں کی جلن اور چبھن کا خیال کر سکیں۔ لیکن جو پست ہمت اور دنی الفطرت ہوتے ہیں وہ ان عقبات میں سے کسی عقبہ کے پاس ہمت ہار کر بیٹھ جاتے ہیں۔ بس یہی دناءت اور پست ہمتی ہے جو درحقیقت غیر اللہ کی بندگی اور شرک کا اصلی سبب ہے۔ انسان اپنے درجہ اور علوئے منصب کا خیال نہیں کرتا اور جہاں کوئی گھنی چھاؤں یا کوئی خطرہ دیکھتا ہے وہیں کمر کھول کر بیٹھ جاتا ہے۔ یہ دناءت اور پست ہمتی جن گوناگوں شکلوں میں ظاہر ہوتی ہے اور اس نے انسان کو جس جس طرح غیر اللہ کی پرستش میں مبتلا کیا ہے اس کی تفصیل کا تو یہاں موقع نہیں ہے لیکن ذہن میں اس کا تصور پیدا کرنے کے لیے چند ضروری باتیں یہاں ہم ذکر کریں گے۔

سب سے پہلے اس بات پر غور کیجیے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے اس کی ذات کے اندر ایک چھوٹی سی بادشاہی بخشی ہے۔ اس کے وجود کی تقویم اس طرح فرمائی کہ اس کو بہترین قابلیتوں اور بہترین قوتوں سے آراستہ کیا۔ اس کو کھانے پینے، اوڑھنے پہننے، بیوی بچے، گھر گرہستی کی خواہشیں دیں۔ تاکہ ان خواہشوں کی تحریک سے وہ اپنی بقائے ذات اور بقائے نوع کی قابلیتوں کو بروئے کار لا سکے۔ اس کو عقل عنایت فرمائی جو خیر و شر میں امتیاز کرنے والی ہے۔ دل عنایت فرمایا جو بلند ارادوں کا مخزن ہے۔ روح عنایت فرمائی جس میں اپنی

طلب وجستجو ودلیعت کی اور ان سب پر اس کو اختیار بخشا کہ وہ ان سب پر حکومت کرے اور ان کو اپنے رب کی رضا کی راہ میں استعمال کر کے خدا کے یہاں بلند سے بلند تر مرتبہ حاصل کرے۔ لیکن اس نے دیکھا کہ اس کو جتنی چیزیں ملی ہیں ان میں خواہشیں سب سے زیادہ لذیذ ہیں، ان کی لذت نقد اور ان کا نفع عاجل ہے۔ پس وہ ان کا اس درجہ گرویدہ ہوا کہ اس نے اپنی ساری سلطنت ان کے حوالہ کر دی۔ اس نے اپنے حواس خمسہ کو حکم دے دیا کہ وہ خواہشوں کی اطاعت کریں اور جو کچھ انھیں مطلوب ہے صرف اس کی تلاش میں اپنے آپ کو سرگرم رکھیں۔ اس نے عقل کی عدالت معطل کر دی تاکہ ان خواہشوں کے خلاف کوئی مرافعہ نہ ہو سکے۔ اس نے دل کو بھی ان خواہشوں ہی کے تصرف میں دے دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بس وہ بطن و فرج کا بندہ بن کر رہ گیا۔ اور اس کی مثال بالکل اس بادشاہ کی ہو گئی جو اپنی کسی لونڈی پر اس درجہ فریفتہ ہو جائے کہ اپنے آپ کو اور اپنی پوری مملکت کو اس کے امر و نہی کے حوالہ کر دے اور اس کی سلطنت کے تمام شرفاء و علماء اور تمام مدبرین ملک و اعضائے سلطنت اس لونڈی کے غلام بن کے رہ جائیں۔ یہ اَفَمَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ[1] کی صورت ہوئی اور ظاہر ہے کہ یہ انسان کی فطرت نہیں بلکہ اس کی دنائت کا نتیجہ ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ماں باپ بنائے، بیوی بچے بخشے، خویش و اقارب دیے۔ کنبہ و خاندان اور قبیلہ و قوم کی جمعیت بخشی، مال و جائداد عنایت فرمائی۔ جانوروں کے گلّے دیے تاکہ انسان ان کے اندر اور ان کے ذریعہ سے اپنی ان مدنی و اجتماعی قابلیتوں کو بروئے کار لائے جو اس کے اندر ودلیعت ہیں۔ اور اس مدینۂ فاضلہ کی تخلیق کرے جس کا وہ خدا کا خلیفہ ہونے کی وجہ سے اہل ہے

---

[1] کیا وہ جس نے اپنی خواہش کو معبود بنا رکھا ہے؟

لیکن انسان نے ان سارے وسائل مقصد کو اصل مقصد بنالیا۔ وہ ماں باپ کی محبت میں ایسا مستغرق ہوا کہ اس نے پدرپرستی کی بنیاد ڈال دی۔ بیوی بچوں کی محبت میں ایسا گرفتار ہوا کہ خدا اور اس کے حکموں کو بھول گیا۔ کنبہ و خاندان اور قبیلہ کی عصبیت میں ایسا پھنس گیا کہ ان کے لیے خدا اور اس کے رسولوں سے بغاوت کر بیٹھا۔ یہاں تک کہ اس محبت کے غلو میں اس نے آباپرستی اور قبائلی دیوتاؤں کی پرستش شروع کر دی۔ وہ مال و جائداد کے عشق میں ایسا مبتلا ہوا کہ انہی کو معبود خیال کرنے لگا حد یہ ہے کہ جن جانوروں کو اس نے نافع پایا ان کو بھی اس نے دیوتا بنالیا۔ گائے بیل، ہاتھی، گھوڑے وغیرہ سب اسی طرح اس کے دیوتا بن گئے۔ اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں بطور مرکب اسے عنایت کیں ان کو اس نے راکب بنالیا اور جو چیزیں بطور کمند کے دیں کہ ان کے سہارے سے خدا تک پہنچ سکے، ان کمندوں کو اس نے اپنے پاؤں اور اپنی گردن میں پھندا بنا کر ڈال لیا۔

اللہ تعالیٰ نے بے شمار نعمتیں ایسی بخشیں جو انسان کے لیے یکسر نفع ہی نفع تھیں۔ اپنی نفع رسانیوں کے عوض میں، بیوی بچوں، قوم و قبیلہ اور گائے گھوڑے کی طرح آدمی سے کسی حق اور ذمہ داری کا مطالبہ نہیں کرتی تھیں، مثلاً سورج، چاند ستارے، قوس قزح، ابر، ہوا، آگ، پانی، زمین، دریا، پہاڑ، فضا کی چڑیاں وغیرہ۔ یہ چیزیں اللہ تعالیٰ نے اس لیے عنایت فرمائی تھیں کہ انسان ان کے وجود سے متمتع ہو اور ان کے حقوق کی ذمہ داری سے بالکل بے فکر رہ کر اپنے اوقات صرف رضائے مولا کے کاموں میں مشغول رکھ سکے۔ لیکن انسان نے جب دیکھا کہ اتنے نافع ہونے کے باوجود یہ اس سے کسی عوض کے طلب گار نہیں ہیں تو ان کی اس مفت فیض رسانی پر ایسا ریجھا کہ ان میں سے ہر نعمت کو اس نے منعم کا درجہ دے کر اس کی عبادت شروع کر دی۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ ایک بادشاہ اپنے

کسی مقرب خاص کو بہت سے غلام اور لونڈیاں عنایت کرے اور ان کی ساری فرمداریاں بھی اپنے سر لے تاکہ وہ مقرب خاص اپنی اور اپنے خدام کی ساری ذمہ داریوں سے بالکل سبکدوش رہ کر اپنی ساری توجہ صرف سلطنت کے امور مہمہ پر صرف کر سکے لیکن وہ مقرب خاص ان غلاموں اور لونڈیوں کی اس بے مزد و بے صلہ خدمات پر اس طرح ریجھ جائے کہ ان ہی کو بادشاہ تصور کر کے ان ہی کی بندگی اور اطاعت کرنے لگ جائے اور بادشاہ اور اس کی سلطنت کو بالکل بھول جائے۔

اسی طرح بہتوں پر اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتوں کی بارش کی، ان کو ملک و مال دیا۔ عزت و رتبہ بخشا، تخت و تاج عنایت کیا تاکہ ان کو آزمائے کہ وہ اس کی بندگی کرتے ہیں یا اس سے بغاوت کرتے ہیں، زمین پر اس کا قانون چلاتے ہیں یا اپنا قانون چلاتے ہیں۔ امن و عدل پھیلاتے ہیں یا ظلم و فساد پھیلاتے ہیں۔ لیکن انھوں نے یہ سمجھ کر کہ یہ سب کچھ ان کے استحقاق و قابلیت کا ثمرہ ہے، تکبر کیا اور بندگی کی جگہ خدائی شروع کر دی۔ کوئی یہ سمجھ بیٹھا کہ ہم خدا کے اوتار ہیں جیسے مصر کے اوتار بادشاہ (GOD KINGS) اور ہندوستان کے قدیم راجے اپنے آپ کو دیوتا کی حیثیت سے اپنی رعایا سے پجواتے تھے۔ مسلمان بادشاہوں میں سے اکبر کو بھی اس کے جاہل اور خوشامدی درباریوں نے اسی قسم کے خبط میں مبتلا کر دیا تھا۔ کوئی اپنے تئیں آسمانی مخلوق خیال کرنے لگا۔ مثلاً چین جاپان کے بادشاہ اپنے آپ کو بشریت سے مافوق سمجھتے تھے۔ مصر میں پہنچ کر سکندر بھی اسی مرض میں مبتلا ہو گیا تھا۔ ان طاغوتوں کی مثال ایسی ہے کہ کوئی بادشاہ اپنے کسی غلام کو کچھ خدم و حشم دے کر اپنی مملکت کے کسی علاقہ میں انتظام پر مامور کرے اور وہ غلام خدم و حشم پا کر ایسا بدمست ہو کہ وہاں پہنچ کر اپنی بادشاہی کا علم گاڑ دے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے بہتوں کو مال و متاع کی ذمہ داریوں سے سبکدوش رکھا

اور مقصود اس سے انسان کے صبر و رضا کا امتحان تھا کہ دیکھے کہ یہ لوگ طمع دُنیا میں پھنس کر خدا کے باغیوں ہی کو معبود بنا لیتے ہیں یا اپنے خشک نوالوں پر قانع رہ کر اپنی فطرت کے عہد پر قائم رہتے ہیں لیکن بہتیرے اس امتحان میں پورے نہیں اترتے اور خدا کی جگہ اس کے باغیوں ہی کے تقرب کے طالب ہوئے اور ان کے لیے بندگی و نیازمندی کی وہ ساری رسمیں بجالائے جو رب کائنات کے سوا کسی کے لیے جائز نہیں ہو سکتیں۔ ان ہی لوگوں نے خدا کے ان باغیوں کو ان کی زندگی میں خداوند نعمت اور اَن داتا وغیرہ بنایا اور مرنے کے بعد ان کے مقبرے، اسٹیچو اور بت تعمیر کرائے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے بہت سے بندوں پر روحانی برکتیں نازل کیں۔ بعض کو اپنا سفیر و پیغمبر بنایا۔ اللہ کے ان خالص و مخلص بندوں نے کبھی لوگوں کو غیر اللہ کی بندگی کی دعوت نہیں دی لیکن کچھ زمانہ گزرنے کے بعد ان کے دنیا طلب مریدوں اور ان کی محبت کے جھوٹے مدعیوں نے بیشتر اپنے دنیاوی اغراض کے لیے ان ان کو لے جا کر خدا کی صف میں بٹھا دیا۔ حضرت مسیح علیہ السلام اور بہت سے اولیاء و مشائخ اسی طرح خدا کے شریک بنا دیے گئے۔

اسی طرح سیاسی و معاشی اغراض بھی اکثر شرک و بت پرستی کے باعث ہوئے۔ قدیم تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت سی قوموں نے دوسری قوموں کے بت محض ان کے ساتھ سیاسی تعلقات استوار رکھنے کے لیے پوجے۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوا کہ فاتح قوموں نے مفتوح قوموں کی دلجوئی کے لیے ان کے بتوں کو اپنے معبدوں میں جگہ دی۔ ہندوستان میں اکبر نے اسی مقصد سے بہت سی خفیف الحرکتیاں کیں۔ قریش نے خانہ کعبہ کو تمام قبائل عرب کے بتوں کا معبد اعظم بنا دیا تاکہ اس طرح تمام قبائل پر اپنی سیادت رکھ سکیں۔ بنی اسرائیل کی تاریخ کے مطالعہ سے

معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے بھی بارہا اس قسم کے رذیل مقاصد کے لیے پڑوس کی مشرک قوموں کے بت پوجے اور یہ تو ان کی تاریخ کی ایک عام حکایت ہے کہ انھوں نے مشرک قوموں کی عورتوں سے شادیاں کیں اور ان کے ساتھ ان کے اصنام اور ان کے مشرکانہ عقائد و رسوم بھی اپنے گھروں میں لائے اور پھر ان سے جو اولادیں پیدا ہوئیں وہ بھی لازماً شرک پر اٹھیں۔ مسلمانوں پر انگریزوں اور مغربی قوموں کے غلبہ اور ہندوؤں کے ساتھ اشتراک و ارتباط کی وجہ سے جو اثرات پڑے یا پڑ رہے ہیں (اور اگر حالات نہ بدلے تو) پڑیں گے وہ ہر واقفِ حال کے سامنے ہیں۔

یہ چند مثالیں طمع و رغبت کے عقبات کی بیان ہوئی ہیں۔ اب چند مثالیں عقباتِ خوف کی بھی لیجیے۔

اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں جو چیزیں ضرر ناک، خطرناک اور ہولناک نظر آئیں انسان نے ان کو بھی خدا کی خدائی میں شریک بنا لیا۔ انسان اپنی بے اعتدالیوں اپنی گندگیوں اور اپنی کاہلیوں کے نتیجہ میں بیماریوں میں مبتلا کیا گیا تاکہ وہ اعتدال اور پاکیزگی و مستعدی کے اس نقطۂ کمال تک ترقی کرے جو اس کے احسن تقویم میں پیدا کیے جانے کا مقتضی ہے لیکن انسان کے نفس پر اعتدال کی پابندیاں، صفائی کی احتیاطیں اور مستعدی کی زحمتیں شاق گزریں اور یہ سارے پاپڑ بیلنے کے بجائے اس نے سہولت اس میں دیکھی کہ ان بیماریوں کے اندر روحیں مان کر ان کی دہائی دینے لگا اور ان کو نذریں اور قربانیاں پیش کرنے لگا۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ کسی شخص کو کسی پتھر سے ٹھوکر لگ جائے اور وہ بجائے اس کے کہ آئندہ آنکھیں کھول کر چلنے کا عہد کرے اور جلد بازی سے احتراز کرے، ٹھوکر لگانے والے روڑے کے پاس ایک مندر بنا کے بیٹھ جائے اور اس کے سامنے ڈنڈوت شروع کر دے، یا ایک شخص کے کپڑے میں جوئیں پڑ جائیں اور اس کو ستانے لگیں

تو نہانے اور کپڑے دھونے کی زحمت اٹھانے کے بجائے وہ ان کے دفع کرنے کی یہ تدبیر کرے کہ ہر صبح اس کی جے پکارنے لگے۔

اسی طرح انسان نے دیکھا کہ سانپ ڈستے ہیں، بچھو ڈنک مارتے ہیں، شیر اور بھیڑیے پھاڑ کھاتے ہیں۔ ان چیزوں کے پیدا کرنے میں اللہ تعالیٰ کی جہاں بہت سی حکمتیں ہیں وہاں ایک بہت بڑی حکمت یہ بھی ہے کہ یہ انسان کو مدنیت، اجتماعیت اور صفائی کی اعلیٰ قابلیتوں کو بروئے کار لانے کے لیے محرک کا کام دیتی ہیں۔ یہ چیزیں انسان کو مجبور کرتی ہیں کہ وہ جنگلوں کو صاف کر کے میدان بنائے، پہاڑوں کو تراش کر گھر بنائے، انفرادی زندگی کو ترک کر کے مدنی و اجتماعی زندگی اختیار کرے اور اس کے اندر حفاظت و مدافعت کی جو قابلیتیں پوشیدہ ہیں ان کو فروغ دے۔ اگر یہ درندے اور اژدہے نہ ہوتے تو انسان خود ہی درندوں کے بھٹوں اور اژدہوں کے غاروں میں رہنے والی ایک مخلوق بن جاتا اور مدنیت کے یہ سارے جلوے جو آج نظر آرہے ہیں ان میں سے ایک بھی ظہور میں نہ آتا۔ لیکن جن انسانوں کو یہ ساری تبدیلیاں شاق معلوم ہوئیں اور وہ جس حال میں تھے اسی میں انھوں نے پڑے رہنا چاہا۔ انھوں نے یہ سارے جتن کرنے کے بجائے ان کو جنگل کے دیوتا قرار دے کر ان کی پرستش شروع کر دی کہ اس طرح ان کو راضی رکھ کر ان کے خطرات سے مامون رہ سکیں گے۔ ان کی مثال بالکل ایسی ہے کہ کوئی کاہل الوجود انسان کسی گندی جگہ میں گھر گیا ہو یا کسی دھوئیں بھرے ہوئے مکان کے اندر بند ہو گیا ہو اور اس کی قوت شامہ اور اس کے تنفس کا دباؤ اسے مجبور کر رہا ہو کہ وہ باہر کسی کھلے میدان میں اور تازہ ہوا میں نکلے لیکن اس کی کاہلی اس سے مانع رہی ہو اور وہ غلاظت کے ڈھیر یا دھوئیں کی عبادت شروع کر دے کہ اے غلاظت کی روح! اور اے دھوئیں کے دیوتا! مجھ پر ترس کھاؤ! تمھاری دہائی ہے۔

اسی طرح قدرت نے جو ہر گوشہ میں نہایت رحیم و مہرباں واقع ہوئی ہے کبھی کبھی اپنے عدل اور جبروت کے پہلو کو نمایاں کرنے کے لیے زمین کو ہلا دیا، کبھی پہاڑوں سے آگ برسا دی، کبھی ہواؤں کو طوفان بنا دیا، کبھی آسمان سے بجلیاں گرا دیں تاکہ انسان خدا کی رحمت کے غرہ میں اس کے عدل کو بھول نہ بیٹھے بلکہ اس کے قہر و غضب کو بھی یاد رکھے کہ اگر اس میں طغیان پیدا ہوا تو خدا ان ہی چیزوں میں سے، جو اس کی نفع رسانی کے لیے ہر وقت سرگرم کار ہیں، جس چیز کو چاہے گا اس کے لیے سرکش بنا دے گا۔ لیکن انسان بجائے اس کے کہ ان تازیانوں کے ڈر سے خدا کی طرف بھاگتا وہ ان تازیانوں ہی کی طرف بھاگا اور جس طرح اس نے نعمتوں کو منعم کی حیثیت دے دی تھی اسی طرح اس نے نقمتوں کے ان ذرائع کو منتقم کا درجہ دے دیا۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ ایک بادشاہ جس نے اپنی رعیت کو ہر طرح کا امن و چین دے رکھا ہو کبھی کبھی اپنی فوجی قوتوں کا مظاہرہ کرے کہ رعایا یاد رکھے کہ جس بادشاہ کے پاس امن و راحت کے یہ سامان ہیں اس کے قبضۂ قدرت میں تادیب و تعذیب کی یہ قوتیں بھی ہیں۔ لیکن رعایا یہ کرے کہ ان قوتوں ہی کو بادشاہ بنا کر ان ہی کی تعظیم و بندگی کرنے لگ جائے اور خود بادشاہ کو نظر انداز کر دے۔

اسی طریقہ پر وہ لوگ بھی معبود بن گئے جن کو ان کی سرکشی اور طغیان کے باوجود اللہ تعالیٰ نے اس لیے مہلت دی کہ وہ اپنی اجل مقدر کو پہنچ جائیں۔ نیز ان کے ذریعے سے ان لوگوں کو جانچ ہو سکے جو کسی نوعیت سے ان کے زیر دست ہیں کہ وہ اپنی روح کے عہد پر قائم رہتے ہیں یا اپنے جسم و تن کے مفاد کے لیے ان سرکشوں ہی کے آگے جھک جاتے ہیں اور انہی کی ہاں میں ہاں ملانی شروع کر دیتے ہیں۔ اس زمرہ میں انسانوں کے اندر کے سرکش بھی شامل ہیں اور جنات کے اشرار

بھی شامل ہیں۔ دنیا کی پوری تاریخ میں ڈھیل اور آزمائش کا یہ قانون نمایاں نظر آتا ہے۔ فرعون، قارون، ہامان، ابولہب، ابوجہل اور ان کے راستوں پر چلنے والے تمام سرکش انسان ایک صف میں ہیں اور نوح، ابراہیم، موسیٰ اور محمد علیہم السلام اور اللہ کے تمام صالح اور مخلص و موحد بندے اس کی دوسری صف میں ہیں۔ یہ کشمکش ابتدا سے جاری ہے اور قانونِ الٰہی کے مطابق قیامت تک جاری رہے گی۔ کتنے ہیں جو اپنی روح کے تقاضوں کو جانتے ہوئے کسی طمع یا کسی اندیشہ سے ان جباروں اور طاغوتوں ہی کی عبادت شروع کر دیتے ہیں اور انہی کا کلمہ پڑھنے لگتے ہیں۔ لیکن خدا کے کتنے بندے ایسے بھی نکلتے ہیں جو کسی حال میں بھی اپنے خدا اور اپنی روح سے شرمسار نہیں ہوتے اور نہ صرف خود ہی عہدِ الٰہی پر قائم رہتے ہیں بلکہ دوسروں کو بھی قائم رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

شر کے اس خوف نے شر پرستی کو ایک مستقل دین بنا دیا ہے اور مجوسیوں نے خیر و شر کے دو خدا قرار دے کر دونوں کی پرستش کی اور ہندوؤں نے دنیاوی سلطنتوں کے ڈھنگ پر زندگی بخشنے والے، زندگی کی حفاظت کرنے والے اور زندگی لینے والے کی ایک تثلیث قائم کر دی۔ ایران و ہندوستان کی قوموں میں زمانہ قدیم سے فلسفہ کا ذوق غالب رہا ہے۔ اس وجہ سے انھوں نے اپنی حماقتوں پر فلسفہ کا روغن مل دیا ہے ورنہ غور کیجیے تو یہ حقیقت صاف نظر آئے گی کہ ان کے اندر جو شرک پایا جاتا ہے وہ بھی انھی راستوں سے آیا ہے جن راستوں سے دنیا کی دوسری قوموں کے اندر آیا ہے۔ تعجب ہے کہ ان قوموں پر فلسفہ کے غلبہ کے باوجود کائنات کے اضداد کے اندر توافق کا راز واضح نہ ہو سکا حالانکہ اس کے ہر تضاد کے اندر وہی وحدتِ مقصد مضمر ہے جو زوجین میں ہوتی ہے اور قرآن نے اس کی گوناگون شکلوں میں بیان کیا ہے جس کی تفصیل ہماری کتاب

"حقیقتِ توحید" میں بیان ہوئی ہے۔

یہ چند مثالیں محض رہنمائی کے لیے ذکر کی گئی ہیں۔ آپ بت پرستی کی کوئی تاریخ اٹھا کر اس نقطۂ نظر سے پڑھ لیجیے۔ آپ پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ غیر اللہ کی طاعت و عبادت خواہ وہ مردہ خداؤں کی پوجا کی شکل میں ہو یا زندہ خداؤں کی بندگی کی صورت میں، نتیجہ ہے صرف انسانوں کی دناءت کا۔

اسی دناءت ہی کی ایک شکل تقلیدِ اعمیٰ بھی ہے۔ انسانوں کے ایک بڑے حصہ نے نہ تو کبھی خود حقیقت پر غور کیا نہ دوسرے غور کرنے والوں اور خدا کے بھیجے ہوئے بندوں کی دعوت پر غور کیا۔ انھوں نے باپ دادا کو جس دھڑے پر پایا اسی پر آنکھیں بند کر کے چلتے رہے۔ ان کو یہ کام بڑا مشکل معلوم ہوا کہ باپ دادا کے رستے سے کوئی الگ راہ نکالیں۔ لیکن اگر انسان جانور نہیں ہے بلکہ ایک عاقل اور صاحبِ اختیار و ارادہ مخلوق ہے تو جانور بن جانا اور اپنی عقل کو معطّل کر دینا اس کی دناءت ہی کا نتیجہ ہو سکتا ہے۔

دنیا میں بہت سے ایسے لوگ بھی گزرے ہیں جو طریقۂ آبا کے اندھے مقلد نہیں تھے بلکہ انھوں نے روشِ قدیم میں بہت کچھ تبدیلیاں پیدا کیں اور اپنے فکر و نظر کے زور سے وقت کے رجحانات کا رخ پھیر دیا۔ بعضوں نے اس راہ میں بڑی بڑی قربانیاں بھی کیں۔ یہاں تک کہ بعض ہمت دروں نے زہر کا پیالہ تک پی لیا، بایں ہمہ توحید کا راز ان پر نہ کھل سکا اور وہ انھی ضلالتوں میں بھٹکتے رہے جن میں ان کی پوری قوم بھٹک رہی تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں سے اکثر ایسے تھے جو بہت سے عقبات طے کرنے کے باوجود قوم پرستی کے عقبہ کو عبور نہ کر سکے اور توحیدِ خالص تک پہنچنے کے لیے یہ شرط ہے کہ آدمی کوئی تسمہ لگا نہ چھوڑے اور یہ سعادت یا تو حضراتِ انبیاءِ کرام علیہم السلام کو حاصل ہوتی ہے یا ان لوگوں

کو حاصل ہوتی ہے جو ان کی بیوی کی ہمت کریں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی توفیق پائیں۔

۔اوپر ہم نے شرک کا جو سبب بیان کیا ہے قرآن مجید اور قدیم صحیفوں سے اسی کی تائید ہوتی ہے۔ قرآن میں شرک کو ظلم عظیم کہا گیا ہے۔ (اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ) ظلم عدل کا ضد ہے۔ اس کے معنی ہیں کسی کی حق تلفی کرنا۔ اوپر ہم یہ بات تفصیل کے ساتھ لکھ چکے ہیں کہ انسان پر سب سے بڑا حق اللہ تعالیٰ کا ہے۔ پس اس کے حق میں کسی کو ساجھی قرار دینا لازماً سب سے بڑے حق کو تلف کرنا ہے اس وجہ سے یہ ظلم عظیم ہوا اور حق تلفی کا دنائت ہونا بدیہی ہے۔ اور جس درجہ کی حق تلفی ہوگی اسی درجہ کی دنائت بھی ہوگی۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ قدیم صحیفوں میں مشرک کو چھنال سے تشبیہ دی گئی ہے۔ توریت میں یہ مضمون اکثر بیان ہوتا ہے کہ خداوند خدا غیور ہے جس طرح تم یہ نہیں پسند کرتے کہ تمہاری بیوی غیر کی بغل میں سوئے اسی طرح وہ نہیں پسند کرتا کہ اس کا بندہ غیر کی بندگی کرے۔ قرآن مجید کی پاکیزگیٔ بیان نے اس تشبیہ کو بعینہ تو نہیں اختیار کیا ہے لیکن اس کے مفہوم کو نہایت خوبی کے ساتھ لے لیا ہے۔ چنانچہ بعض جگہ قرآن میں مشرک اور زانی اور مشرکہ اور زانیہ کو ایک ساتھ جمع کیا ہے مثلاً سورہ نور میں فرمایا ہے الزانی لاینکح الازانیۃ او مشرکۃ والزانیۃ لاینکحھا الازان او مشرک وحرم ذلک علی المومنین (زانی نہ نکاح کرنے پائے مگر زانیہ یا مشرکہ سے اور زانیہ سے نکاح نہ کرے مگر کوئی زانی یا مشرک اور مومنوں پر یہ حرام ہے) دو چیزوں کا ایک ساتھ اجتماع بغیر کسی اشتراک کے نہیں ہوا کرتا۔ اس اصل کو سامنے رکھ کر آدمی جب غور کرتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ مشرک اور چھنال عورت میں نہایت گہری اخلاقی مناسبت ہے۔ چھنال اپنے اپنے تئیں ایک مرد کے حبالۂ عقد میں دیتی ہے۔ اس کو اپنی حرمت کا مالک بناتی

ہے۔ اس سے نان و نفقہ اور تمام حقوق حاصل کرتی ہے اور پھر اس کے حق اور اس کی حرمت میں ایک غیر مرد کو شریک کرتی ہے۔ ٹھیک یہی حال ایک مشرک کا ہے وہ خدا سے ربوبیت کا اقرار کرتا ہے۔ بلیٰ کہہ کر اس کے ساتھ اپنی بندگی کا عہد باندھتا ہے۔ رہتا اس کے گھر میں ہے، کھانا اس کا کھاتا ہے، پانی اس کا پیتا ہے، کپڑے اس کے دیے ہوئے پہنتا ہے اور اس کے پاس جو کچھ بھی ہے، سب اللہ تعالیٰ ہی کا عطیہ ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ بندگی غیر کی کرتا ہے۔ محبت کا دم دوسروں کے لیے بھرتا ہے۔ یہ اخلاقی حالت ایک زانیہ کی ہو سکتی ہے یا ایک مشرک کی، روئے زمین پر یہی دو بے وفائیاں ایسی ہیں جو ایک دوسرے کے لیے مثال بن سکتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مشرکوں کو قرآن نے خائن بھی کہا ہے اور خیانت عورت کی بیوفائی اور عہد شکنی کے لیے عربی زبان کا ایک مشہور لفظ ہے۔

یہیں سے یہ نکتہ بھی حل ہو گیا کہ قرآن مجید میں کیوں بار بار یہ بات آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ساری خطاؤں کو، جس کے لیے چاہے گا، معاف کر دے گا مگر شرک کو نہیں معاف فرمائے گا۔ ہر شخص جانتا ہے کہ ایک شریف اور غیور شوہر اپنی بیوی کی ہر غلطی معاف کر سکتا ہے لیکن اس کی بے وفائی کو کبھی معاف نہیں کر سکتا۔ اگر وہ ایسا کرے تو وہ شوہر نہیں ہے بلکہ ایک دیوث، کمینہ، لئیم، بے غیرت جانور ہے۔ جب انسان کی غیرت کا یہ عالم ہے تو پھر اس کی غیرت کا تصور کون کر سکتا ہے جس کے جمال غیرت کے ایک ادنیٰ پرتو سے یہ تمام عالم جمال عفت و حمیت سے نورانی ہوا۔ وہ اس بندہ کو کیسے معاف کر سکتا ہے جس نے غیر کی بندگی کا داغ اپنے دامن پر لیا ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے اَلْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ[1]۔ اس آیت کے اسمائے حسنیٰ میں سے خصوصیت کے ساتھ متکبر کی صفت

---

[1] وہ عزیز، جبار اور غیور ہے۔ پاک ہے ان چیزوں سے جن کو یہ اس کا شریک ٹھہراتے ہیں۔

پر غور کرنا چاہیے اور پھر اس بات کو دیکھنا چاہیے کہ اس کے ساتھ ہی کس طرح شرکاء اور ہمسروں سے اپنا پاک اور برتر ہونا بیان کیا ہے جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ جو متکبر اور غیور ہے اور جس کے سوا کسی کے لیے بھی کبریائی زیبا نہیں ہے اس کی غیرت و کبریائی کبھی کسی شریک کو گوارا نہیں کر سکتی۔

زنا اور شرک کی اسی مشابہت کی وجہ سے شرک کو جگہ جگہ رجس (ناپاکی) کے لفظ سے بھی تعبیر کیا گیا ہے اور مشرکوں کو نجس بھی کہا گیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے ان خائنوں سے جو اس ناپاکی سے آلودہ ہیں اپنے حرم کو پاک کرنے کا حکم دیا ہے کہ خدا اپنے حرم میں بے وفاؤں کی موجودگی گوارا نہیں کر سکتا۔ اور یہ قانونِ الٰہی مقرر ہے کہ جو جماعت اس نجاست میں آلودہ ہو جاتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کے قہر و غضب کی زد میں آجاتی ہے یہاں تک کہ جو لوگ شرک کی اصلی حقیقت سے واقف ہیں وہ پہلے سے اس قوم کی موت کا فیصلہ کر دیتے ہیں جو شرک کے جراثیم قبول کر لیتی ہے۔ چنانچہ قرآن مجید سے یہ ثابت ہے کہ کسی قوم کے لیے اللہ تعالیٰ کا غضب اس وقت مقدر ہو جاتا ہے جب وہ شرک کی نجاست میں آلودہ ہو جاتی ہے۔

| | |
|---|---|
| قَدْ وَقَعَ عَلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ | تم پر تمہارے رب کی طرف سے رجس |
| رِجْسٌ وَّغَضَبٌ اَتُجَادِلُوْنَنِيْ | اور غضب نازل ہو چکا ہے کیا تم مجھ |
| فِيْٓ اَسْمَآءٍ سَمَّيْتُمُوْهَآ | سے چند ناموں کے بارے میں جھگڑتے |
| اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّا نَزَّلَ | ہو جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے |
| اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ فَانْتَظِرُوْٓا | ٹھیرا لیے ہیں اور جن کی کوئی دلیل |
| اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ | اللہ نے نہیں اتاری؟ تو تم بھی انتظار |
| (اعراف - ۷۱) | کرو، میں بھی انتظار کرتا ہوں۔ |

---

شرک سے خدا کے حقوق جس طرح تلف ہوتے ہیں یہ بالاجمال اس کا بیا

تھا۔ اب اس پہلو پر غور کیجیے کہ شرک خود اپنے نفس پر بھی سب سے بڑا ظلم ہے اور اس اعتبار سے بھی یہ دناءت اور رذالت ہی ہے۔

اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو عزت بخشی ہے اور اس کو جو قوتیں اور قابلیتیں عنایت کی ہیں اگر وہ دو ناتوانیوں یعنی بچپن اور بڑھاپے کی بے چارگیوں کے درمیان گھری ہوئی نہ ہوتیں تو اس کے لیے دعوائے فرعونی بھی ناموزوں نہ تھا۔ اس کی طبیعت کی بلندی اور تمام کائنات پر اس کے شرف و فضیلت کا تقاضا یہی تھا کہ وہ کسی کی بندگی کرنے کے بجائے خود معبود بننے کا خواہشمند ہوتا۔ لیکن ان تمام عظمتوں کے باوجود جب وہ دیکھتا ہے کہ نہ میں خود اپنے آپ کو اس دنیا میں لایا ہوں نہ یہاں اپنے آپ کو رکھنے ہی پر قادر ہوں اور نہ میں نے آسمان و زمین اور ان کے درمیان کسی چیز کو بنایا نہ ایک مکھی یا بھنگے کے بنا سکنے کی بھی مجھے قوت حاصل ہے تو وہ ضعف و عجز کے تذلل اور شکر و سپاس کے خشوع کے ساتھ ایک ہستی کے سامنے اپنے تئیں ڈال دیتا ہے اور یہ وہ اس لیے کرتا ہے کہ ایسا کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے۔ اس کے بغیر نہ اس کی عقل مطمئن ہوتی ہے، نہ اس کے دل کو چین نصیب ہوتا ہے، نہ اس کائنات کا معمہ ہی حل ہوتا ہے۔ یہ کر چکنے کے بعد جہاں تک اس کی اپنی ذات کا تعلق ہے اس کے دل کی ساری پریشانیاں اور عقل کی ساری الجھنیں دور ہو جاتی ہیں اور کائنات کے اسرار کو حل کرنے کے لیے اس کو وہ سراغ مل جاتا ہے جس سے ساری گتھیاں سلجھ جاتی ہیں۔ اس کے بعد اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ اس ایک کے سوا کچھ اور بھی ہیں جن کے آگے سر جھکانا ہے تو اس کا بارِ ثبوت اس شخص کے ذمہ ہے۔ وہ تو یہ کہہ کر الگ ہو جائے گا کہ میرے نفس کی بلندی نے ایک کے آگے پست ہونا اس لیے گوارا کر لیا کہ اس کے بغیر پناہ نہیں تھی، دلی

اس کے بارہ میں ہم اور تم دونوں متفق ہیں۔ باقی اس کے علاوہ جن کا تم ذکر کرتے ہو ان کی دلیل تم خود لاؤ۔ مجھے خواہ مخواہ بہت سے خدا بنانے کا شوق نہیں ہے۔ میرے لیے تو ایک ہی رب و مولیٰ بس ہے۔ جب کوئی غلام یہ نہیں پسند کرتا کہ کئی آقاؤں کی غلامی کا قلاوہ اپنی گردن میں ڈالے تو میں یہ ذلت و دنائت کیوں گوارا کروں کہ بہت سے ارباب کا بندہ بنوں۔ ءارباب متفرقون خیر ام اللہ الواحد القهار (یوسف) ضرب اللہ مثلا رجلا فیه شرکاء متشاکسون ورجلا سلما لرجل هل یستویان مثلا الحمد للہ بل اکثرهم لا یعلمون (زمر ۲۹)

لیکن جو دنی الفطرت تھے انھوں نے اپنے نفس کی کوئی قدر نہیں کی اور خدا کی خلافت کا رتبہ پاکر انھوں نے اپنے حقیر سے حقیر خادموں اور اپنے ہی جیسے انسانوں کو اپنا رب بنایا اور اپنے نفس کی وہ اہانت کی جس سے بڑی کوئی اہانت نہیں ہوسکتی وَمَنْ يُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ اور وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ (الآیہ) میں اسی رذالت و دنائت کی طرف اشارہ ہے۔

---

# حقیقتِ توحید

# فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# مقدّمہ

توحید کے دلائل پر غور کرنے سے پہلے چند امور کو بطور مقدمہ سامنے رکھنا نہایت ضروری ہے۔

قرآن کے اوّلین مخاطب | قرآن مجید کے اوّلین مخاطبوں میں سے کوئی گروہ بھی، جیسا کہ "حقیقتِ شرک" میں ہم بیان کر چکے ہیں، خدا کا منکر نہیں تھا۔ بنی اسمٰعیل تھے، جو نہ صرف یہ کہ خدا کو مانتے تھے بلکہ اس کے لیے بہت سی اعلیٰ صفتوں کا بھی اقرار کرتے تھے۔ ان میں جو کفر تھا وہ خدا کے انکار کی بنا پر نہیں تھا بلکہ بعض ایسی باتوں کے تسلیم کرنے یا نہ کرنے کی وجہ سے تھا جن سے خدا کی اعلیٰ صفات یا ان کے لوازم کا انکار لازم آتا تھا یا ان صفات اور ان کے لوازم میں دوسروں کی حصہ داری لازم آتی تھی۔ بنی اسرائیل تھے، جو خدا اور اس کی تمام صفاتِ حسنیٰ کے بھی قائل تھے اور ان کے لوازم اور نتائج کا بھی اقرار کرتے تھے لیکن ساتھ ہی بعض ایسی اعتقادی و عملی گمراہیوں میں مبتلا ہو گئے تھے جو ان کے تسلیم کردہ عقائد سے بالکل متناقض تھیں اور جن سے یا تو کفر لازم آتا تھا یا شرک۔ — چنانچہ قرآن مجید نے ان گروہوں سے ان کو منکرِ خدا فرض کر کے گفتگو نہیں کی ہے بلکہ ان کے مسلمات کو بنیاد قرار دے کر ان کی صرف ان باتوں کی تردید فرمائی ہے جو انھوں نے ان مسلمات سے بالکل متناقض

اپنے اندر جمع کر لی تھیں۔

یہ حال صرف قرآن کے ابتدائی مخاطبوں ہی کا نہیں تھا۔ بلکہ جیسا کہ ہم نے "حقیقتِ شرک" میں بیان کیا ہے دُنیا کی قدیم قوموں میں خدا کا انکار بہت کم پایا جاتا ہے۔ ماضی کی تمام قوموں میں کسی نہ کسی نوعیت سے ایک معبود کا تصوّر ضرور موجود ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس تصوّر کے اردگرد ایسے اوہام کا حصار ہے کہ نہ تو اس سے اس کائنات کے معمہ کو حل کرنے کے لیے کوئی روشنی حاصل ہوتی نہ ایمان و عمل صالح کی بنیادیں استوار ہوتیں۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ خدا کا انکار، جو بداہت کا انکار ہے، صرف عہد حاضر کی پیداوار ہے۔ اس طرح کی سوفسطائیت اگر تاریخ میں کبھی ظاہر بھی ہوئی ہے تو وہ صرف ایک چھوٹے سے حلقہ کے اندر محدود رہی ہے۔ ایک باضابطہ دین کی حیثیت اس نے صرف اس زمانہ میں حاصل کی ہے۔

**قرآن کا طرز استدلال** یہی وجہ ہے کہ قرآن اثبات الوہیت کے باب میں، ہمارے متکلمین کے طریقہ پر، اثبات باری سے اپنی بحث کا آغاز نہیں کرتا۔ اگر وہ ایسا کرتا تو اس کا سارا خطاب مقتضائے حال سے بعید اور کلام مؤثر کی خصوصیات سے محروم ہو جاتا۔ اور وہ حکمتِ بالغہ، جس نے دلوں اور روحوں میں ایک ہلچل پیدا کر دی، ایک خشک و بے اثر متکلمانہ جدل کی شکل اختیار کر لیتی اور کلام کا بڑا حصّہ بالکل بے موقع اور بے ضرورت ہو جاتا۔ بلکہ قرآن نے اپنے مخاطبوں کی ذہنیت کے اعتبار سے ان پر حجّت قائم کی اور ان کی رایوں اور ان کے عقائد میں جو غلطی اور کجی تھی وہ اُن کے سامنے کھول کے رکھ دی کہ یا تو وہ صحیح اور صریح حق کو قبول کر لیں اور اگر اس سے انکار کریں تو ہٹ دھرمی اور حمیتِ جاہلیت کے سوا ان کے لیے کوئی اور جائے پناہ باقی نہ رہ جائے

لیکن چونکہ الوہیت کا مسئلہ نہایت اہم ہے، یہ مرکزِ دین اور مبدأ ایمان ہے، جب تک یہ سرا ہاتھ نہ آجائے اس وقت تک نہ اس کا ثبات کا معمہ حل ہو سکتا، نہ آدمی کا کوئی قدم آگے بڑھ سکتا، نہ حق و باطل اور بر و اثم کے اصول قائم ہو سکتے ہیں، نیز قرآن مجید ایک ابدی ہدایت کا صحیفہ ہے، کسی خاص قوم یا کسی خاص عہد کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، اس کو بنی نوعِ آدم کی تمام گمراہیوں کا قیامت تک کے لیے علاج کرنا ہے، اس وجہ سے اس نے اس باب میں ایک ایسا جامع اسلوبِ بیان اختیار فرمایا جس سے ایک طرف اللہ تعالیٰ کا تمام صفاتِ کمال مثلاً خلق، رحمت، علم، قدرت، عدل اور حکمت وغیرہ سے متصف ہونا ثابت ہو، تاکہ ان لوگوں پر حجت پوری ہو سکے جو کسی نہ کسی نوعیت سے کسی معبود کا عقیدہ تو رکھتے ہیں لیکن اس کی حقیقی صفات کے تصوّر سے قاصر ہیں، اور دوسری طرف ان لوگوں پر بھی حجت قائم ہو سکے جو سرے سے خدا کے وجود ہی کے قائل نہ ہوں۔

پس قرآن میں الوہیت کا دعویٰ، مخاطب کے اعتبار سے، تین مختلف شکلوں میں نمودار ہوا ہے۔ ایک شکل وہ ہے جو خالص منکرین کے لیے حجت ہے۔ ان کے لیے جا بجا توحید کی تقریر ایسے جامع اسلوب میں ہوئی ہے کہ اس سے خدا کا اثبات بھی ہوتا ہے اور اس کی یکتائی بھی ثابت ہوتی ہے۔ دوسری شکل ان لوگوں کے لیے اختیار کی گئی ہے جو خدا کو تو مانتے ہیں لیکن اس کے صفاتِ حسنیٰ کے تصوّر میں بھٹک گئے ہیں۔ ان کے سامنے خدا کے صفاتِ حسنیٰ سے متصف ہونے پر تقریر کی گئی ہے۔ تیسرے وہ لوگ ہیں جو خدا کو صفاتِ کمال سے متصف تو مانتے ہیں لیکن ساتھ ہی بعض متناقض اعمال و معتقدات میں گرفتار ہیں۔ ان کے سامنے ان باتوں کی تردید کی گئی ہے جو انھوں

نئے اپنے اقرار سے بالکل مختلف اپنے اندر جمع کرتی ہیں۔

استدلال کی مذکورہ بالا دو قسموں کے مخاطب بالعموم بنی اسماعیل ہیں۔ ہرچند وہ خدا کے منکر نہ تھے لیکن خدا کی صفات کے باب میں ان کا ذہن نہایت اُلجھا ہوا تھا۔ اس وجہ سے قرآن نے ان کے سامنے توحید کی تقریر اس طرح فرمائی کہ وجود باری کے باب میں بھی ان کو یقین و بصیرت حاصل ہو سکے اور اس کی صفات کے تصوّر میں بھی ان کے ذہن کی ساری اُلجھنیں دور ہو جائیں۔ چنانچہ ان کو مخاطب کر کے قرآن نے جو کچھ کہا ہے وہ قیامت تک کے لیے ان تمام گروہوں پر حجّت ہے جو منکر و ملحد ہیں یا خدا کی صفات کے باب میں ان کے دماغ میں الجھنیں ہیں۔ استدلال کی تیسری قسم کے مخاطب اصلاً بنی اسرائیل ہیں جو تورات اور انجیل پر ایمان کے مدعی تھے لیکن اپنے مسلمات کے بالکل خلاف انھوں نے بہت ساری باتیں مان رکھی تھیں۔ ان پر جس نہج سے دلیل قائم کی گئی ہے وہ قیامت تک کے لیے ان تمام گروہوں پر حجّت ہے جو خدا کی صفات اور ان کے لوازم کے باب میں کسی عملی و اعتقادی تناقض میں مبتلا ہوں۔ بعض مقامات میں اس طرح کے استدلال کے مخاطب بنی اسمٰعیل بھی ہیں لیکن اس کی ایک خاص حد ہے جس کی تفصیل انشاء اللہ آگے آئے گی۔

**قرآنی استدلال کی اساس** اسی طرح قرآنی استدلال کی اساس اور اس کے مبدأ و ماخذ کو بھی سمجھ لینا نہایت ضروری ہے۔ قرآن کے دلائل یا تو مخاطب کے اقرار پر مبنی ہوتے ہیں یا ایسے مستقل اصولوں پر قائم ہوتے ہیں جو مخاطب کے اقرار و انکار سے بالکل بالاتر ہوتے ہیں۔ پھر اس دوسری قسم کی دو قسمیں ہیں۔ یا تو ان دلائل کا ماخذ خود انسان کے نفس کے اندر ہے یا خارج میں۔ پہلی قسم کو ہم

دلائل انفس سے تعبیر کریں گے اور دوسری کو دلائل آفاق سے۔ یہ سب ملا کر قرآنی استدلال کی تین قسمیں ہوئیں۔

۱۔ وہ استدلال جو مخالف کے اقرارات و اعترافات پر مبنی ہے۔ اس کے کئی پہلو ہیں۔ مثلاً جو قومیں کسی اللہ کو مانتی ہیں ان کے لیے لازم ہے کہ ان تمام صفتوں اور باتوں کو مانیں جن پر یہ لفظ مشتمل ہے یا جو قومیں اللہ کی بنیادی صفتوں کو مانتی ہیں ان کے لیے لازم ہے کہ ان صفتوں کو بھی مانیں جو ان صفتوں کے لوازم میں سے ہیں۔ نیز ان صفات سے ان کی تنزیہہ کریں جو ان صفات کے منافی ہیں۔ علی ہذا القیاس ان صفتوں کے تسلیم کرنے سے آدمی پر جو ذمہ داریاں اور حقوق واجب ہوتے ہیں ان کا بھی اقرار کریں۔ نیز جو قومیں کوئی آسمانی صحیفہ رکھتی ہیں، یا اپنے پیچھے کوئی تاریخ رکھتی ہیں، یا اپنی سوسائٹی کے اندر نیکی اور بدی کا کوئی اخلاقی ضابطہ رکھتی ہیں، ان کے لیے ضروری ہے کہ ان کی بنیادی صداقتوں سے، ان کے معروف مسلمات سے، اور ان کے بدیہی منطقی نتائج سے گریز نہ کریں۔ ایسا کرنا اپنے تسلیم کردہ مقدمہ سے فرار اور خود اپنے منہ سے اپنے آپ کو جھٹلانا ہے۔

۲۔ دوسری قسم دلائلِ آفاق کی ہے۔ اس کے بھی مختلف پہلو ہیں۔ سب سے پہلے وہ قوانین ہیں جن کا اس کائنات میں ہر آن مشاہدہ ہو رہا ہے اور جن سے ایک خدا کی اور اس کی ان تمام صفتوں کی شہادت مل رہی ہے جو قرآن نے خدا کے لیے بیان کی ہیں۔ پھر وہ قوانین ہیں جو اس کائنات کے واقعات و حوادث اور قوموں کے عروج و زوال میں کارفرما نظر آتے ہیں، اور جو درحقیقت انہی صفات کے مظاہر ہیں

جن سے خالقِ کائنات متصف ہے۔

۳۔ تیسری قسم دلائل انفس کی ہے۔ ان کا ماخذ درحقیقت خود انسان کا نفس ہے اور اس سے ہماری مراد وہ فطری وجدان و اذعان ہے جو فاطر السمٰوٰت والارض نے نفوس کے اندر ودیعت فرمایا ہے۔ اس کے بعض پہلو بالکل واضح ہیں اور ہم برابر ان کا احساس کرتے ہیں اور کچھ ایسے ہیں جو غافل و بلید انسانوں کی نگاہوں سے کبھی کبھی اوجھل ہو جاتے ہیں۔ لیکن قدرت مختلف آزمائشیں بھیج بھیج کر ان پر تنبّہ کرتی رہتی ہیں۔

قرآن نے اپنے استدلال کے ان تینوں ماخذوں کی خود تصریح کی ہے۔

| | |
|---|---|
| سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ | ہم ان کو اپنی دلیلیں کائنات میں |
| وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ | اور خود ان کے اندر دکھائیں گے |
| أَنَّهُ الْحَقُّ ۗ أَوَلَمْ يَكْفِ | یہاں تک کہ ان پر آشکارا ہو جائے |
| بِرَبِّكَ أَنَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ | کہ وہی حق ہے۔ کیا تیرے پروردگار |
| شَهِيدٌ ۝ أَلَا إِنَّهُمْ فِي | کے لیے یہ بات کافی نہیں ہے کہ وہ |
| مِرْيَةٍ مِّن لِّقَاءِ رَبِّهِمْ | ہر چیز پر حاضر ہے۔ آگاہ! وہ اپنے |
| أَلَا إِنَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ | رب سے ملنے کے بارہ میں شک میں ہیں |
| مُّحِيطٌ ۝ (حٰم السجدہ ۴۱: ۵۳-۵۴) | آگاہ! وہ ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ |

اس آیت میں دعوئ روزِ جزا اور قیامت ہے۔ اس پر پہلے دلائل آفاق کا حوالہ دیا ہے۔ پھر دلائلِ انفس کا ذکر فرمایا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ کی صفات سے استدلال کیا ہے جن کا یا تو مخاطب کو اقرار ہے یا ان صفات کا اقرار ہے جن پر یہ صفتیں مبنی ہیں۔

اس سے زیادہ واضح مثال سورہ ذاریات میں ہے۔

| | |
|---|---|
| وَفِی الْاَرْضِ اٰیٰتٌ | اور زمین میں نشانیاں ہیں یقین کرنے |
| لِّلْمُوْقِنِیْنَ وَفِیْٓ اَنْفُسِکُمْ | والوں کے لیے، اور خود تمھارے نفوس |
| اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ وَفِی | کے اندر بھی ہیں، کیا تمھیں دکھائی نہیں |
| السَّمَآءِ رِزْقُکُمْ وَ | دیتی ہیں اور آسمان میں تمھاری روزی |
| مَا تُوْعَدُوْنَ ۔ فَوَ | ہے اور وہ چیز بھی جس کی تمھیں دھمکی |
| رَبِّ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ | سنائی جا رہی ہے۔ پس آسمان و زمین |
| اِنَّهٗ لَحَقٌّ مِّثْلَ مَآ | کے رب کی قسم یہ بات واقع ہو کے رہے گی |
| اَنَّکُمْ تَنْطِقُوْنَ ۔ | بالکل اسی طرح جس طرح تمھارے لیے |
| (۲۰ - ۲۳) | ایک بات کو بول دینا۔ |

یہاں بھی دعویٰ جزا و سزا کا وقوع ہے ۔ ان آیات سے اوپر اسی دعوے پر آسمان و زمین کی شہادتیں پیش کی ہیں جن سے نہایت واضح طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس کائنات کے خالق کی پسند یہ نہیں ہو سکتی کہ وہ اس دنیا کو پیدا کر کے یوں ہی چھوڑ دے ۔ اس کائنات کے سنن و قوانین اور اس کی تاریخی سرگزشتیں اور ان کے احوال و نتائج اس بات کی شہادت دے رہے ہیں کہ بدلہ کا ایک دن ضرور آنے والا ہے جس دن بدکار اپنی برائیوں کا بدلہ پائیں گے اور نیکوکاروں کو ان کی نیکیوں کا صلہ ملے گا۔ پھر ایک جامع بات فرمائی کہ آسمان و زمین اور تمھارے نفوس کے اندر اس کی دلیلیں موجود ہیں ۔ یہ آفاقی و انفسی دلائل کی طرف اشارہ ہے۔ اس کے بعد آسمان و زمین کے رب کی قسم بطور شہادت کھائی اور اصل دعویٰ پر اپنی ربوبیت سے استدلال کیا۔

یہ دو مثالیں قرآن مجید سے ہم نے محض یہ دکھانے کے لیے بیان کی ہیں کہ قرآن نے اپنے استدلال کی بنیادیں خود بیان فرمادی ہیں۔ باقی رہی یہ بات کہ ان تینوں ماخذوں سے قرآن نے اپنے بنیادی دعاوی، توحید رسالت اور معاد پر کس کس طرح استدلال کیا ہے تو اس کی تفصیل اپنے اپنے محل میں آئے گی۔ یہاں ہمارا مقصود بالاجمال قرآنی استدلال کی اساسات کی طرف اشارہ کرنا تھا۔

**بعض ضروری تنبیہات** لیکن ہمارے اس بیان سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ ہم نے جس طرح قرآن کے استدلال کو علیحدہ علیحدہ قسموں میں بانٹ دیا ہے اسی طرح قرآن میں ان کا بیان بھی الگ الگ ہے بلکہ جس طرح آپ نے دیکھا کہ مخاطب کے اعتبار سے قرآن کے طرز استدلال اور اس کی اساس استدلال میں تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ اسی طرح مخاطب کے اختلاف ہی کی وجہ سے اس کے بیان کی بلاغتوں کے تقاضے بھی بدلتے رہتے ہیں۔ کہیں صرف مخاطب کے مسلمات سے حجت پیش کی گئی ہے۔ کہیں دلائل انفس مذکور ہوئے ہیں۔ کہیں آفاق کا مشاہدہ کرایا گیا ہے۔ کہیں ان میں سے دو کو جمع کر دیا گیا ہے۔ کہیں تینوں کو یک جا کر دیا گیا ہے۔ اسی طرح اصل دعویٰ میں بھی اشتراک و انفراد ہے۔ کہیں صرف توحید پر استدلال ہے کہیں صرف معاد پر، کہیں ان میں سے دو جمع کر دیے گئے ہیں اور کہیں تینوں کا اجتماع ہے۔ ان میں فرق و امتیاز کرنا ایک ناقد بصیر کا کام ہے۔ پھر قرآن میں استدلال کا طریقہ بالکل فطری ہے اس وجہ سے جو لوگ استدلال و نظر کے صرف مصنوعی طریقوں ہی کے عادی ہیں وہ قرآنی استدلال کی اصل قوت کو سمجھنے سے قاصر رہ جاتے ہیں اور طرح طرح کی غلط فہمیوں اور

بدگمانیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

بعض بے خبر یہ سمجھتے ہیں کہ مذہب کی تمام بنیاد تحکم پر ہے۔ جو بات وحی سے معلوم ہو گئی وہ حق ہے، اس کی کوئی دلیل ہو یا نہ ہو۔ بلاشبہ اہلِ ایمان کے لیے اللہ اور رسول کا فرما دینا ہی دلیل ہے لیکن مذہب مومنوں کے اندر نہیں منکروں کے اندر آیا ہے اور ان کے لیے اللہ و رسول کا فرمانا کوئی دلیل نہیں ہو سکتا۔ جب تک اس فرمان کی بنیاد کسی ٹھوس عقلی و فطری حقیقت پر نہ ہو۔ چنانچہ قرآن نے جیسا کہ اوپر واضح ہو چکا ہے عالمِ انفس اور عالمِ آفاق کو بطورِ ماخذ استدلال کے استعمال کیا ہے اور ہر باب میں اپنے دعاوی کی مطابقت آفاق و انفس کے قوانین و سُنن سے دکھائی ہے اور بار بار یہ بات واضح کی ہے کہ جن باتوں کی شہادت کائنات کے ہر گوشہ سے مل رہی ہے اور انسانی فطرت جن حقائق پر گواہی دے رہی ہے۔ قرآن انہی حقائق کا داعی ہے۔ پس نہایت ضروری ہے کہ دین کے اساسی مسائل سے متعلق قرآن کے ان دلائل کو سمجھنے کی کوشش کی جائے تاکہ شریعت اور عالمِ آفاق اور عالمِ انفس کی باہمی موافقت کے اسرار بے نقاب ہوں اور جو لوگ قرآن کی عقلیت کی طرف سے بدگمان ہیں ان کی بدگمانی رفع ہو۔

اس مقدمہ میں ان امور پر تنبیہ اس لیے ضروری تھی کہ جو لوگ قرآن کے اولین مخاطبوں کی مختلف جماعتوں اور اُن کی خصوصیات و حالات سے اچھی طرح واقف نہیں ہیں، یا قرآن کے طرزِ استدلال میں مخاطب کا جس قدر لحاظ کیا گیا ہے اس کی اہمیت سے بے خبر ہیں یا ان اساسات کو نہیں جانتے جن پر قرآن کا استدلال مبنی ہے، وہ سمجھتے ہیں کہ قرآن کا سارا استدلال ظنی اور الزامی قسم کا ہے۔ اس کو فلسفیانہ برہانیات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مسلمانوں میں سے

جو لوگ یونانی علوم سے متاثر و مرعوب ہوئے وہ اسی سوءِ ظن کی وجہ سے قرآن سے محروم رہے۔ وہ یا تو قرآن کی طرف آئے نہیں اور اگر آئے تو اس معدن کو والعیاذ باللہ مزبلہ سمجھ کر آئے جہاں ان کو صرف الزامی اور خطیبانہ انداز کی دلیلوں کی توقع تھی، برہانیات کے جواہر ریزوں کی اُمید نہیں تھی۔ قرآن کی نسبت اسی بدگمانی میں اس زمانہ کے وہ مسلمان بھی مبتلا ہیں جو جدید فلسفہ وسائنس سے مرعُوب ہیں۔ ان کو عام طور پر یہ وہم ہے کہ قرآن مجید کی عقلیت صرف متوسط درجہ کے دماغوں کو اپیل کر سکتی ہے، خواص اور عقلاء کے مبلغ ادراک سے اس کا استدلال العیاذ باللہ فروتر ہے۔ ان لوگوں کی غلط فہمی کی وجہ زیادہ تر یہ ہے کہ وہ نہ تو قرآنی استدلال کی اساسات سے واقف ہیں اور نہ اس بات سے واقف ہیں کہ مخاطب کے اعتبار سے یہ استدلال کن گوناگوں شکلوں میں نمودار ہوا ہے۔ ہم اس رسالہ میں چاہتے ہیں کہ توحید سے متعلق قرآنی استدلال کی وضاحت کریں تاکہ دین کی حُجت واضح ہو۔

**اس رسالہ میں مباحث کی ترتیب** اس رسالہ میں مباحث کی ترتیب مندرجہ ذیل ہے۔

## توحید کے عمومی دلائل

۱۔ دلائلِ آفاق

۲۔ دلائلِ انفس

## توحید کے خصوصی دلائل

۳۔ دلائل بلحاظ مسلماتِ مخاطب

۴۔ پچھلی فصلوں کا خلاصہ

۵۔ عقیدۂ توحید کے اثرات فرد اور جماعت پر۔

۶۔ عقیدہ توحید کی اہمیت دین میں۔

یہ رسالہ چونکہ 'حقیقت شرک' کا تتمہ ہے اس وجہ سے اس کے مطالعہ سے پہلے اس کا مطالعہ ضروری ہے۔ اس رسالہ کا اصلی مقصود صرف توحید کے دلائل کی توضیح ہے۔ بقیہ مباحث جو اس باب سے متعلق ہیں وضاحت کے ساتھ 'حقیقت شرک' میں بیان ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ جو باتیں قلم سے حق نکلی ہیں اُن کو دلوں میں جگہ دے اور جہاں کہیں کوئی لغزش ہوئی ہے اس کے اثر سے محو فرمادے۔

# توحید کے عمومی دلائل

## دلائل آفاق

یہ دنیا جو ہماری آنکھوں کے سامنے پھیلی ہوئی ہے، مختلف پہلوؤں سے نہ صرف ایک علۃ العلل پر بلکہ ایک ایسے معبودِ حقیقی پر شاہد ہے جو تمام صفات کمال سے متصف ہے اور اس شہادت کی بنیاد ایسے امور پر ہے جن کا ہم خارج میں مشاہدہ کرتے ہیں اور جن کے بارہ میں ہماری عقل اور ہماری فطرت ہمیں مجبور کرتی ہے کہ ہم ان کو کسی ایسی ذات کی طرف منسوب کریں جو ان کی مصدر ہو سکے۔ ان امور کو قرآن کی زبان میں آیات اللہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ہم اس فصل میں بقدرِ ضرورت ان کی شرح کریں گے۔

۱۔ کائنات کا حسن و جمال | سب سے پہلی چیز جو ہماری نظر کو متوجہ کرتی ہے وہ اس کائنات کا حسن و جمال ہے جو ہر گوشہ میں جلوہ آرا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس دنیا کی کوئی چیز بھی سادہ و بے رنگ نہیں ہے۔ آسمان سے لے کر زمین تک کوئی چپہ ایسا نہیں ہے جہاں سے انسان غافل و بے پروا گزر سکے۔ ہر جگہ اس کے دل کو کھینچنے، اُس کی آنکھوں کو بیدار کرنے اور اُس کے کانوں کو کھولنے کے لیے دلفریب مناظر، بے حجاب جلوے اور شیریں نغمے موجود ہیں۔ اور ساتھ ہی انسان کے اندر حسن کا نہایت گہرا احساس ودیعت کیا گیا ہے۔ اس وجہ سے جب وہ اپنے اِرد گِرد حسن و جمال کے یہ بوقلموں جلوے دیکھتا ہے، دفعتہً اُس کے اندر ان کے صانع کے متعلق سوال پیدا ہو جاتا ہے، کیونکہ وہ یہ تصور کرنے سے

بالکل قاصر ہے کہ اتنی دلفریبیوں سے یہ معمورہ دنیا خود بخود وجود میں آگئی اور اگر اس پر حیوانی بلادت کا غلبہ نہیں ہوتا تو وہ بے اختیار پکار اُٹھتا ہے ۔

تبارک اللہ احسن　　بڑا ہی خیر و برکت والا ہے اللہ جو

الخالقین　　بہترین پیدا کرنے والا ہے ۔

یعنی صرف اسی بات کا احساس نہیں ہوتا کہ اس کائنات کا ایک خالق (DE-SIGNER) ہے بلکہ اِس سے آگے بڑھ کر یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ وہ بہترین خالق ہے ۔ یکسر خیر و برکت ہے ۔ اس نے جو چیز بھی بنائی ہے وہ کمالِ قدرت، کمال صنعت اور کمالِ خیر و برکت کا نمونہ ہے ۔ اَلَّذِیْ اَحْسَنَ کُلَّ شَیْءٍ خَلَقَہٗ جس نے جو چیز بھی بنائی خوب بنائی ۔

ظاہر ہے کہ دنیا اپنے بقا کے لیے ان تمام رنگا رنگ حُسن آرائیوں کی محتاج نہ تھی ۔ ممکن تھا کہ یہ زمین ہوتی لیکن اس میں یہ باغ و چمن ، یہ نشیب و فراز ، یہ وادی و کہسار نہ ہوتے ۔ ممکن تھا کہ یہ فضا ہوتی لیکن اس میں نسیم کے جھونکے اور چڑیوں کے چہچہے نہ ہوتے ۔ ممکن تھا کہ یہ آسمان ہوتا مگر یہ ستاروں کی بزم آرائیاں ، شفق کی جلوہ کاریاں اور قوس قزح کی رنگا رنگیاں نہ ہوتیں لیکن ایسا نہیں ہُوا بلکہ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ دُنیا ان تمام جلووں سے معمُور ہے ۔ سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہے ؟ قرآن کہتا ہے کہ یہ اِس لیے ہے کہ انسان کی حس باطن کو بیدار کرے اور اس میں یہ بصیرت پیدا ہو کہ ایسی حسین و جمیل دنیا بغیر کسی خالق کے وجود میں نہیں آسکتی اور وہ خالق صرف خالق ہی نہیں ہے بلکہ کمالِ قدرت ، کمالِ صنعت و حکمت اور کمالِ خیر و برکت کی صفات سے متصف ہے ۔

اَفَلَمْ یَنْظُرُوْا اِلَی السَّمَآءِ　　کیا انھوں نے اپنے اوپر آسمان کو نہیں

| | |
|---|---|
| فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنٰهَا وَزَيَّنّٰهَا | دیکھا کیسا ہم نے اس کو بلند کیا اور سجایا، |
| وَمَا لَهَا مِنْ فُرُوْجٍ ۔ وَالْاَرْضَ | اور کہیں اس میں دراڑ نہیں اور زمین کو |
| مَدَدْنٰهَا وَاَلْقَيْنَا فِيْهَا | ہم نے بچھایا اور اس میں لنگر انداز کر |
| رَوَاسِيَ وَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ | دیے پہاڑ اور اگائیں اس میں ہر قسم کی خوش منظر |
| كُلِّ زَوْجٍۭ بَهِيْجٍ تَبْصِرَةً وَّ | چیزیں ۔ بصیرت اور یاددہانی پیدا کرنے |
| ذِكْرٰى لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ ۔ | کے لیے ہر متوجہ ہونے والے بندے کے |
| (۶-۸ ق) | دل میں ۔ |

یہ ممکن نہیں ہے کہ کوئی شخص آسمان و زمین کے ان جلووں کو دیکھے اور یوں ہی گزر جائے ۔ اگر آنکھیں کھلی ہوئی ہوں تو اس دنیا کا مشاہدہ خود بخود انسان میں خدا اور اس کی صفات حسنیٰ کا یقین پیدا کرتا ہے ۔ اسی حقیقت کی طرف سورۂ واقعہ کی اس آیت میں اشارہ فرمایا ہے ۔

| | |
|---|---|
| اَفَرَءَيْتُمُ النَّارَ الَّتِيْ | بھلا دیکھو تو اس آگ کو جس کو سلگاتے |
| تُوْرُوْنَ ءَاَنْتُمْ اَنْشَاْتُمْ | ہو، کیا تم نے اس کے درخت کو اگایا ہے |
| شَجَرَتَهَاۤ اَمْ نَحْنُ الْمُنْشِـُٔوْنَ | یا ہم اس کو اگانے والے ہیں؟ ہم نے اس کو |
| نَحْنُ جَعَلْنٰهَا تَذْكِرَةً وَّمَتَاعًا | بنایا ہے یاددہانی اور فائدہ اٹھانے کی |
| لِّلْمُقْوِيْنَ ۔ | چیز مسافروں کے لیے ۔ |

آیت کا آخری حصہ خصوصیت کے ساتھ لائق توجہ ہے ۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس دنیا کی چیزیں صرف ہماری کسی مادی ضرورت ہی کو نہیں پورا کرتیں بلکہ ان میں سے ہر ایک کی تخلیق میں حسن و خوبروئی اور کمال صنعت کی ایسی نمود ہے کہ وہ آپ سے آپ ایک اعلیٰ اور برتر حقیقت پر ایمان لانے کے لیے تنبیہ بھی کرتی ہیں اور یہ تنبیہ کرنا محض ان کا ضمنی مقصد نہیں ہے بلکہ ان کا اصلی وظیفہ یہی

ہے ۔ چنانچہ میں تذکرہ کا لفظ متاع کے لفظ پر مقدم ہے ۔ جس سے واضح ہوتا ہے کہ ان کا اصلی مقصد یاددہانی ہے ۔ سامان معیشت ہونا ان کا ایک مزید فائدہ ہے جن لوگوں کی حس باطن بیدار ہوتی ہے ان کا اشیاء کا یہی پہلو سب سے زیادہ روشن نظر آتا ہے لیکن جن کی فطرت مسخ ہو جاتی ہے اور بطن و فرج کی لذات کے سوا جن کے سامنے کوئی اور اعلیٰ مقصد نہیں رہ جاتا ، ان کی آنکھیں خوردبینوں اور دوربینوں سے مسلح ہونے کے باوجود ، اسی حقیقت کو دیکھنے سے قاصر رہ جاتی ہیں جو فی الحقیقت ہر شے کے اندر سب سے زیادہ اُبھری ہوئی ہے ۔ چنانچہ قرآن نے ایسے لوگوں کو چوپایوں سے تشبیہ دی ہے اور ان کی نسبت فرمایا ہے کہ ان کے کان ہیں لیکن سُنتے نہیں آنکھیں ہیں لیکن دیکھتے نہیں ، دل ہیں لیکن سمجھتے نہیں ۔

یہ رنگا رنگ جلوے ، جیسا کہ اُوپر گزر چکا ہے ، صرف ایک علۃ العلل کی شہادت نہیں دیتے بلکہ ایک ایسے خالق کی شہادت دیتے ہیں جو صفات جمال و کمال سے متصف ہے ۔ کیونکہ ہم صرف یہی نہیں دیکھتے کہ یہ دُنیا بنی ہے بلکہ یہ دیکھتے ہیں جو چیز بنی ہے خُوب بنی ہے جس سے اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ وہ کامل ہے ، حکیم ہے ، قدیر ہے ، علیم ہے ، مہربان ہے ، کریم ہے ۔ اُس نے ہمیں جیسا تیسا پیدا ہی نہیں کر دیا ہے بلکہ بہترین ساخت پر ، بہترین قویٰ اور قابلیتوں کے ساتھ پیدا کیا ہے (لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ) نیز فرمایا (یٰٓاَیُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِیْمِ الَّذِیْ خَلَقَكَ فَسَوّٰىكَ فَعَدَلَكَ فِیْٓ اَیِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ) اس نے پیٹ بھرنے کے لیے ہمیں صرف غلہ ہی نہیں دیا بلکہ لُطف اندوزی کے لیے پھل اور طرح طرح کے میوے بھی پیدا کیے اور مشام نوازی اور منظر بازی کے لیے پھُول بھی کھلائے اور چمن بھی اگائے ۔ وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ ، فِیْهَا فَاكِهَةٌ وَّالنَّخْلُ ذَاتُ الْاَكْمَامِ وَالْحَبُّ ذُو الْعَصْفِ وَالرَّیْحَانُ (اور زمین کو بنایا مخلوق کے لیے ، اس میں میوے ہیں

اور کھجور ہیں غلاف دار، اناج ہیں بھس والے اور پھول ہیں)

ظاہر ہے یہ صرف خلق نہیں بلکہ کمالِ خلق اور کمالِ قدرت ہے۔ صرف بخشنا نہیں بلکہ کرم و بخشش اور رحمت و عنایت کے ساتھ بخشنا ہے۔ صرف زندہ رکھنا نہیں ہے بلکہ اس طرح پالنا ہے جو کمالِ ربوبیت و پروردگاری کی شان ہے۔

یہ وہ نتیجہ ہے جو اس کائنات کے اجزاء کے حسن و جمال کے مشاہدہ سے ہمارے سامنے آتا ہے لیکن جب ہم ان اجزاء کے انفرادی وجود سے گزر کر ان سے ترکیب پائی ہوئی اس حسین وحدت یعنی اس مجموعی دُنیا کے حسن و جمال کو دیکھتے ہیں تو ہم پر ایک اور حقیقت روشن ہوتی ہے، وہ یہ کہ اس کائنات کا خالق و مدبر ایک ہی ہے، کوئی اور اس کا شریک و سہیم نہیں ہے۔ یہ کائنات آسمان سے لے کر زمین تک ایک سجی سجائی بزم ہے جس کی ہر چیز اپنی اپنی جگہ سے مجموعہ کے حسن و جمال میں اضافہ کر رہی ہے جس طرح ہم ایک حسین، متناسب الاعضا، اور خوبصورت چیز کو دیکھتے ہیں تو لازماً اس سے اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ایک ہی خوش ذوق اور کارفرما ہاتھ کی کاریگری کا کرشمہ ہے اگر اس کے مختلف اعضاء و اجزاء کی تشکیل مختلف کاریگروں کے مختلف ارادوں کے ماتحت عمل میں آتی تو یہ تناسب اور یہ حسن و جمال اس میں پیدا نہ ہو سکتا اسی طرح اس مجموعی دُنیا کے حسن و جمال کا جو شخص مشاہدہ کرتا ہے وہ لازماً اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ صرف ایک ہی کی پسند اور ایک ہی کا ارادہ ہے جو ان تمام رنگا رنگیوں کے اندر کارفرما ہے۔ اگر مختلف پسندیں اور مختلف ارادے اس کے اندر کارفرما ہوتے تو اوّلاً تو اس کا قیام ہی ناممکن تھا اور اگر اس کا قیام فرض بھی کر لیا جائے تو یہ ایک آراستہ بزم کی جگہ ایک مال گودام بلکہ کسی کباڑیے کی دُکان کی شکل میں ہوتی، اور ایک حسین وحدت کی جگہ ہم اس کو نہایت بھیانک صورت میں دیکھتے، جہاں ہر چیز بے قرینہ، بے ربط اور بے جوڑ ہوتی، کیونکہ مختلف ارادوں اور مذاقوں کے تصادم

کے ساتھ تناسب کا وجود محال ہے۔ قرآن نے اس حقیقت کی طرف اس کثرت کے ساتھ توجہ دلائی ہے کہ اس کے شواہد نقل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

۲۔ کائنات کے مختلف اجزا کا باہمی توافق | دوسرا اہم اور قابل توجہ پہلو اس کائنات کے مختلف اجزاء کا باہمی توافق (HARMONY) اور ان کی باہمی سازگاری ہے۔

اس دنیا کے مختلف اجزاء ہیں جو باہم ایک دوسرے سے ضدین کی نسبت رکھتے ہیں۔ اسی طرح کی سازگاری اور موافقت پائی جاتی ہے جس طرح کی سازگاری اور موافقت ہم زوجین میں دیکھتے ہیں۔ ایک عورت اپنے ظاہر و باطن میں مرد سے بالکل مختلف حالت رکھتی ہے، اسی طرح ایک مرد عورت سے بالکل مختلف خصوصیات و صفات کا حامل ہے۔ تاہم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ جیسا شدید روحانی و جسمانی اتصال رکھتے ہیں وہ ظاہر ہے۔ عورت کے پاس جو کچھ ہے وہ مرد کو نہ صرف یہ کہ مطلوب و مرغوب ہے بلکہ اگر عورت نہ ہو تو مرد کی ہستی اور اس کی قوتوں اور قابلیتوں کا بڑا حصہ بالکل بے معنی ہو جاتا ہے۔ اسی طرح مرد کے پاس جو کچھ ہے وہ عورت کے دواعی اور مقتضیات کا گویا جواب ہے۔ یہاں تک کہ اگر مرد کو معدوم فرض کر لیا جائے تو عورت کی خصوصیات و صفات کی سرے سے توجیہ ہی ناممکن ہو جاتی ہے۔ ٹھیک یہی حال اس کائنات کے تمام اجزائے مختلفہ کا ہے۔ زمین و آسمان، شب و روز، گرمی و سردی، نور و ظلمت، حرارت و برودت، سب زوجین کا سا اختلاف اور سب انہی کا سا شدید اتصال رکھتے ہیں۔ حد یہ ہے کہ عورت و مرد میں سے جس طرح ایک کا تنہا وجود بے غایت ہے اسی طرح ان تمام اجزائے مختلفہ میں سے ہر چیز اپنے جوڑے کے بغیر بالکل بے مقصد ہو جاتی ہے۔ کوئی چیز اپنے مقصد کو پورا ہی اس وقت کرتی ہے جب وہ اپنے جوڑے سے ملتی ہے۔

توافق کا یہ پہلو صرف ہم ضدین ہی میں نہیں پاتے بلکہ اس کائنات کے نظام پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں ایک ہمہ گیر توافق و سازگاری ہے۔ ہر چیز اپنی ہستی کے بقا اور اپنے وجود کی نشو و نما کے لیے اس بات کی محتاج ہے کہ یہ پورا کارخانہ اس کے لیے سرگرم کار رہے۔ گیہوں کا ایک پودا وجود میں آکر اس وقت تک اپنے کمال کو نہیں پہنچ سکتا جب تک اس کائنات کے تمام عناصر اس کی پرورش و نگہداشت میں اپنا اپنا حصہ پورا نہ کریں۔ زمین اس کے لیے گہوارہ مہیا کرے، ابر اس کے لیے رطوبت فراہم کرے، سورج اس کو گرم رکھے، شبنم اس کو ٹھنڈک پہنچائے، ہوائیں اس کو لوریاں دیں، جب یہ سب کچھ ایک خاص ضبط و نظم کے ساتھ ہولے تب کہیں جاکر گیہوں کا ایک دانہ کھیت سے خرمن تک پہنچتا ہے اور یہی حال اس دنیا کی ایک ایک چیز کا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا اس کائنات کا ارتقاء آپ سے آپ ہو رہا ہے یا اس کے پیچھے ایک مدبّرہ ہستی (DHAHA) ہے جو ان تمام اجزائے مختلفہ کے اندر توافق و سازگاری پیدا کرتی ہے اور ان کو پروان چڑھاتی ہے؟ اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ یہ دنیا ایک اتفاقی واقعہ (ACCIDENT) ہے، آپ سے آپ وجود میں آگئی اور اس کے مختلف اجزا کا ارتقاء بھی آپ سے آپ ہو رہا ہے، تو کیا اس کے اجزائے مختلفہ کے اندر توافق و سازگاری کا پیدا ہو جانا بھی ایک امر اتفاقی ہے؟ کیا کوئی عاقل ایک لمحہ کے لیے بھی یہ باور کر سکتا ہے کہ ہوا، پانی، آگ، مٹّی، دریا، پہاڑ، سورج، چاند، چرند و پرند سب اتفاقی حوادث کے طور پر ظہور میں آئے، ہر ایک کا بطور خود ارتقا ہوا، پھر بالکل اتفاق سے ان میں یہ حیرت انگیز توافق پیدا ہو گیا اور پھر بالکل اتفاق ہی سے

یہ سب انسان کے لیے نہ صرف سازگار بلکہ اس کے خدمت گزار بن گئے ہیں؟ کیا عقل انسانی اس قسم کے حیرت انگیز اتفاقات کو ایک لمحہ کے لیے بھی تسلیم کر سکتی ہے۔

یہ صورتِ حال اس امر کا نہایت قوی ثبوت ہے کہ اس کائنات کے پیچھے ایک حکیم و قوی ارادہ ہے جو اس کو وجود میں لایا ہے اور جو علم و قدرت اور ربوبیت و حکمت کی تمام صفات سے متصف ہے۔ وہی ہے جو اپنے علم و حکمت سے اس کے اجزائے مختلفہ میں ربط و اتصال پیدا کرتا اور ان کو صالح مقاصد کے لیے استعمال کرتا ہے اور ساتھ ہی اس امر کی بھی شہادت مل رہی ہے کہ آسمان سے لے کر زمین تک اور زمین و آسمان کے درمیان صرف ایک ہی ہے جو مالک و متصرف ہے۔ کوئی دوسرا ارادہ اس کا شریک و سہیم نہیں ہے۔ اگر آسمان و زمین کے الگ الگ ناظم و مدبر ہوتے یا بہت سے ارادوں کی کارفرمائی ہوتی، یا خیر و شر اور نور و ظلمت کے الگ الگ خدا ہوتے تو کائنات کے ان مختلف اجزاء میں یہ زوجین کا سا توافق اور ربط نہ ہوتا جو ہم اس دنیا کے ہر گوشہ میں مشاہدہ کر رہے ہیں۔ قرآن نے اس دلیل کو مختلف اسلوبوں اور طریقوں سے مختلف مقامات میں بیان فرمایا ہے۔ ہم بطور مثال صرف چند آیات پیش کرنے پر اکتفا کریں گے۔

یہ دلیل نہایت اختصار کے ساتھ سورۂ ذاریات میں ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے۔

| | |
|---|---|
| وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ | اور ہم نے ہر چیز میں سے پیدا کیے جوڑے |
| لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ فَفِرُّوا إِلَى | تاکہ تم یاددہانی حاصل کرو۔ پس اللہ |
| اللّٰهِ إِنِّي لَكُمْ مِنْهُ نَذِيرٌ | کی طرف بھاگو میں تمہارے لیے اس |
| مُبِينٌ ، وَلَا تَجْعَلُوا | کی طرف سے کھلا ہوا ڈرانے والا ہوں |
| مَعَ اللّٰهِ إِلٰهًا آخَرَ إِنِّي لَكُمْ | اور اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو |

مِنْهُ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ۔ (۹۴-۵۱)
شریک مت بناؤ، میں تمہارے لیے اس کی طرف سے کھلا ہوا ڈرانے والا ہوں۔

یہاں ہر چیز کے جوڑے جوڑے ہونے سے معاد اور توحید دونوں پر استدلال کیا ہے۔ معاد پر استدلال یہاں زیرِ بحث نہیں ہے۔ اس کی تفصیل انشاءاللہ ہمارے رسالہ "حقیقتِ معاد" میں آئے گی۔ توحید پر استدلال کی تفصیل یہ ہے کہ اس کائنات کی ہر چیز جوڑے جوڑے کی شکل میں پیدا ہوتی ہے اور ہر چیز اپنے جوڑے سے مل کر ہی اپنی غایت پوری کرتی ہے۔ یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ اس کائنات کا وجود و بقا اس کے اضداد کے توافق و سازگاری سے ہے اور اس سے بدیہی طور پر یہ بات نکلتی ہے کہ ان کا خالق و مدبّر ایک ہی ہے جو ان کے اختلافات کے باوجود ان میں ربط و اتصال پیدا کر کے ان سے صالح نتائج پیدا کرتا ہے۔ پس یہ اختلاف جو ہم اس کائنات میں مشاہدہ کر رہے ہیں، محض ظاہر کا اختلاف ہے اور ہرگز اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ اس کے اندر مختلف ارادے کارفرما ہیں۔ ان اجزائے مختلفہ کا باہمی توافق اس امر کی نہایت کھلی ہوئی شہادت ہے کہ صرف ایک ہی ہے جس کے تحتِ تصرف اس کائنات کے تمام اجزا اپنے اپنے مقصد کو پورا کر رہے ہیں۔ اس دلیل کی تفصیل سورہ بقرہ میں ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّاَنْزَلَ مِنَ

اے لوگو! اپنے اس مالک کی پیروی کرو جس نے تم کو پیدا کیا ہے اور ان کو بھی جو تم سے پہلے تھے تاکہ اس کے عذاب سے محفوظ رہو۔ جس نے تمہارے لیے زمین کو بچھونا بنایا اور آسمان کو چھت اور

| | |
|---|---|
| السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ | اتارا آسمان سے پانی اور اس سے |
| الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ فَلَا تَجْعَلُوْا | پیدا کیے پھل تمھاری روزی کے |
| لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ | لیے، پس اللہ کا شریک نہ ٹھہراؤ |
| تَعْلَمُوْنَ۔ | درآنحالیکہ تم جانتے ہو۔ |

یعنی جو انسان اپنی دونوں سے آنکھوں سے دیکھ رہا ہے کہ زمین و آسمان اس توافق و ہم آہنگی کے ساتھ اس کی خدمت میں سرگرم ہیں، زمین اس کے لیے بستر کی طرح بچھی ہوئی اور آسمان شامیانہ بن کر اس پر تنا ہوا ہے، پھر آسمان سے پانی برستا ہے اور زمین اس سے اپنے پھل پیدا کرتی ہے اور وہ پھل انسان کے لیے لذّت اور بقائے زندگی کا وسیلہ بنتے ہیں، وہ انسان یہ کیسے تصوّر کر سکتا ہے کہ آسمان کے دیوتا الگ ہیں اور زمین کے دیوتا الگ ہیں، بارش کوئی لاتا ہے، اور پھل کوئی پیدا کرتا ہے۔ ان اضداد اور عناصر مختلفہ کی یہ سازگاری تو اسی وقت ممکن ہے جب ان سب کو ایک ہی کارفرما اور مدبر قوت، حکمت و رحمت کے ساتھ، ایک خاص مقصد کے لیے تصرّف میں لائے۔ یہی دلیل ذرا اور پھیلاؤ کے ساتھ دوسری جگہ بیان ہوئی ہے۔

| | |
|---|---|
| اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ لَآ اِلٰهَ | اور تمھارا معبود ایک ہی معبود ہے، |
| اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ | نہیں ہے کوئی معبود مگر وہ، رحمٰن اور |
| اِنَّ فِىْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ | رحیم، آسمانوں اور زمین کی خلقت، |
| وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ | روز و شب کی آمد و شد، اور کشتی میں |
| وَالْفُلْكِ الَّتِىْ تَجْرِىْ فِى | جو لوگوں کے لیے سمندر میں نافع چیزیں |
| الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ | لے کر چلتی ہے اور اس پانی میں جو |
| اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ | اللہ نے آسمان سے اتارا اور اس سے |

| | |
|---|---|
| مَآءٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ | زمین کو اس کے مردہ ہو جانے کے |
| مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ | بعد زندہ کیا اور اس میں ہر طرح |
| وَّتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ | کے جاندار پھیلائے اور ہواؤں کی |
| الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ | گردش میں اور بادلوں میں، جو آسمان |
| وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ | و زمین کے درمیان مسخر ہیں، دلیلیں |
| يَّعْقِلُوْنَ (بقرہ) | ہیں (توحید کی) سمجھنے والوں کے لیے۔ |

سورۂ نحل میں اس سے زیادہ تفصیل کے ساتھ اس کائنات کی ہم آہنگی کو واضح فرمایا ہے۔

| | |
|---|---|
| وَاللّٰهُ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ | اور اللہ نے اتارا آسمان سے پانی |
| مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ | اور اس سے زندہ کیا زمین کو اس |
| بَعْدَ مَوْتِهَا اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ | کے مرجانے کے بعد۔ بے شک اس |
| لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ ۝ | کے اندر ایک دلیل ہے ان لوگوں کے |
| وَاِنَّ لَكُمْ فِى الْاَنْعَامِ | لیے جو سنیں۔ اور تمہارے لیے چوپایوں |
| لَعِبْرَةً نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا | کے اندر بھی غور کرنے کی جگہ ہے، ہم |
| فِيْ بُطُوْنِهٖ مِنْ بَيْنِ | تم کو پلاتے ہیں ان چیزوں کے اندر |
| فَرْثٍ وَّدَمٍ لَّبَنًا | سے جو ان کے پیٹوں کے اندر ہیں، |
| خَالِصًا سَآئِغًا | گوبر اور خون کے درمیان سے، خالص |
| لِّلشّٰرِبِيْنَ ۝ وَمِنْ ثَمَرٰتِ | دودھ، پینے والوں کے لیے نہایت |
| النَّخِيْلِ وَالْاَعْنَابِ | خوشگوار، اور کھجور اور انگور کے پھلوں |
| تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا | سے تم تیار کرتے ہو نشہ اور اچھی |
| وَّرِزْقًا حَسَنًا اِنَّ فِيْ | روزی، بے شک اس کے اندر ایک |

| | |
|---|---|
| ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ | دلیل ہے ان لوگوں کے لیے جو سمجھیں اور |
| یَّعْقِلُوْنَ۝ وَاَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى | تیرے رب نے شہد کی مکھی کو وحی کی کہ |
| النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِیْ مِنَ | بنا پہاڑ کے اندر چھتے اور درختوں میں |
| الْجِبَالِ بُیُوْتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ | اور ان میں جن کو ٹٹیوں پر چڑھاتے ہیں |
| وَمِمَّا یَعْرِشُوْنَ۝ ثُمَّ | پھر کھا ہر پھل کا رس چوس اور چل اپنے |
| كُلِیْ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ | رب کی ٹھہرائی ہوئی راہوں میں اطاعت |
| فَاسْلُكِیْ سُبُلَ رَبِّكِ | کے ساتھ۔ نکلتی ہے اس کے پیٹ سے |
| ذُلُلًا ؕ یَخْرُجُ مِنْۢ بُطُوْنِهَا | پینے کی چیز جس کے رنگ مختلف ہیں اور جس |
| شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ | میں لوگوں کے لیے شفا ہے۔ بیشک اس کے |
| فِیْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ ؕ اِنَّ فِیْ | اندر ایک دلیل ہے ان لوگوں کے لیے |
| ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ۝ | جو غور کریں۔ |

ان آیات میں اس عالم کی ہمہ گیر ہم آہنگی کی طرف اشارات ہیں۔ بادلوں سے پانی برستا ہے۔ اس سے زمین لہلہا اٹھتی ہے۔ اس کی نباتات کو چوپائے چرتے ہیں۔ اس سے ان کے اندر دودھ بنتا ہے۔ آلائشوں اور خون کے اندر سے سفید دودھ کی دھاریں نکلتی ہیں اور یہ دودھ پینے والوں کے لیے نہایت لذیذ اور قوت بخش غذا کا کام دیتا ہے۔ پھر اسی بارش کے پرورش کیے ہوئے انگور اور کھجور کے پھلوں سے انسان اپنی لذت اور ضرورت کی طرح طرح کی چیزیں پیدا کر لیتا ہے۔ پھر شہد کی مکھیاں ہیں جو پہاڑوں کی بلندیوں پر، درختوں کی شاخوں پر، انگور کی ٹٹیوں میں اپنے چھتے بنا لیتی ہیں، پھول پھول کا رس چوس کر ان کو جمع کرتی ہیں۔ جن کے رنگ بھی مختلف اور مزے بھی مختلف۔ انسان ان کو پیتا ہے۔ ان سے لذت بھی حاصل کرتا ہے اور بیماریوں میں شفا بھی۔ ان مناظر کو جو شخص بھی دیدۂ عبرت

سے دیکھے گا کس طرح باور کر سکتا ہے کہ یہ دنیا اور اس کے یہ تمام حیرت انگیز مظاہر بالکل ایک اتفاقی حادثہ کے طور پر ظہور میں آ گئے ہیں۔ یا یہ کہ یہ آسمان و زمین اور ان کے مختلف جلوے مختلف دیوتاؤں کی کارفرمائیوں کے کرشمے ہیں، جس دنیا کے اتنے بعید اجزاء کے اندر اتنے گہرے رشتے ہیں اور جو کائنات اپنے متضاد اجزاء کی کشاکشوں کے اندر توافق و سازگاری کے اتنے پہلو رکھتی ہیں وہ نہ تو ایک اتفاقی واقعہ ہو سکتی، نہ مختلف ارادوں کی رزمگاہ ہو سکتی۔ ظاہر بین نگاہیں صرف موجوں کے تلاطم کو دیکھتی ہیں۔ موجوں کے اندر کے صدف اور صدف کے اندر پرورش پانے والے گہر تک ان کی رسائی نہیں ہوتی اور یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف قرآن مجید بار بار توجہ دلاتا ہے کہ اس کائنات کے صرف اضداد کو نہ دیکھو بلکہ ان صالح نتائج کو دیکھو جو ان کے اضداد کی کشاکش کے اندر پیدا ہو رہے ہیں اور اس امر کی شہادت دے رہے ہیں کہ ایک ہی حکیم ہاتھ اس کائنات پر متصرف ہے۔

| | |
|---|---|
| وَمَا يَسْتَوِى الْبَحْرَانِ هٰذَا | اور دونوں دریا یکساں نہیں ہیں، ایک |
| عَذْبٌ فُرَاتٌ سَائِغٌ شَرَابُهٗ | شیریں اور پینے کے لیے خوشگوار ہے |
| وَهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ وَمِنْ | اور دوسرا کھاری اور کڑوا ہے اور تم |
| كُلٍّ تَاْكُلُوْنَ لَحْمًا طَرِيًّا | دونوں میں سے تازہ گوشت کھاتے ہو |
| وَّتَسْتَخْرِجُوْنَ حِلْيَةً | اور پہننے کے لیے زیور نکالتے ہو اور تم |
| تَلْبَسُوْنَهَا وَتَرَى الْفُلْكَ | دیکھتے ہو کشتیوں کو ان میں پھاڑتی ہوئی |
| فِيْهِ مَوَاخِرَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ | چلتی ہیں تاکہ تم اللہ کا فضل تلاش کر |
| فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ | سکو اور تاکہ اس کی شکر گزاری کرو۔ |
| يُوْلِجُ الَّيْلَ فِى النَّهَارِ | داخل کرتا ہے رات کو دن میں اور دن |
| وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِى الَّيْلِ وَ | کو رات میں اور مسخر کیا ہے سورج |

سَخَّرَ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ (فاطر-۱۲-۱۳)

اور چاند کو ہر ایک، ایک وقت مقرر تک کے لیے چلتا ہے۔ یہی اللہ تمہارا رب ہے اسی کے ہاتھ میں بادشاہی ہے۔

کھاری پانی کے ایک سمندر اور شیریں پانی کے ایک دریا میں کتنا کھلا ہوا تضاد ہے۔ تاہم دیکھو، یہ دونوں کس طرح ایک مشترک مقصد کے حصول کا ذریعہ ہیں۔ کس طرح ان دونوں سے انسان اپنے لیے غذا کا ذخیرہ حاصل کر لیتا ہے۔ کس طرح ان دونوں سے اپنی زینت و آرائش کے لیے موتی حاصل کر لیتا ہے۔ پھر کس طرح یہ جہاز رانی اور تجارت کے نہایت آسان ذرائع فراہم کرتے ہیں، پھر شب کی ظلمت اور دن کے نور پر غور کرو۔ دونوں اپنی صفات و خصوصیات میں کس قدر ایک دوسرے کی ضد واقع ہوئے ہیں، لیکن ایک دوسرے کی ضد ہونے کے باوجود، پوری ہم آہنگی اور سازگاری کے ساتھ، ایک دایہ کی طرح اس کائنات کی پرورش اور اس کے اندر بسنے والے حیوانوں، انسانوں اور نباتات کی خدمت میں سرگرم ہیں۔ سورج دن میں طلوع ہوتا ہے، اور گرمی اور دھوپ کا سرچشمہ ہے، چاند شب میں نمودار ہوتا ہے اور روشنی اور خنکی کا منبع ہے۔ بظاہر دونوں ایک دوسرے سے کس قدر مختلف ہیں۔ لیکن دیکھتے ہو کہ اس دنیا کا ایک ایک وجود ان سے متمتع ہو رہا ہے اور یہ انسان کو بالواسطہ اور بلاواسطہ فیض رسانی پر مامور ہیں۔ کیا یہ سب کچھ اتفاق ہے؟ کیا یہ نظم، یہ ضابطہ کی پابندی، یہ سازگاری، یہ فیض رسانی سب کچھ آپ سے آپ ہو رہی ہے؟ ان مشاہدات کے باوجود جو لوگ دنیا کے اتفاقی حدوث پر اصرار کرتے ہیں ان کا یہ اصرار محض "نہ ماننے کی خواہش" پر مبنی ہے۔ علم و تحقیق سے اس ذہنیت کو کچھ سروکار نہیں ہے۔

**۳۔ ضد سے ضد کا وجود** اسی طرح ایک اور پہلو پر غور کرو۔ اس کائنات میں ہم

دیکھتے ہیں کہ ضد سے ضد کا وجود ہوتا ہے۔ سرسبز و شاداب درخت سے چنگاریاں جھڑتی ہیں۔

| | |
|---|---|
| جَعَلَ لَكُمْ مِنَ الشَّجَرِ الْأَخْضَرِ | اور سرسبز درخت سے تمہارے لیے |
| نَارًا | آگ بنائی۔ |

موت سے زندگی پیدا ہوتی ہے اور زندگی سے موت۔

| | |
|---|---|
| يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَمُخْرِجُ | نکالنے والا ہے زندہ کو مردہ سے اور |
| الْمَيِّتِ مِنَ الْحَيِّ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ | مردہ کو زندہ سے وہی اللہ ہے تم |
| فَأَنّٰى تُؤْفَكُونَ ۔ (انعام - ۹۵) | کہاں بھٹکے جاتے ہو۔ |

ظاہر ہے کہ علت و معلول کے عام قانون سے یہ شے بالاتر ہے اور پیدائش کا وہ معروف ضابطہ جس پر ہم کو اس درجہ اعتماد ہے کہ اس کی ادنیٰ خلاف ورزی کا بھی ہم تصور نہیں کر سکتے، یہاں آکر بالکل ٹوٹ جاتا ہے۔ کیا یہ اس امر کا نہایت واضح ثبوت نہیں ہے کہ کوئی ہستی ان تمام ضوابط سے بالاتر بھی ہے جو ان سب پر اپنی قدرت کاملہ سے تصرف کرتی رہتی ہے، اور اضداد سے اضداد کو وجود میں لاتی اور ان کو اپنی مخلوقات کے لیے نافع بناتی ہے؟ جو لوگ اس کائنات کو محض علت و معلول کے اندھے بہرے قواعد کا نتیجہ سمجھتے ہیں اور اسی روشنی میں اس کی توجیہ کرنا چاہتے ہیں وہ موت سے زندگی اور زندگی سے موت کے پیدا ہونے کی کیا توجیہہ کریں گے؟ اور ہرے بھرے درخت سے تر و تازہ پھلوں کی جگہ آگ کے شرارے جھڑنے کی کیا تعلیل کریں گے؟ کیا علت و معلول کا عام ضابطہ یہی چاہتا ہے کہ ضد سے ضد پیدا ہو؟ اگر ایسا نہیں ہے تو لازماً ایک ایسی ہستی کا اقرار کرنا پڑتا جو ان تمام سنن طبیعی پر حاکم و متصرف ہے۔

۴۔ متحدات سے مختلفات کا وجود | اسی سے ملتی جلتی ہوئی ایک اور حقیقت بھی

ہے۔ ہم اس کائنات میں دیکھتے ہیں کہ متحدات سے مختلفات کا وجود ہوتا ہے۔ سائنس کا دعویٰ ہے کہ یہ کائنات اپنے آغاز میں بسیط ہے۔ پھر درجہ بدرجہ اس کے اجزاء میں تنوع پیدا ہوتا ہے اور وہ بڑھتا جاتا ہے۔ یہ اگر سچ ہے اور اس کی سچائی سے انکار کی کوئی وجہ نہیں ہے تو اس سے یہ لازم آتا ہے کہ کوئی تفریق و تقسیم کرنے والا ہے جو ایک کو دو اور دو کو چار کرتا ہے۔ اور یہیں سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ یہ مظاہر کا تنوع اللہ کے تعدد و تنوع کی دلیل نہیں ہے۔ زمین ایک ہی ہے، پانی ایک ہی ہے۔ ہوائیں بھی ایک ہی طرح کی چلتی ہیں تاہم نباتات بے شمار قسم کی اگتی ہیں، پھولوں کے رنگ قسم قسم کے ہوتے ہیں، پھلوں کی شکل وصورت، ان کی مقدار، ان کے رنگ وبو، ہر چیز کے اندر تفاوت ہوتا ہے۔ ایک ہی گٹھلی سے کبھی ایک سے زائد انکھوے نکلتے ہیں اور ان سے متعدد تنے اور شاخیں پیدا ہو جاتی ہیں اور کبھی ایک ہی انکھوا نکلتا ہے اور ایک ہی تنا پیدا ہوتا ہے۔

| | |
|---|---|
| وَفِی الْاَرْضِ قِطَعٌ مُّتَجٰوِرٰتٌ | اور زمین میں پاس پاس کے ٹکڑے |
| وَّجَنّٰتٌ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّزَرْعٌ وَّنَخِیْلٌ | ہیں اور انگور کے باغ ہیں کھیتیاں |
| صِنْوَانٌ وَّغَیْرُ صِنْوَانٍ یُّسْقٰی | ہیں اور کھجوریں اکہرے اور دوہرے |
| بِمَآءٍ وَّاحِدٍ وَنُفَضِّلُ | ایک ہی پانی سے سیراب ہوتے ہیں |
| بَعْضَهَا عَلٰی بَعْضٍ فِی الْاُکُلِ ط | تاہم پھل میں ہم ایک کو دوسرے پر |
| اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ | بڑھا دیتے ہیں۔ بے شبہ اس میں نشانیاں |
| یَّعْقِلُوْنَ۔ (رعد - ۴) | ہیں سمجھنے والوں کے لیے۔ |

یعنی جس شخص میں عقل ہو گی لازماً اس سے اس کو تنبہ ہوگا اور وہ ہر چیز کے رنگ اور اس کے پھلوں اور پھولوں کے تنوعات پر غور کرے گا تو اس نتیجہ پر پہنچے گا

کہ کوئی خالق ہے جو کمال حکمت و قدرت اور کمال رحمت کے ساتھ تصرف فرما رہا ہے اور ساتھ ہی یہ حقیقت بھی اس پر واضح ہوگی کہ وہ اکیلا اور لا شریک لہٗ ہے کیونکہ جب ایک ہی پانی سے سیراب ہونے والے پودے اور ایک ہی قطعۂ زمین کے درختوں سے یہ سارے تنوعات ہم دیکھتے ہیں اور اس کو پانی اور زمین کے اختلاف کا نتیجہ نہیں قرار دیتے تو اس کائنات کی اس گوناگونی کو آلہہ کے تعدد کی دلیل کیوں ٹھہرائیں؟ نیز یہ بات بھی اس پر واضح ہوگی کہ یہ سارے تنوعات پیدائش کے کسی اندھے بہرے ضابطہ کے کرشمے نہیں ہیں بلکہ کوئی علیم و قدیر ہستی ہے جو ہر چیز کو اپنے اندازہ کے ساتھ وجود میں لاتی ہے اور اپنی حکمت کے مطابق اس میں کمی بیشی کرتی رہتی ہے۔

۵۔ مظاہر کائنات کی تسخیر | توحید کی ایک بہت بڑی دلیل وہ عجز و مقہوریت اور انقیاد و اطاعت بھی ہے جس کے آثار ہم اس کائنات کی تمام بڑی اور شاندار مخلوقات میں پاتے ہیں۔ یہ اس بات کا نہایت قوی ثبوت ہیں کہ ان میں سے کسی چیز کی طرف بھی الوہیت کی نسبت نہیں کی جا سکتی۔ الوہیت کی صفت کے ساتھ کوئی ایسی ہی ذات متصف ہے جو ان سب سے اعلیٰ اور ان سب سے برتر ہے۔ سورج، چاند، ستارے، اپنے حسن و عظمت کے باوجود، اور زمین، دریا، پہاڑ، ہوا، ابر، برق و رعد اپنی وسعت، قوت اور جلالت کے علی الرغم ایک محکم نظام حکمت کے ماتحت مقہور و مسخر ہیں۔ تو لازماً ان کے سوا کوئی اور ہے جو ان سب کا خالق اور سب پر فرمانروا ہے۔ اب غور کرو وہ کون ہے جو ان سب کا خالق اور سب پر آمر و متصرف ہے؟ اس سوال کو قرآن نے بار بار اٹھایا ہے اور اس کا جواب مشرک عربوں کی زبان سے بھی یہی نقل کیا ہے کہ اس عالم کا خالق ایک عزیز و حکیم ہے۔ لَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَنْ

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ لَيَقُوْلُنَّ خَلَقَهُنَّ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ (اگر تم ان سے پوچھو گے کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے خلق کیا تو وہ جواب دیں گے ان کو عزیز و علیم نے بنایا ہے) کیونکہ جو شخص اس کائنات کے مظاہر پر غور کرے گا وہ اسی نتیجہ پر پہنچے گا کہ ان میں سے کسی کی طرف اس کائنات کی تخلیق کی نسبت نہیں کی جا سکتی۔ اس کائنات کی خالق کوئی ایسی ہی ذات ہو سکتی ہے جو عزت و کبریائی اور علم و حکمت کی تمام صفات کے ساتھ متصف ہو۔

یہاں اس امر کو خاص طور پر پیش نظر رکھنا چاہیے کہ ان مظاہر میں سے جو جتنے ہی زیادہ شاندار ہیں ان کی پیشانی پر اطاعت کا داغ اسی قدر زیادہ ابھرا ہوا نظر آتا ہے۔ دنیا نے سورج اور چاند کی سب سے زیادہ پرستش کی ہے حالانکہ ذلت و اطاعت، سجود و ہبوط، اور کسوف و خسوف کے آثار، جو ہم ان میں دیکھتے ہیں دوسری کسی چیز میں بھی نہیں دیکھتے۔ لیکن یہ انسان کی عجیب حماقت ہے کہ ان آثار کے مشاہدہ کے باوجود نہ صرف یہ کہ اس نے ان کو دیوتا بنا کر ان کی پرستش کی بلکہ اس نے ان کی ذلت کی ان علامتوں کو بھی ان کی الوہیت کے دلائل میں سے گن لیا۔

توحید کی یہ دلیل، اجمال و تفصیل کی مختلف شکلوں میں، قرآن مجید میں بیان ہوئی ہے۔ ہم صرف حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اس حجت کو یہاں نقل کرتے ہیں جو انھوں نے اپنی قوم کے سامنے پیش کی اور ابراہیمی حسن مجادلہ کی بہترین تصویر ہے۔

| | |
|---|---|
| فَلَمَّا جَنَّ عَلَيْهِ الَّيْلُ رَاٰ | جب اس کو رات نے ڈھانک لیا |
| كَوْكَبًا قَالَ هٰذَا رَبِّيْ فَلَمَّآ | اس نے ایک تارے کو دیکھا، کہا |
| اَفَلَ قَالَ لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ ﴿﴾ | یہ میرا رب ہے۔ جب وہ غروب ہو گیا |
| فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا | کہا میں غروب ہونے والوں کو دوست |

| | |
|---|---|
| قَالَ هٰذَا رَبِّيْ فَلَمَّآ | نہیں رکھتا۔ جب چاند کو چمکتا دیکھا، کہا |
| اَفَلَ قَالَ لَئِنْ لَّمْ | یہ میرا رب ہے۔ جب ڈوب گیا، بولا |
| يَهْدِنِيْ رَبِّيْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ | اگر میرے پروردگار نے میری رہبری نہ |
| الْقَوْمِ الضَّآلِّيْنَ ۝ فَلَمَّا | فرمائی تو لازماً میں گمراہوں میں سے ہو |
| رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً | جاؤں گا۔ پھر جب سورج کو چمکتا ہوا |
| قَالَ هٰذَا رَبِّيْ هٰذَآ | دیکھا، کہا یہ میرا رب ہے، یہ بڑا ہے |
| اَكْبَرُ فَلَمَّآ اَفَلَتْ | جب وہ بھی ڈوب گیا، کہا اے |
| قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ | میری قوم کے لوگو! میں ان چیزوں سے |
| مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ | بری ہوں جن کو تم خدا کا شریک ٹھہراتے |
| اِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ | ہو، میں نے اپنا رخ یکسو ہو کر اس ذات |
| فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ | کی طرف پھیرا جس نے آسمانوں اور زمین |
| حَنِيْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ | کو پیدا کیا ہے اور میں مشرکوں میں سے |
| الْمُشْرِكِيْنَ ۔ (انعام ۔ ۷۶ ۔ ۷۸) | نہیں ہوں ۔ |

۶۔ کائنات کی محکم تدبیر | اسی طرح خدا کے وجود اور اس کی توحید کی ایک بہت بڑی شہادت وہ محکم اور ہمہ گیر تدبیر و نظام ہے جس کا، اس کائنات کے ہر گوشہ میں، ہم مشاہدہ کرتے ہیں۔ ایک طرف تو ہم دیکھتے ہیں کہ یہ دنیا مختلف قوتوں کی ایک رزم گاہ ہے، دوسری طرف یہ مشاہدہ کرتے ہیں کہ ان قوائے مختلفہ کے اس تصادم کے اندر نہ صرف یہ کہ تمام چھوٹی بڑی مخلوقات قائم و باقی ہیں بلکہ اپنی صلاحیت و استعداد کے اعتبار سے پھل پھول رہی ہیں۔ ایک طرف یہ حال ہے کہ معلوم ہوتا ہے، کہ اس کائنات کی ہر قوت شتر بے مہار کی طرح اپنے رخ پر بڑھتی چلی جا رہی ہے، نہ وہ کسی نظامِ قاہر کی پابند معلوم ہوتی نہ کسی برتر قوت کی محکوم و مطیع، لیکن

پھر دفعتہً ہم دیکھتے ہیں کہ کوئی مخفی ہاتھ اس کی باگ موڑ کر اس کو ایک سمت سے دوسری سمت پر لگا دیتا ہے۔ کتنی بار ہم دیکھ چکے ہیں کہ بعض بڑے بڑے اجرام سماویہ کسی خاص رخ پہ بڑھ چلے اور اگر وہ اسی رخ پر بڑھتے چلے جاتے تو لازم تھا کہ ہمارے کرۂ زمین سے ٹکرا جاتے اور یہ کرۂ زمین پاش پاش ہو کے رہ جاتا چنانچہ اس طرح کے مشاہدات کی بنا پر کبھی کبھی ماہرین فلکیات نے یہ اعلان بھی کر دیا کہ فلاں مدت کے اندر یہ زمین فلاں جرم سماوی سے ٹکرا جائے گی، لیکن جب وہ متعین وقت آیا دفعتہً اس جرم نے اپنا رخ اس طرح بدل دیا گویا کسی سوار نے مرکب کی باگ موڑ دی اور وہ عظیم خطرہ جو ہماری اس دنیا کے بالکل سر پر آ گیا تھا یکایک دفع ہو گیا۔

تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑیں گے پرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا

غور کرو، یہ راکب کون ہے؟ کون ہے جو قوی اور عناصر اور اجرام و اجسام کی باگیں تھامے ہوئے ہے؟ جس حد تک چاہتا ہے ان کو ڈھیلتا ہے اور پھر جہاں چاہتا ہے روک لیتا ہے اور اس کے بعد وہ ایک انچ بھی بڑھنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ کیا یہ محض اتفاق ہے؟ کیا یہ اندھی بہری قوتوں کی اپنی صواب دید سے سب کچھ ہو رہا ہے؟ کیا عقل بشری اور قلب انسانی کو ان جوابات سے تشفی و طمانیت مل سکتی ہے؟ قرآن اس کا جواب یہ دیتا ہے کہ ان اللہ یمسک السموات والارض ان تزولا ولئن زالتا ان امسکھما من احد من بعدہ انہ کان حلیما غفورا (اللہ آسمانوں اور زمین کو تھامے ہوئے ہے کہ اپنی جگہ سے ٹل نہ جائیں اور اگر وہ ٹل جائیں تو کوئی اس کے بعد ان کا تھامنے والا نہیں ہے بے شک وہ نہایت حلیم اور بخشنے والا ہے) اور کون ہے جو اس جواب کی

سچائی کا انکار کر سکتا ہے؟

یہ وہ تدبیر و نظام ہے جو اس مادی دنیا کے قویٰ اور عناصر کے درمیان ہم دیکھتے ہیں۔ اس سے آگے بڑھ کر اگر ہم اس کائنات کے اخلاقی قویٰ کے تصادم اور اس کے احوال و نتائج پر غور کریں تو وہاں بھی ہمیں یہی قانون کارفرما نظر آتا ہے۔ ایک باطل نظریہ جنم لیتا ہے، اس نظریہ کے علمبردار پیدا ہوتے ہیں، اس پر ایک باطل نظامِ اخلاق، ایک باطل نظامِ معیشت، اور ایک باطل نظامِ سیاست کے ردّے چڑھتے جاتے ہیں، یہاں تک کہ اندیشہ پیدا ہو جاتا ہے کہ اس کے غلبہ کے نیچے دب کر صالح اخلاق کے تمام عناصر دم توڑ دیں گے۔ تاہم اس نظامِ باطل کو مہلت ملتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ تمام خشکی و تری میں فساد کی سیاہی چھا جاتی ہے اور اس عالم کے مصلحین اس دنیا کی ازسرِنو اصلاح سے مایوس ہونے لگتے ہیں۔ پھر دفعتہً ایک وقت آتا ہے کہ کوئی مخفی ہاتھ نمودار ہو کر اس پورے نظامِ باطل کو اس طرح جھنجھوڑ دیتا ہے کہ اس کی ایک ایک اینٹ بکھر جاتی ہے۔ حتی اذا استایس الرسل وظنوا انھم قد کذبوا جاءھم نصرنا (یہاں تک کہ جب انبیاء قوم کے ایمان کی طرف سے مایوس ہو جاتے ہیں اور قوم کے لوگ گمان کرنے لگتے ہیں کہ ان کو جھوٹ عذاب کی دھمکی دی گئی تھی، ہماری مدد آجاتی ہے۔ دوسری جگہ فرمایا ہے۔ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ (اور ہلا دیے جاتے ہیں یہاں تک کہ پکار اٹھتے ہیں انبیاء اور وہ لوگ جو ان کے ساتھ ایمان لاتے ہیں کہ اللہ کی مدد کب آئے گی، آگاہ! اللہ کی مدد قریب ہے)

ان مشاہدات کے بعد کون ہے جو ایک لمحہ کے لیے بھی یہ باور کر سکے کہ یہ دنیا آپ سے آپ وجود میں آئی اور خود بخود قائم ہے یا یہ گمان کر سکے

کہ یہ مختلف قوی اور عناصر کی ایک رزم گاہ ہے اور یہ قوی اور عناصر کسی بالاتر طاقت کے زیرِ نگیں نہیں ہیں ؟ یا یہ خیال کر سکے کہ اس بالاتر قوت کی حاکمیت منقسم ہے ؟ یا یہ سوچ سکے کہ اس دنیا کو اس کے پیدا کرنے والے نے پیدا کر کے اندھے بھینسے کی طرح چھوڑ دیا ہے ۔ اس کے اوپر کوئی بالاتر اخلاقی اصول کارفرما نہیں ہے۔

**"ہر نظم اجتماعی کے لیے لازم ہے کہ حاکمیت غیر منقسم ہو"**

اس عالم کا مجرد قیام ہی اس بات کا شاہد ہے کہ اس کا حاکم ایک ہے جس کی حاکمیت غیر منقسم ہے ۔ ہم اپنی اجتماعی زندگی میں کسی سیاسی تنظیم کا تصوّر اس وقت تک نہیں کر سکتے جب تک حاکمیت کو کسی ایک خاص مرکز میں مرتکز نہ کریں ۔ حاکمیت کی تقسیم کے ساتھ کسی محکم تنظیم اجتماعی کا تصور نہیں کیا جا سکتا ۔ تمام سیاسی تنظیمات میں جمہوریت وہ نظام ہے جس نے حاکمیت کو ایک وسیع دائرہ میں پھیلانے کی کوشش کی ہے ۔ تاہم اس میں بھی ایک ایسا نقطہ لازماً تسلیم کرنا پڑتا ہے جہاں اس کی پھیلی ہوئی حاکمیت سمٹتی اور مجتمع ہوتی ہے ۔ اگر ایسا نہ ہو تو اس کا نراج اور انارکی کے طوفان میں منتشر ہو جانا لازمی ہے ۔ بہر حال یہ امر بالکل قطعی ہے کہ حاکمیت کی تقسیم کے ساتھ کسی اجتماعی تنظیم کا تصوّر نہیں کیا جا سکتا ۔ اب غور کرو کہ یہ دنیا اتنے بے شمار اجزا پر مشتمل ہونے کے باوجود نہ صرف قائم ہے بلکہ پوری قوت و استحکام کے ساتھ قائم ہے ۔ اس میں مختلف قویٰ کا تصادم بھی ہے ، اضداد کی آویزشیں بھی ہیں ، خیر و شر کے معرکے بھی ہیں لیکن اس دنیا کی کشتی ہے کہ ان موجوں کے تلاطم کے اندر سے بچتی ، سنبھلتی ، اچھلتی اور کتراتی ہوئی چلی جا رہی ہے اور اس خوبی و صفائی کے ساتھ کہ انسان کی عقل دنگ رہ جاتی ہے ۔ اس صورتِ حال کا مشاہدہ ہم میں سے ہر وہ شخص کر رہا ہے جو اس پادشاہی کے نظام پر غور کرتا ہے ۔ اب سوال یہ ہے کہ کون سی بات عقل سے قریب تر ہے ۔ کیا مشرکین

کا یہ عقیدہ کہ آسمان و زمین کے معبود الگ الگ ہیں یا یہ حقیقت کہ ایک ہی ہے جو آسمانوں کا بھی خدا ہے اور زمین کا بھی؟ کیا اس کائنات سے اس بات کی شہادت مل رہی ہے کہ نور و ظلمت کے الگ الگ الٰہ ہیں یا اس بات کی کہ روشنی اور تاریکی دونوں کا نکالنے والا ایک ہی ہے؟ کیا یہ بات صحیح معلوم ہوتی ہے کہ یہ دنیا بے شمار دیوتاؤں کی ایک رزم گاہ ہے یا یہ بات نظر آتی ہے کہ اس سارے نظام کا ناظم و مدبّر صرف اللہ واحد و قہار ہے؟ اگر پہلی بات صحیح ہے تو یہ شیرازہ بکھر کیوں نہیں جاتا۔ یہ نظام درہم برہم کیوں نہیں ہو جاتا؟ عرش والے کے خلاف بغاوت کیوں نہیں پھوٹ پڑتی؟ حاکمیت کے ایسے تشتت و انتشار کے ساتھ یہ وحدت قائم کیونکر ہے؟ یہی حقیقت ہے جو قرآن کریم نے عربوں کے سامنے اور ان تمام مشرک قوموں کے سامنے پیش کی ہے جو اس کائنات میں کسی نہ کسی نوعیت سے حاکمیت کے انقسام کو تسلیم کرتی ہیں۔

| | |
|---|---|
| اَمِ اتَّخَذُوْٓا اٰلِهَةً مِّنَ | کیا انھوں نے زمین کے الگ معبود ٹھہرا |
| الْاَرْضِ هُمْ يُنْشِرُوْنَ ه لَوْ | لیے ہیں وہ پیدا کرتے ہیں۔ اگر آسمان و |
| كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ | زمین میں اللہ کے سوا اور بھی معبود ہوتے |
| لَفَسَدَتَا فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ | تو یہ درہم برہم ہو جاتے۔ پس اللہ |
| رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا | عرش کا مالک پاک ہے ان چیزوں |
| يَصِفُوْنَ (انبیاء ۲۱-۲۲) | سے جو یہ بیان کرتے ہیں۔ |

دوسری جگہ فرمایا ہے۔

| | |
|---|---|
| قُلْ لَّوْ كَانَ مَعَهٗٓ اٰلِهَةٌ كَمَا | کہہ دو اگر اس کے ساتھ اور بھی |
| يَقُوْلُوْنَ اِذًا لَّابْتَغَوْا اِلٰى ذِى | خدا ہوتے جیسا کہ یہ کہتے ہیں تو وہ |
| الْعَرْشِ سَبِيْلًا ، سُبْحٰنَهٗ | عرش والے سے منازعت کی راہ |

وَتَعَالیٰ عَمَّا یَقُوْلُوْنَ عُلُوًّا کَبِیْرًا (بنی اسرائیل ۴۲-۴۳)

ڈھونڈتے۔ وہ پاک اور برتر ہے ان چیزوں سے جو یہ کہتے ہیں۔

۸۔ حق و باطل کی آویزش اور حق کا غلبہ | بعض قوموں کو خدا کی توحید بلکہ خود خدا کے باب میں بڑا سخت مغالطہ، دنیا میں شر و باطل کے وجود سے پیش آیا ہے۔ ان کی نظر باطل کے جھاگ پر جم گئی اور اس جھاگ کے نیچے جو حق کا مکھن تھا وہ ان کو نظر نہ آسکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ یا تو سرے سے کسی عزیز و رحیم اور پاک و قدوس خدا کے وجود ہی سے منکر ہو گئیں، یا مانا تو یہ مانا کہ یہ دنیا بہت سے خون آشام دیوتاؤں کی لیلا ہے اور وہ اس کو پیدا کر کے، دور بیٹھے ہوئے، اس کے مصائب و شدائد اور اس کے دکھوں اور آفتوں کا تماشا دیکھ رہے ہیں۔ یا پھر یہ کیا کہ خیر و شر اور نور و ظلمت کے الگ الگ خدا ٹھہرا لیے اور دنیا کو ان متضاد قوتوں کی ایک رزم گاہ بنا دیا۔ یہ غلط فہمی قوموں کو محض قلتِ تدبر، قلتِ صبر اور ظاہر بینی کی وجہ سے ہوئی۔ نہ انھوں نے اس دنیا کے اصلی مزاج و قوام کو پہچانا اور نہ حق و باطل کی اس آویزش کے اندر حق کے غلبہ کا مشاہدہ کیا۔ قرآن نے ان تمام اوہام کی نہایت تفصیل کے ساتھ تردید کی ہے۔ ہم اجمال کے ساتھ بعض حقائق کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں۔ قرآن نے اس دنیا کے اصلی مزاج کی طرف ان لفظوں میں اشارہ کیا ہے۔

| | |
|---|---|
| اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً | اللہ نے آسمان سے پانی اتارا، پس |
| فَسَالَتْ اَوْدِیَۃٌۢ بِقَدَرِھَا | وادیاں ایک اندازہ کے ساتھ بہ نکلیں |
| فَاحْتَمَلَ السَّیْلُ زَبَدًا رَّابِیًا ؕ | پس سیلاب کے اوپر جھاگ ابھر آئی |
| وَمِمَّا یُوْقِدُوْنَ عَلَیْهِ فِی النَّارِ | اور اسی طرح کی جھاگ اس چاندی میں |
| ابْتِغَآءَ حِلْیَۃٍ اَوْ مَتَاعٍ | ہوتی ہے جس کو آگ میں پگھلاتے ہیں |

| | |
|---|---|
| زَبَدٌ مِّثْلُهٗ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ | زیور بنانے کے لیے یا کوئی اور سامان۔ |
| اللّٰهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ فَاَمَّا | اسی طرح اللہ حق اور باطل کو ٹکراتا |
| الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً | ہے تو جھاگ اڑ جاتا ہے باقی جو لوگوں |
| وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ | کے لیے نفع بخش ہے وہ زمین میں اٹک |
| فِي الْاَرْضِ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ | جاتا ہے۔ ایسی ہی اللہ مثلیں بیان |
| اللّٰهُ الْاَمْثَالَ ۔ (رعد۔ ۱۷) | کرتا ہے۔ |

یعنی اس دنیا کا اصلی مزاج یہ ہے کہ جس طرح ایک خوش مذاق اور سلیم الفطرت انسان مکھی کو نہیں ہضم کر سکتا اسی طرح یہ باطل کو نہیں ہضم کر سکتی۔ یہ ہر گوشہ میں باطل کو چھانٹتی رہتی ہے اور حق و نافع کو قبول کرتی ہے۔ بارش ہوتی ہے اور وادیاں بہ نکلتی ہیں تو تم دیکھتے ہو کہ پانی کی سطح پر جھاگ ابھر آتے ہیں، پھر پانی زمین میں ٹک جاتا ہے اور جھاگ خشک ہو کر ہوا میں اڑ جاتا ہے۔ اسی طرح تم چاندی کو زیور بنانے کے لیے کٹھالی میں پگھلاتے ہو، اس کا میل الگ ہو جاتا ہے اور خالص چاندی بچ رہتی ہے۔ یہی اس دنیا کا اصل مزاج ہے۔ اس میں مجرد باطل کا وجود نہیں ہے۔ باطل جب بھی پایا جاتا ہے حق کے ساتھ مخلوط ہو کر۔ جس طرح صالح درختوں اور صالح جانداروں کے ساتھ طفیلی پودے اور طفیلی کیڑے چمٹ جاتے ہیں اسی طرح حق کے ساتھ باطل چمٹ جاتا ہے۔ تم تنگ نظری کی وجہ سے ان طفیلی کیڑوں اور طفیلی پودوں ہی کو اصل سمجھنے لگتے ہو اور پھر قدرت کی زیادتیوں اور بے حکمتیوں پر معترض ہوتے ہو حالانکہ یہ اعتراض محض تمہاری بوالفضولی اور حماقت کا نتیجہ ہے۔ قدرت ہر گوشہ میں نہایت حکیم اور حق دوست ہے۔ اگر کسی مصنوع سے صانع کے مذاق و طبیعت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے تو اس دنیا کے اس مزاج کو دیکھ کر نہایت آسانی سے

ہم اس نتیجہ پہ پہنچ سکتے ہیں کہ اس کائنات کا خالق حق ہے، حق کو پسند کرتا ہے اور اپنے کلمات سے حق کو قائم و ثابت کرتا ہے۔ یہی حقیقت ہے جو ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے۔

| | |
|---|---|
| وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ | اور ہم نے نہیں بنایا آسمان و زمین کو |
| وَمَا بَیْنَهُمَا لٰعِبِیْنَ ، لَوْ | اور جو کچھ ان کے درمیان ہے کھیل |
| اَرَدْنَآ اَنْ نَّتَّخِذَ لَهْوًا | کرنے کے لیے۔ اگر ہم کھیل بنانا چاہتے |
| لَّاتَّخَذْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّآ اِنْ | تو اپنے پاس ہی سے بنا لیتے اگر ہم یہ کرنے |
| كُنَّا فٰعِلِیْنَ ، بَلْ | والے ہی ہوتے بلکہ ہم حق کو باطل پر مارتے |
| نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ | ہیں تو وہ اس کا بھیجا نکال لیتا ہے |
| فَیَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ | اور باطل دفعتہً نابود ہو جاتا ہے اور |
| زَاهِقٌ ، وَلَكُمُ الْوَیْلُ مِمَّا | تمہارے لیے ہلاکی ہے ان باتوں کے سبب |
| تَصِفُوْنَ۔ (انبیاء ۱۶-۱۸) | سے جو تم بیان کرتے ہو۔ |

اس دنیا کے اندر جو مصائب و آلام ہیں وہ بھی اس امر کی دلیل نہیں ہیں کہ یہ دنیا مختلف المزاج دیوتاؤں کی رزم گاہ ہے، قرآن نے تمام آسائشوں اور تمام دکھوں کو ایک ہی حکیم و قدیر خدا کی مشیت و حکمت کے تحت، اور ان کو قوموں کے اخلاق و اعمال کا نتیجہ قرار دیا ہے اور نہایت تفصیل کے ساتھ یہ سمجھایا ہے کہ بعض مرتبہ یہ آفتیں اس لیے آتی ہیں کہ جو مغرور اپنی سرکشی میں حد سے آگے بڑھ گئے ہیں وہ ان سے متنبہ ہوں اور اپنے ضعف و عجز کو محسوس کر کے خدا کی طرف لوٹیں۔ بعض مرتبہ ان کا ظہور اس لیے ہوتا ہے کہ کوئی سرکش قوم، جس پر اللہ تعالیٰ کی حجت تمام ہو چکی ہے، ان کے ذریعہ سے تباہ کر دی جائے۔ بعض حالات میں اہل حق بھی ان میں سے کچھ حصہ پاتے ہیں تاکہ ان کے ایمان و عقیدہ اور

صبر و عزیمت کا امتحان ہو، کمزوریاں دور ہوں اور خوبیاں اور قابلیتیں بروئے کار آئیں۔ ان ساری باتوں کو قرآن حکیم نے مختلف اسلوبوں سے نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے جس سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آتی ہے کہ جس طرح رات اور دن، سردی اور گرمی دونوں اس دنیا کے مادی بقا کے لیے یکساں ضروری ہیں اسی طرح نعمتوں اور خوش حالیوں کے ساتھ ساتھ آفات و آلام بھی اس دنیا کی اخلاقی زندگی اور روحانی حیات کے لیے ناگزیر ہیں اور یہ ہرگز اس امر کا ثبوت نہیں ہیں کہ اس دنیا میں کون و فساد اور رحمت و نقمت کے الگ الگ دیوتا ہیں، بلکہ صرف ایک ہی جو منعم بھی ہے اور وہی منتقم بھی ہے اور اس کا یہ انتقام بھی درحقیقت اس کے انعام ہی کا ایک پہلو ہے جیساکہ قرآن میں اس امر کو واضح فرمایا ہے۔

یہی حال گناہوں اور معاصی کا ہے۔ یہ بھی خدا کی مشیت کے تحت ہیں اور اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت، جو انسان پر ہوئی ہے، یعنی اختیار، یہ اس کے ظلال میں سے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو نیکی و بدی کی پہچان دے کر اس کا امتحان کیا ہے۔ یہ امتحان مقتضی ہوا کہ انسان کو فی الجملہ آزادی بخشی جائے۔ اس آزادی کی وجہ سے انسان نیکی اور بدی دونوں کی راہیں اختیار کر سکتا ہے پہلی راہ اُس کی فطرت کی راہ ہے اور اس پر اس کا چلنا اللہ تعالیٰ کو پسند ہے، دوسری راہ فطرت اور خدا سے بغاوت ہے اور اس پر چلنا اللہ تعالیٰ کو نہایت ناپسند ہے لیکن وہ جس کو چاہتا ہے اس راہ پر چلنے کی بھی مہلت دیتا ہے کیونکہ اس مہلت کے بغیر آزادی کی نعمت بے معنی ہو جاتی ہے۔ انسان کی یہ آزادی خدا کی بخشش اور اس کی مشیت کے تحت ہے اور یہ لازم نہیں ہے کہ جو بات خدا کی مشیت کے تحت ہو وہ اس کو پسند بھی ہو۔ وہ اتمامِ حجت کے لیے ان کاموں

کے لیے بھی لوگوں کو ڈھیلتا ہے جو صریحاً اس سے بغاوت کے حکم میں داخل ہوتے ہیں۔ پس خیر ہو یا شر کل اللہ ہی کی جانب سے ہے۔ کوئی چیز بھی اس کی مشیت اور اختیار کے دائرہ سے باہر نہیں ہے۔ نہ جبر محض کا دعویٰ صحیح ہے نہ اختیار مطلق کا۔ حق ان دونوں کے درمیان ہے اور تفصیل اس کی انشاء اللہ اپنے محل میں آئے گی۔

اوپر کی تفصیل سے یہ بات ثابت ہوئی کہ اس کائنات میں شر محض کا وجود نہیں ہے۔ شر حق کے ظلال کی حیثیت سے پایا جاتا ہے اور حق ہی کی خدمت کے لیے ہے۔ پس لازماً اس کائنات کا خالق حق ہے اور حق کو دوست رکھتا ہے۔ نیز یہیں سے یہ بات بھی آپ سے آپ نکل آئی کہ خیر و شر، نور و ظلمت، راحت و مصیبت، نیکی و بدی اور کون و فساد کے الگ الگ دیوتا نہیں ہیں، ایک ہی ہے جس کے تحت تصرف یہ سارا کارخانہ چل رہا ہے۔

۹۔ اشارات | اسی طرح توحید کی نہایت اہم دلیلیں ان لطیف اشارات (SUGGESTIONS) میں ملتی ہیں جو اس کائنات کے مختلف مظاہر میں مضمر ہیں۔ اور یہ صرف ان کو نظر آتے ہیں جو باریک بین نظر اور عبرت پذیر قلب رکھتے ہیں۔ یہ قرآنی دلائل کی ایک مخصوص قسم ہے جو منطق کی گرفت سے بالکل بالا ہے اور اس سے وہ قومیں بہت کم فائدہ اٹھا سکتی ہیں جو استدلال کے مصنوعی طریقوں کی خوگر ہو کر استنباط و استنتاج اور عبرت و تنبہ کا وہ فطری جوہر کھو بیٹھی ہوں جو اللہ تعالیٰ نے ہر سلیم الفطرت انسان میں ودیعت فرمایا ہے۔ یہ جوہر صرف ان قوموں میں محفوظ رہتا ہے جو فطری سادگی پر قائم رہتی ہیں اور اس اعتبار سے تمام قوموں میں اہل عرب کو جو بلند مقام حاصل تھا وہ معلوم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ نہایت ذکی الحس تھے اور اشاروں میں وہ سب کچھ پڑھ لیتے تھے

جو دوسرے موٹی موٹی کتابوں میں بھی پڑھ کے نہیں سمجھ سکتے تھے۔ جو لوگ عرب کے خطباء اور شعراء جاہلیت کے کلام پر نظر رکھتے ہیں وہ ان کے اس ذوق سے اچھی طرح واقف ہیں۔ وہ منزلِ یار کے ایک ایک مٹے ہوئے نقش کو اس طرح نمایاں کرتے ہیں، اس سے اس درجہ متاثر ہوتے ہیں اور پھر اس کی عبرتوں اور اس کے مخفی اشاروں اور پیغاموں کی ایسی موثر تصویر کھینچتے ہیں کہ سننے والے کا دل بھی بھر آتا ہے۔ قرآن سے پہلے ان کا یہ ذوق نظر، جس کے لیے عربی ادب میں صحیح لفظ "توسّم" ہے صرف دیارِ یار کے آثار و نشانات تک محدود تھا اور لازماً اس کے اثرات بھی معمولی اور ادنیٰ درجے کے تھے۔ قرآن نے ان کے اس ذوق کو وسعت دی اور کائنات کے آثار و عجائب اور اس کے اشارات کی وسعتوں کی طرف توجہ دلائی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو قوم زیادہ سے زیادہ امرؤ القیس اور زہیر کے درجہ کے اشخاص پیدا کر سکتی تھی اس کے اندر سے ابوبکر صدیقؓ اور عمر فاروقؓ جیسی عظیم الشان ہستیاں اٹھیں۔

یہ اشارات قرآن کے تمام بنیادی مسائل توحید، رسالت، معاد کے سلسلہ میں نمایاں کیے گئے ہیں۔ یہاں سب کی تفصیل کا موقع نہیں ہے۔ ہم صرف توحید سے متعلق ایک اشارہ کی توضیح کریں گے تاکہ دوسرے اشارات پر غور کرنے کے لیے نمونہ کا کام دے[1]

---

[1] اس کائنات کے اشاراتِ حقیقت کی کوئی حد نہیں ہے۔ جس طرح ہم عیسائیوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ اپنے گرجوں کی ہر چیز میں اپنے بنیادی عقائد کا مظاہرہ کرتے ہیں، مثلاً اگر تثلیث پیش نظر ہے تو عمارت کے ایک ایک گوشہ سے تثلیث نمایاں ہو گی یہاں تک کہ فرنیچر کی قسم کی بھی جو چیزیں ہوں گی سب مثلث ہوں گی۔ میز، قلم دان، قلم اور پیپر ویٹ تک سے تثلیث پکار رہی ہو گی۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کی ہر چیز میں توحید اور معاد کے حقائق کا مظاہرہ

سورۂ رعد میں فرمایا ہے۔

| | |
|---|---|
| وَلِلّٰہِ یَسْجُدُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ | اور اللہ ہی کو سجدہ کرتے ہیں جو |
| وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّ کَرْھًا وَّ | آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں |
| ظِلٰلُھُمْ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ۝ | راضی خوشی اور مجبوراً اور ان کے سائے |
| قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ وَ | صبح و شام، پوچھو کون ہے آسمانوں |
| الْاَرْضِ قُلِ اللّٰہُ۔ | اور زمین کا رب، کہو اللہ |

"طَوْعًا وَّ کَرْھًا" کا مطلب یہ ہے کہ جو اپنے اندرونی داعیہ سے خدا کو سجدہ کرتے ہیں وہ تو کرتے ہی ہیں لیکن جو اپنے اندرونی داعیہ سے خدا کے آگے نہیں جھکتے اُنھیں مجبوراً جھکنا پڑتا ہے اور اس کے بعد اس مجبورانہ سجدہ کی شرح فرما دی کہ ان کے سائے صبح و شام خدا کا سجدہ بجا لاتے ہیں اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا ہر شخص اپنے وجود کے اندر مشاہدہ کر رہا ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ہر چیز کا سایہ آفتاب کے زوال کے ساتھ آفتاب کی بالکل مخالف سمت میں زمین پر اس طرح جھکنا شروع ہوتا ہے جس طرح ایک رکوع کرنے والا خدا کے آگے جھکتا ہے اور غروب آفتاب کے ساتھ یہ سایہ اس طرح زمین پر بچھ جاتا ہے جس طرح ایک ڈنڈوت کرنے والا اپنے معبود کے سامنے ڈنڈوت کرتا ہے یا ایک ساجد خدا کے حضور سجدہ کرتا ہے اور پھر ایک شب زندہ دار کی طرح رات بھر اسی حالت میں پڑا رہتا ہے

---

(حاشیہ صفحہ گزشتہ) فرمایا ہے اور جس گوشہ پر بھی انسان تدبر کی نظر ڈالے۔ وہیں سے اس کو توحید اور معاد کی کوئی نہ کوئی دلیل ہاتھ آجائے گی۔ اسی کو بعض عارفوں نے کہا ہے۔ "ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار" لیکن غافل انسان اتنے دلائل کے باوجود خدا کی توحید اور جزا کے باب میں بھٹک جاتا ہے۔ کَاَیِّنْ مِّنْ اٰیَةٍ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الآیۃ۔

پھر جب صبح ہوتی ہے تو یہ سایہ بالتدریج سورج کی بالکل مخالف سمت سے اٹھنا شروع ہوتا ہے اور آہستہ آہستہ پورے قیام کی حالت میں آجاتا ہے جس طرح ایک مصلی سجدہ سے قیام کی حالت میں آگیا ہو۔ اور پھر سورج کے زوال کے ساتھ اسی رکوع اور سجود کا دور آجاتا ہے جو اوپر مذکور ہوا۔

یہ صورتِ حال دو نہایت اہم حقیقتوں کی شہادت دے رہی ہے۔ ایک یہ کہ اس کائنات کی ہر چیز چوبیس گھنٹے رکوع و سجود میں ہے۔ دوسری یہ کہ یہ سجدہ آفتاب پرستی کے بالکل ضد ہے۔ آفتاب جب مشرق سے طلوع ہوتا ہے، ہر چیز کا سجدہ مغرب کی طرف ہوتا ہے اور جب مغرب میں غروب ہونے لگتا ہے، ہر چیز کا سجدہ مشرق کی طرف ہوتا ہے۔ کسی وقت بھی کوئی چیز اپنے تکوینی سجدہ میں آفتاب کی موافقت نہیں کرتی۔ پھر اگر ایک انسان، جو ایک با اختیار مخلوق ہے، خدا کو سجدہ نہ کرے بلکہ اس کے سامنے اکڑے یا سورج اور چاند کو سجدہ کرے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ خود تو خدا کے سامنے اکڑتا ہے لیکن اس کے سارے وجود کا سایہ خدا کے آگے بچھا ہوا ہے۔ یا وہ خود تو سورج اور چاند کے آگے سجدہ کر رہا ہے لیکن اس کا سایہ ابراہیمی فطرت رکھتا ہے جو کواکب پرستی سے بالکل بیزار اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ پر عامل ہے۔ عالمِ اختیار اور عالمِ تکوینی کی یہ بے ربطی "من چہ می سرایم و طنبورۂ من چہ می سراید" کی مصداق ہے۔

یہی دلیل ہے جس کو قرآن نے دوسری جگہ کسی قدر مختلف الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔

| | |
|---|---|
| اَوَلَمْ یَرَوْا اِلٰی مَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَیْءٍ یَّتَفَیَّؤُا ظِلٰلُهٗ | کیا انھوں نے نہیں دیکھا ان چیزوں کی طرف جو خدا نے پیدا کی ہیں لوٹتا ہے |

عَنِ الْيَمِيْنِ وَالشَّمَآئِلِ سُجَّدًا لِلّٰهِ وَهُمْ دَاخِرُوْنَ (۴۸ - النحل)

ان کا سایہ دہنے اور بائیں سے سجدہ کرتا ہوا اللہ کو اور وہ اس کے آگے ذلیل ہیں۔

قرآن میں اس طرح کے اشارات بہت ہیں اور ہر جگہ ان سے توحید، معاد اور رسالت کے نہایت اہم حقائق کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ جو قومیں صغریٰ و کبریٰ کی ترتیب کے بغیر کوئی بات نہیں سمجھ سکتی ہیں۔ ان کے لیے بے شبہ ان اشارات کے اندر کوئی تعلیم نہیں ہے، لیکن عرب جیسی حساس قوم اس طرح کے اشارات سے نہ صرف یہ کہ فائدہ اٹھاتی تھی بلکہ ان کی اصلی عقلی غذا ان اشارات ہی میں تھی۔ یہ چیز تربیت عقل کے لیے بھی نہایت نافع ہے اور تاثیر کے اعتبار سے تو اشارات کی زبان تصریحات کے مقابلہ میں ہمیشہ بلیغ تر سمجھی گئی ہے۔ ہم ہزاروں صفحات کی ورق گردانی سے بھی اپنے قلب پر وہ اثر نہیں کر سکتے جو تغلق آباد اور دلی مرحوم کے کھنڈروں پر ایک اچٹتی نظر ڈال کر کر سکتے ہیں۔

از نقش و نگار در و دیوار شکستہ
آثار پدید است صنادید عجم را

# توحید کے دلائل انفس میں

انسان پہلے ظاہر پر نظر ڈالتا ہے۔ پھر جب عقل و تمیز میں پختگی پیدا ہوتی ہے، اپنے باطن کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اور یہ بات محض متوجہ ہونے کی حد تک موخر ہے ورنہ درحقیقت باطن ہی ہے جو اس کے سامنے ظاہر کو بھی بے نقاب کرتا ہے۔ اتنے دنوں تک اپنے باطن سے بے پرواہی کا سبب یہ نہیں ہوتا کہ انسان کا باطن اس سے بہت دور ہے۔ نہیں۔ بلکہ یہ بے پرواہی اس کے غایت قرب کی وجہ سے ہوتی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ دلائل آفاق کی بنیاد درحقیقت انفسی دلائل ہی پر ہے۔ آسمان و زمین کے دلائل میں سے کوئی دلیل ایسی نہیں ہے جس کی اساس کسی نفسی دلیل پر نہ ہو۔ اسی پر ہمارے تمام استدلال کی عمارت قائم ہے۔ اگر یہ نفسی دلائل نہ ہوتے تو جس طرح جمادات و بہائم کے لیے یہ تمام عالم تیرہ و تار ہے اسی طرح انسان کے لیے بھی یہ عالم ظلمات ہوتا چنانچہ جو بلید آسمان و زمین کی آیتوں پر غور نہیں کرتے ہیں ان کے لیے یہ تمام عالم بالکل بے غایت اور بے معنی ہے اور قرآن نے ان کو چوپایوں سے بھی زیادہ بے عقل قرار دیا ہے۔

اب ہم اس باطن کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جس کے دلائل ہم سے قریب تر بھی ہیں اور واضح تر بھی، دلنشیں بھی ہیں اور مستحکم بھی، جن کی طرف قرآن حکیم نے ان الفاظ میں توجہ دلائی ہے۔

وَفِی الْاَرْضِ اٰیٰتٌ لِّلْمُوْقِنِیْنَ   اور زمین میں نشانیاں ہیں یقین کرنے والوں

وَفِي أَنفُسِكُمْ أَفَلَا تُبْصِرُونَ۔ — اور خود تمھارے نفوس کے اندر بھی کیا تم نہیں دیکھتے۔

اس آیت کا اسلوب بول رہا ہے کہ عالمِ نفس کے دلائل قریب تر بھی ہیں اور واضح تر بھی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے تعجب کا اظہار فرمایا ہے کہ اس قرب اور اس وضاحت کے باوجود وہ انسان کو نظر کیوں نہیں آتے! ان سارے دلائل کا احاطہ انسان کے لیے مشکل ہے۔ ہم صرف بعض ایسی دلیلوں کی طرف اشارہ کریں گے جو قرآن مجید میں بیان ہوئی ہیں اور نہایت واضح ہیں۔

۱۔ عہدِ فطرت | توحید کے نفسی دلائل میں سب سے پہلی دلیل وہ ہے جس کی تشریح ہم نے رسالہ "حقیقتِ شرک" کی آخری دو فصلوں میں کی ہے یعنی انسانی نفس کے اندر ایک منعمِ حقیقی کا شعور سب سے زیادہ قدیم اور سب سے زیادہ واضح ہے۔ وہاں ہم نے علماء سائنس کے اس دعوے کی تردید کی ہے کہ انسان کے اندر سب سے زیادہ قدیم جذبہ خوف کا جذبہ ہے جو کائنات کے مظاہر سے پیدا ہوا اور پھر اسی سے ان کی عبادت کا تصور ہُوا۔ اور بدلائل ثابت کیا ہے کہ خوف کا جذبہ اس بات کو مستلزم ہے کہ اس سے پہلے زندگی اور اسبابِ زندگی کے نعمت ہونے کا شعور انسان میں موجود ہو۔ جب تک زندگی کے نعمت ہونے کا احساس نہ ہو اس وقت تک اس کے متعلق کسی اندیشہ کا احساس بالکل بے معنی ہے۔ اور نعمت کا شعور ایک مُنعم کے شعور کو مستلزم ہے اور منعم اور نعمت کا شعور انسان میں منعم کی شکرگزاری کا جذبہ اور تصوّر پیدا کرتا ہے۔ یہ جذبہ نہ تو مجرد الف و عادت کی پیداوار ہے اور نہ محض اجتماعی و تمدنی زندگی کے تکلفات کا نتیجہ ہے۔ حیوانات تک میں یہ جذبہ موجود ہے۔ ہم جن جانوروں کو اپنے گھروں میں پالتے ہیں ان کے اندر بھی اپنی

آنکھوں سے اس کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ ایک بلی سے لے کر ایک ہاتھی تک جن پر بھی ہم کوئی احسان کرتے ہیں، وہ اپنی مختلف اداؤں کی زبان سے اپنی سپاس گزاری اور ممنونیت کا اظہار کرتے ہیں۔ یہی جذبہ، بہتر سے بہتر ترقی یافتہ صورت میں، انسان کے اندر موجود ہے جس کو ہم دوسرے لفظوں میں، عدل سے تعبیر کرتے ہیں، جس کی وجہ سے انسان کا یہ حال ہے کہ جس پیمانہ سے اس کے لیے ناپا جاتا ہے اسی پیمانہ سے وہ دوسروں کے لیے ناپتا ہے۔ اور اسی جذبۂ عدل نے خالص خدا پرستی اور توحید کی بنیاد ڈالی اور یہ توحید کے نہایت اہم دلائل میں سے ہے۔ اس عدل فطری کا تقاضا ایک طرف تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حق واجب کا پورا پورا اقرار کیا جائے اور دوسری طرف اس کا تقاضا یہ ہے کہ جو حقوق خدا کے لیے واجب ہیں ان میں بلا وجہ دوسروں کو ساجھی نہ قرار دیا جائے۔ اس کو قرآن میں ظلم عظیم یعنی سب سے بڑی ناانصافی اور حق تلفی سے تعبیر کیا گیا ہے جس کے معنی دوسرے لفظوں میں یہ بھی ہوئے کہ سب سے بڑا عدل توحید ہے اور سب سے بڑا ظلم شرک۔

اس عدل کو قرآن نے انسانی فطرت کے عہد سے تعبیر کیا ہے۔

| | |
|---|---|
| وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ | اور یاد کرو جب لیا تمہارے پروردگار |
| اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ | نے بنی آدم سے یعنی ان کی پیٹھوں سے |
| وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ | ان کی اولاد کو اور ان کو گواہ ٹھہرایا |
| اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۭ قَالُوْا | ان کے اوپر کیا میں تمہارا پروردگار |
| بَلٰي ۚ شَهِدْنَا ۚ اَنْ تَقُوْلُوْا | نہیں ہوں؟ بولے ہاں ہم گواہ ہیں |
| يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا | یہ اس لیے کہ تم قیامت کے دن یہ |
| عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ (اعراف۔ ۱۷۲) | نہ کہو کہ ہم تو اس سے بے خبر تھے۔ |

اس عہد کی حقیقت پر ہم نے "حقیقت شرک" کی آخری فصل میں ایک مختصر تقریر لکھی ہے جس کے بعض حصے ہم یہاں نقل کرتے ہیں۔

بعض لوگ اس پر اعتراض کرتے ہیں کہ کیا معلوم اس قسم کا کوئی عہد ہوا ہے؟ ہمیں تو نہ اس "اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ" کی کوئی خبر ہے نہ اس "بلیٰ" کی۔ یہ دونوں باتیں محتاج ثبوت ہیں بالخصوص جب کہ اس کی اہمیت اس درجہ ہو کہ قیامت کے دن یہ عہد ہر شکل ہر ابن آدم پر حجت ہوگا۔ لیکن حیرت ہے کہ لوگوں کو کیا بات نہیں معلوم ہے! ایک انسان پانی کی ایک حقیر بوند کی شکل میں ماں کے پیٹ میں پڑتا ہے۔ ماں، نہیں معلوم کتنے مصائب جھیل کر اور کتنے دکھ اٹھا کر ۹ مہینے اس کو پیٹ کے اندر ہی پالتی ہے۔ اپنے گوشت و خون سے اس کی پرورش کرتی ہے۔ پھر جان کی بازی کھیل کر ایک مضغۂ گوشت کی صورت میں اس کو جنتی ہے۔ پھر اپنے جسم کا ایک ایک قطرۂ خون دودھ بنا کر اس کو پلاتی ہے اور برسوں کی جان کاہیوں کے بعد اس کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ زمین پر چل پھر سکے۔ اس کے بعد باپ کے ایثار، اس کی شفقتوں اور اس کی غور و پرداخت اور تربیت و نگہداشت کا دور آتا ہے جو ایک طویل عرصہ تک جاری رہتا ہے۔ اس عرصہ میں باپ جو کچھ اپنے لیے چاہتا ہے اس سے زیادہ بچے کے لیے چاہتا ہے۔ وہ خود کم کھاتا ہے تاکہ اس کو کھلائے۔ وہ خود تکلیف اٹھاتا ہے تاکہ بچے کو آرام پہنچے۔ وہ اپنی جان جوکھم میں ڈالتا ہے تاکہ بچہ خطرہ سے محفوظ رہے۔ ماں باپ کی محبتوں، شفقتوں اور جاں بازیوں کا یہ سلسلہ ہے جو ایک بچہ کو پال کر جوان بناتا ہے۔ اگر اس میں سے ایک کڑی بھی ٹوٹ جائے تو بچہ کی زندگی ہی خطرہ میں پڑ جائے۔ اب فرض کیجیے بچہ جوان ہوا اور والدین بڑھاپے کو پہنچے۔ اب یہ محتاج ہیں اور وہ مستغنی، لیکن بیٹا ان کا کوئی

خیال نہیں کرتا اور اگر کوئی شخص اس کو والدین کے حقوق وفرائض یاد دلائے تو وہ جواب دیتا ہے کہ مجھے نہیں معلوم کہ ماں باپ کے کچھ حقوق وفرائض بھی ہیں، مجھے اس قسم کے کسی فرض یا ذمہ داری کی کوئی خبر نہیں ہے۔ میں نے اس قسم کے کسی حق کا کبھی اقرار نہیں کیا ہے، تو ہر شخص ایسے بیٹے کو کمینہ اور لئیم کہے گا کیونکہ وہ ایسے حق اور ذمہ داری کا انکار کر رہا ہے جس سے زیادہ ثابت اور مسلم ذمہ داری کوئی نہیں۔ یہ ذمہ داری ہر استحقاق کے ساتھ خود بخود لگی ہوئی ہوتی ہے۔ یہ بغیر تحریر کے نوشتہ، بغیر گواہی کے ثابت اور بغیر مطالبہ کے مسلم ہے۔ یہ استحقاق (PRIVILEGE) اور ذمہ داری (RESPON-SIBILITY) کا وہ فطری عہد ہے جس سے زیادہ انسان کو کوئی عہد بھی یاد نہیں۔

اسی بنیاد پر ایک انسان اس عورت کے لیے نان ونفقہ اور حفاظت حرمت کا حق تسلیم کرتا ہے جس سے وہ متمتع ہوتا ہے۔ اسی بنیاد پر آدمی پر اپنے خاندان اور قبیلہ کی حفاظت ونصرت کے فرائض عائد ہوتے ہیں۔ اسی بنیاد پر ایک شہر کی میونسپلٹی شہریوں کی کمائی میں حصہ دار ہوتی ہے۔ اسی بنیاد پر ایک سلطنت اپنی رعیت سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ اپنے علم وقابلیت، وقت اور آزادی جان اور مال میں اس کو شریک کریں اور اگر سلطنت کا وجود کسی خطرہ میں پڑ جائے تو اس کے بچاؤ کے لیے سب کچھ قربان کر دیں۔ اب فرض کیجیے ایک شخص ایک عورت کی حرمت کا مالک تو بن بیٹھا لیکن اس کے نان ونفقہ کی ذمہ داری اور اس کے حقوق وفرائض سے انکار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میں نے اس قسم کا کوئی اقرار نہیں کیا ہے۔ یا ایک شہری میونسپلٹی کی سڑکوں پر چلتا تو ہے، اس کے حفظانِ صحت کے انتظام سے فائدہ تو اٹھاتا ہے۔ اس کے پارکوں اور چمنوں سے متمتع تو ہوتا ہے، اس کی جلائی ہوئی لالٹینوں سے روشنی تو حاصل کرتا ہے

اس کے قائم کیے ہوئے مدرسوں سے منتفع تو ہوتا ہے لیکن جب اس کے مطالبات کا وقت آئے تو وہ جواب دے دے کہ میں اس مطالبہ کی ذمہ داری سے بری ہوں۔ یا اسی طرح ایک آدمی ایک سلطنت کے اندر شہریت کے جملہ حقوق سے متمتع ہو رہا ہے، اس کے امن و عدل سے فائدہ اٹھا رہا ہے۔ اس کے قانون اور نظام کی بدولت وہ ایک ملکیت کا مالک، ایک بیٹے کا باپ، ایک بیوی کا شوہر، ایک سلطنت کا شہری ہے، لیکن جب سلطنت کے مطالبات کا وقت آئے تو کہہ دے کہ میں اس قسم کی کوئی ذمہ داری تسلیم نہیں کرتا۔ میں نے اس قسم کے بار اٹھانے اور اس قسم کی جوکھم میں پڑنے کا کبھی اقرار نہیں کیا تھا، تو کیا اس کا جواب صحیح ہوگا؟ بیوی کہے گی کہ یہ عذر غلط ہے۔ جس دن تو نے میری حرمت پر آزادانہ تصرف کیا اور میں نے اپنا جسم تیرے سپرد کیا اسی دن تو نے ان ساری ذمہ داریوں کے لیے مجھ سے ایک "میثاق غلیظ" کیا ہے اور زبان خلق بیوی کو برحق اور شوہر کو لئیم اور کمینہ قرار دے گی۔ یہی سزا ایک قبیلہ اپنے بزدل اور حق ناشناس فرد کو دے گا۔ یہی سزا ایک میونسپلٹی اپنے نادہند شہری کو اور ایک حکومت اپنے نمک حرام باشندے کو دے گی اور تمام دنیا اس سزا کو بالکل جائز اور واجبی قرار دے گی۔ کیونکہ ہر حق کے ساتھ فرض کا لزوم اس قدر بدیہی ہے کہ آسمان کا سورج بھی اتنا بدیہی نہیں ہے۔"

یہاں تک کہ اسی استحقاق اور ذمہ داری کے فطری اور ہمہ گیر قانون کی بنا پر ہمارے گھر کی پلی ہوئی مرغی اور ہمارے تھان پر بندھے ہوئے گائے اور گھوڑے، ہمارے چمن میں اگے ہوئے پھول اور ہمارے باغ میں لگے ہوئے درخت کے بھی ہم پر حقوق ہیں، اور ہم نہایت لئیم آدمی ہوں گے اگر ان کا انکار کر دیں۔ ہم جب مرغی کے انڈے اور چوزے کھاتے ہیں لازم ہے کہ

بلیوں اور کتوں سے اس کی حفاظت کریں۔ ہم جس گائے کا دودھ پیتے ہیں اور جس گھوڑے پر سوار پر سوار ہوتے ہیں ہم پر حق ہے کہ ہم ان کے گھانس اور دانے کے کفیل ہوں، ہم جس پودے کے پھول سے معطر مشام اور جس درخت کے پھل سے لذت اندوز اور خوش کام ہوتے ہیں ہم پر واجب ہے کہ ان کو سینچیں، گوڑیں، کھادیں اور سردی کی آفتوں اور لو کی مصیبتوں سے بچائیں۔ ہم ان کے حقوق کا انکار نہیں کر سکتے۔ ہم نے جس دن ان کے وجود سے کسی قسم کی لذت و راحت حاصل کی اسی دن ان کے حقوق کا اقرار کیا ہے۔ یہ استحقاق اور ذمہ داری کا وہ عہد ہے جو ہر نافع اور منتفع میں از خود واقع ہو جاتا ہے اور انسان کی فطرت اور دنیا کے معروف میں اس سے زیادہ کوئی چیز اہم اور واجب الاحترام نہیں۔"

اب غور کرو کہ جب ہم کو ماں باپ کے حقوق سے انکار نہیں ہے تو ان سے کہیں بڑھ کر اس کا حق ہے جس نے ماں باپ کو بھی پیدا کیا۔ جب ہمارے لیے بیوی کے حقوق سے انکار کی گنجائش نہیں ہے تو اس کے حق سے کیسے انکار ممکن ہے جس نے مرد کو سکینت کے لیے عورت کو وجود بخشا۔ جب ہم خاندان اور قبیلہ، بادشاہ اور سلطنت کا حق مانتے ہیں اور اس کو ایک معاہدۂ عمرانی کا درجہ دیتے ہیں تو وہ جس نے خاندان و قبیلہ کو وجود بخشا، جس نے بادشاہ اور سلطنت کی شیرازہ بندی کے لیے انسانی فطرت کے اندر عصبیت کی چسپیدگی اور اجتماعیت پسندی کی پیوستگی بخشی، ان سے کہیں بڑھ کر اس بات کا حقدار ہے کہ ہم اس کے عہد ربوبیت کا اقرار کریں۔ جب ہم مرغی اور بلی تک کا حق مانتے ہیں اور گائے اور گھوڑے تک سے ایک خاموش معاہدۂ استحقاق و ذمہ داری کا اعتراف کرتے ہیں تو آخر اس کے عہد سے ہمیں کیوں انکار ہو جس

نے گائے، گھوڑے، دشت و چمن، دریا اور پہاڑ، سورج اور چاند، ہوا اور پانی، آگ اور مٹی سب کو وجود بخشا اور سب کو ہماری ہستی کے قیام کے لیے سازگار اور نفع رساں بنایا۔

اس تقریر سے یہ بات ثابت ہوئی کہ عدل انسان کی فطرت ہے اور اس فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اپنے منعم کے حقوق کا اقرار کرے اور منعم کا سب سے بڑا حق یہ ہے کہ اس کی شکر گزاری کی جائے اور اس شکر گزاری میں کسی اور کو شریک نہ کیا جائے۔ یہی حقیقت ہے جو بعض احادیث میں یوں وارد ہوئی ہے کہ بندہ پر خدا کا سب سے بڑا حق یہ ہے کہ کسی کو اس کا ساجھی نہ ٹھہرائے۔ یہی دلیل ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیان فرمائی ہے۔

| | |
|---|---|
| وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ إِبْرَاهِيمَ ۝ | اور سناؤ ان کو ابراہیم کی سرگزشت جب |
| إِذْ قَالَ لِأَبِيهِ وَقَوْمِهِ مَا | اس نے اپنے باپ سے اور اپنی قوم |
| تَعْبُدُونَ ۝ قَالُوا نَعْبُدُ أَصْنَامًا | سے کہا یہ تم لوگ کس چیز کی پوجا کر رہے |
| فَنَظَلُّ لَهَا عَاكِفِينَ ۝ قَالَ هَلْ | ہو؟ بولے ہم بتوں کو پوجتے ہیں اور برابر |
| يَسْمَعُونَكُمْ إِذْ تَدْعُونَ ۝ أَوْ | پوجتے رہیں گے۔ پوچھا کیا یہ سنتے ہیں جب تم |
| يَنْفَعُونَكُمْ أَوْ يَضُرُّونَ ۝ قَالُوا | ان کو پکارتے ہو؟ کیا یہ تم کو کوئی نفع یا |
| بَلْ وَجَدْنَا آبَاءَنَا كَذَٰلِكَ | نقصان پہنچاتے ہیں؟ بولے بلکہ ہم نے |
| يَفْعَلُونَ ۝ قَالَ أَفَرَأَيْتُمْ مَا | اپنے باپ دادا کو ایسے ہی کرتے پایا |
| كُنْتُمْ تَعْبُدُونَ ۝ أَنْتُمْ وَ | ہے کہا ذرا دیکھو تو ان کو جن کو تم |
| آبَاؤُكُمُ الْأَقْدَمُونَ ۝ فَإِنَّهُمْ | پوجتے رہے ہو، تم اور تمہارے اگلے |
| عَدُوٌّ لِي إِلَّا رَبَّ الْعَالَمِينَ ۝ | بزرگ۔ یہ تو سب میرے دشمن ہیں مگر |
| الَّذِي خَلَقَنِي فَهُوَ يَهْدِينِ ۝ | عالم کا رب جس نے مجھے پیدا کیا، پھر |

وَالَّذِیْ ھُوَ یُطْعِمُنِیْ وَیَسْقِیْنِ ۝ — ہدایت بخشتا ہے اور جو مجھے کھلاتا اور
وَاِذَا مَرِضْتُ فَھُوَ یَشْفِیْنِ ۝ — پلاتا ہے اور جب میں بیمار ہوتا ہوں
وَالَّذِیْ یُمِیْتُنِیْ ثُمَّ — تو مجھے صحت بخشتا ہے اور جو مجھے مارے گا
یُحْیِیْنِ وَالَّذِیْ اَطْمَعُ — پھر زندہ کرے گا اور جس سے مجھے
اَنْ یَّغْفِرَ لِیْ خَطِیْٓئَتِیْ — توقع ہے کہ جزا کے دن میرے گناہ
یَوْمَ الدِّیْنِ ۔ (شعراء ۶۹-۸۲) — بخشے گا۔

یعنی ایک منعم ہستی جس نے پیدا کیا اور پیدا کر کے یوں ہی چھوڑ نہیں دیا بلکہ ہم کو فطرت کی اور پھر الہام کی ہدایتیں بخشیں جس نے ہمیں کھلایا اور پلایا، جس نے ہمیں بیماری کے بعد صحت بخشی، جو ہمیں موت دیتی ہے اور پھر ہمارے اعمال کا بدلہ دینے کے لیے ہمیں زندہ کرے گی اور جس کے رحم و کرم سے توقع ہے کہ اس کا معاملہ آخرت میں بھی ہمارے ساتھ اچھا ہوگا، بلاشبہ اس بات کی مستحق ہے کہ اس کی بندگی کی جائے۔ اس کی شہادت اور دلیل ہمارے پاس موجود ہے۔ ہمارا فطری عدل تقاضا کرتا ہے کہ ہم منعم کے احسان کا حق اس کی شکرگزاری کی صورت میں ادا کریں اور اسی عدل ہی کا تقاضا ہے کہ جو حق اللہ تعالیٰ کا ہے بے دلیل اس میں دوسروں کو شریک نہ ٹھہرائیں۔ یہ حد درجہ کی ناانصافی اور نہایت کھلا ہوا ظلم عظیم ہے۔

**علم و یقین کی فطری طلب** انسانی فطرت کی دوسری نہایت اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس کو تاریکی کے مقابل میں روشنی، جہل کے مقابل میں علم اور حیرانی و سرگشتگی کے مقابل میں طمانیت اور شرح صدر بالطبع مرغوب ہے۔ انسان اس کو برداشت نہیں کر سکتا کہ اس کائنات کا اس کے سامنے کوئی حل نہ ہو۔ اس کے آغاز و انجام کے بارہ میں وہ بالکل اندھیرے میں ہو۔ وہ اپنی ہستی کی غایت

اور اس کے نیک و بد سے بالکل بے خبر ہو۔ کچھ نہ جانے کہ کہاں سے آیا ہے، کہاں جائے گا، اپنے ساتھ کیا معاملہ کرے اور دوسروں کے ساتھ کس طرح زندگی بسر کرے۔ اس کی فطرت کا تقاضا ہے کہ ان سارے سوالات پر غور کرے، ان کا حل تلاش کرے اور ہر ایک پر نفیاً یا اثباتاً کوئی حکم لگائے۔ وہ یہ تو کر سکتا ہے کہ کسی سوال کا کوئی غلط حل پیدا کر لے اور اسی پر جم جائے لیکن یہ نہیں کر سکتا کہ ان سوالات سے یکسر کوئی تعرض ہی نہ کرے۔ انسان کے لیے ظلمات میں بھٹکتے پھرنا بالکل ناممکن ہے۔

انسان کی یہی وہ فطری طلب ہے جس کی وجہ سے وہ جستجو کی مختلف وادیوں میں ٹھوکریں کھاتا رہا ہے اور بسا اوقات اس نے کوئی صحیح چیز نہ پا کر کسی غلط چیز ہی کو اختیار کر لیا ہے، لیکن یہ کبھی نہیں ہوا کہ وہ ان سوالات سے بالکل بے پروا ہو کر بیٹھ رہا ہو۔ یہ ایک فطری پیاس ہے جس کا بجھنا ضروری ہے اور جس چیز سے یہ پیاس ٹھیک ٹھیک بجھ جائے وہی اس کا صحیح جواب ہے۔ یہ پیاس صرف اللہ کے ایمان سے بجھتی ہے۔ اس کے سوا دوسری چیزیں صرف غیر فطری بہلاوے ہیں۔ جن سے طبیعت کو دھوکا تو دیا جا سکتا ہے، لیکن طمانیت نہیں حاصل کی جا سکتی۔ طمانیت صرف اللہ کو ماننے میں ہے اَلَا بِذِکْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ (آگاہ! صرف اللہ کی یاد ہی سے دلوں کو طمانیت حاصل ہوتی ہے) یہی وہ روشنی ہے جس کے چمکتے ہی یہ پوری کائنات اور اس کا سارا آغاز و انجام آشکارا ہو جاتا ہے۔ اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (اللہ آسمان و زمین کی روشنی ہے) اس کو پا لینے کے بعد انسان کے سارے سوالات حل ہو جاتے ہیں۔ اب وہ اس کائنات کے آغاز و انجام کا تصوّر کر سکتا ہے۔ اس وسیع کائنات میں اپنی ہستی کا مقام متعیّن کر سکتا ہے اور جان سکتا ہے کہ

اسے کیا کرنا چاہیے۔ اب اس کے لیے اخلاق کے اصول، معیشت کے ضابطے، سیاست کے آئین، سب طے ہو سکتے ہیں۔ اب وہ اپنے ماضی اور مستقبل دونوں کے بارہ میں علیٰ وجہ البصیرت ایک فیصلہ کر سکتا ہے۔ محض اٹکل کے تیر تکے نہیں چلائے گا۔ اب اسے اپنے عقل و حواس کی طرف سے بدگمانی بھی نہیں رہے گی اور اپنے آپ کو مایوسی اور حقارت کی نظر سے بھی نہیں دیکھے گا اور جس راہ میں جو قدم بھی رکھے گا وہ نہایت مضبوط اور محکم ہوگا۔

اس کے بعد اگر کوئی شخص اس حل کو اس وجہ سے نہیں قبول کرتا کہ ممکن ہے اس کے عقل و حواس اسے دھوکا دے رہے ہوں تو یہ نہایت بدترین قسم کی سوفسطائیت ہے۔ بے شبہ انسان کے حواس غلطی کر جاتے ہیں لیکن وہ غلطی ہی کرنے کے لیے نہیں بنے ہیں۔ بے شک ہماری عقل کبھی نتائج نکالنے میں چوک بھی جاتی ہے لیکن یقیناً وہ انسان کو فریب دینے پر نہیں مامور ہے۔ یہ صحیح ہے کہ انسانوں کی رایوں اور ان کے فیصلوں میں نہایت شدید اختلافات ہیں لیکن ان کے اندر اتفاق کے جو پہلو ہیں ان کو نظر انداز کر دینا بداہت کا انکار ہے۔ یہ ارتیابیت انسان کی فطرت کے بالکل خلاف ہے۔ یہ ایک مصنوعی حالت ہے جو تکلّف انسان نے اختیار کی ہے ورنہ اس کی زندگی کا ایک ایک فعل اس کے یقین کا شاہد ہے۔ وہ یقین پر مجبور ہے اور بغیر یقین کے ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتا۔ وہ ایک "لا ادری" کہنے میں اپنے متعدد یقینوں کا اعلان کرتا ہے اور اس کے تمام یقینوں میں سب سے بڑا یقین اس ہستی کا یقین ہے جس کی شہادت اسے اپنے اندر اور اپنے باہر سے مل رہی ہے اور جس کو مانے بغیر یہ تمام عالم بالکل ظلمات ہے۔ انسان کے لیے یہ ناممکن ہے کہ وہ تاریکی پر راضی ہو سکے الا آنکہ وہ اپنی فطرت کو

مسخ کر ڈالے۔ پس خدا کے وجود اور اس کے تمام صفات کمال سے متصف ہونے کی سب سے بڑی شہادت یہ ہے کہ اس کے بغیر اس کائنات کے معمہ کا اور خود اپنی ہستی کا انسان کو کوئی حل نہیں ملتا۔ صرف یہی ایک حل ہے جو تشفی بخش ہے، جس سے ساری گرہیں کھل جاتی ہیں۔ اس حل کی صحت اور صداقت کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ یہ قلب کی تشنگی کا صحیح ترجواب اور عقل کی جستجو کا اصل مطلوب ہے۔ اس کے لیے کسی اور عقلی و نقلی دلیل کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ دلیل وہاں کارگر ہوتی ہے جہاں دلیل اصل دعویٰ سے روشن ہو۔ یہاں خود دعویٰ اس قدر روشن ہے کہ کوئی دلیل اس سے زیادہ روشن نہیں۔

پس ایک خدا کو ماننا جو تمام کمال سے متصف ہے انسان کی فطرت ہے۔ یہ حق ہے۔ اس کے بعد اگر کسی نے کچھ اور خدا بنا لیے ہیں تو یہ ضلالت اور گمراہی ہے کیونکہ ایک خدا کو مان لینے کے بعد فطرت کا تقاضا پورا ہو جاتا ہے۔ اب اس سے کسی زائد شے کو ماننا ایک امر واقعی پر ایک بالکل غیر ضروری اضافہ ہے اور یہ کھلی ہوئی ضلالت ہے۔ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ إِلَّا الضَّلَالُ۔ اسی وجہ سے قرآن نے جگہ جگہ فرمایا ہے کہ جو لوگ خدا کے ساتھ کسی اور کو شریک کرتے ہیں ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔ یعنی ایک خدا کو ماننا تو اس لیے ضروری ہے کہ فطرتِ انسانی اس کے بغیر تشفی نہیں پا سکتی اور اس کی شہادت انسان کے اندر اور باہر موجود ہے لیکن اس کے ساتھ دوسروں کو خدائی میں شریک کرنا ایک بالکل بے ثبوت بات ہے۔

| | |
|---|---|
| فَتَعَالَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ، | پس اللہ بادشاہ حقیقی بلند و برتر |
| لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ، رَبُّ | ہے۔ نہیں کوئی معبود مگر وہ، باعظمت |
| الْعَرْشِ الْكَرِيمِ۔ وَمَنْ يَّدْعُ | عرش کا مالک ہے اور جو اللہ کے ساتھ |

| | |
|---|---|
| مَعَ اللّٰہِ اِلٰـہًا اٰخَرَ لَا بُرْھَانَ | کسی دوسرے معبود کو پکارے گا جس کے |
| لَـہٗ بِـہٖ فَاِنَّمَا حِسَابُہٗ عِنْدَ | لیے اس کے پاس کوئی دلیل نہیں تو |
| رَبِّہٖ اِنَّـہٗ لَا یُفْلِحُ الْکٰفِرُوْنَ | اس کا حساب اس کے رب کے پاس |
| (مومنون ۱۱۶-۱۱۷) | ہے۔کافر فلاح نہیں پائیں گے۔ |

یعنی ایک خدا کی شہادت تو انسان اپنے اندر اور باہر سے پا رہا ہے اس لیے اس کو ماننا عقل و فطرت کا تقاضا ہے لیکن اس کے علاوہ اگر کسی اور کو بھی وہ خدائی میں شریک ٹھہراتا ہے، جس کی کوئی دلیل نہیں ہے تو یہ انسان کی بدبختی ہے۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ ایک مشرک کے مقابلہ میں ایک موحد کا کام یہ نہیں ہے کہ وہ خدا کا اثبات کرے یا شرکاء کے ابطال پر دلائل قائم کرے کیونکہ مشرک ایک خدا کو تو بہرحال مانتا ہی ہے، یہ چیز تو مشرک و موحد کے درمیان مشترک ہے، باقی رہے شرکاء و انداد جو اس نے اپنے جی میں فرض کر رکھے ہیں تو پہلے ان کے ثبوت کے دلائل کی ضرورت ہے نہ کہ ان کی تردید کے دلائل کی۔ ان کی تردید کے لیے تو یہ دلیل کافی ہے کہ ان کا کوئی ثبوت موجود نہیں ہے۔

۴۔ فطرتِ انسانی کا علو | توحید کی ایک بہت بڑی نفسی دلیل فطرتِ انسانی کا علو ہے۔ انسان بالطبع ذلت و اطاعت اور بندگی و غلامی سے نفرت کرتا ہے اور سروری و سرفرازی کا خواہش مند ہے۔ وہ جس وقت اپنی قوتوں اور قابلیتوں کے کرشمے دیکھتا ہے تو محسوس کرتا ہے کہ اس پوری کائنات میں ایک وجود بھی نہیں ہے جو اس کی ہمسری کر سکے۔ اس احساس برتری کی ایک بہت بڑی نفسیاتی وجہ یہ ہے کہ وہ اشرف المخلوقات اور خدا کا خلیفہ ہے اور فطرتاً اس اشرفیت اور اس خلافت کا احساس لے کر اس دنیا میں آیا ہے اگر اس منصب کے لحاظ سے اس میں سربلندی و برتری کا احساس نہ ودلیت

کیا گیا ہوتا تو یقیناً وہ اس منصب کی ذمہ داریوں کو نہ سنبھال سکتا۔ یہ حقیقت نہایت عمدہ طریقہ پر اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَۃَ عَلَی السَّمٰوٰتِ الآیۃ میں بیان ہوئی ہے لیکن یہاں اس کی تفصیلات میں جانے کی گنجائش نہیں ہے۔ یہی احساس ہے جس کی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ انسان بسا اوقات خدائی کے دعوے کر بیٹھتا ہے کبھی اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی پکار اٹھتا ہے۔ کبھی اَنَا اُحْیٖ وَاُمِیْتُ (میں زندہ کرتا ہوں اور میں مارتا ہوں) کی رعونت کا اظہار کرتا ہے۔ کبھی اپنے آپ کو قوموں کی گردنوں کا مالک اور خشکی و تری کا سلطان سمجھنے لگتا ہے اور بندہ کی جگہ طاغوت بن کر خدا کی زمین میں اپنا قانون اور اپنا فرمان چلانے لگتا ہے لیکن اس احساس برتری کے ساتھ جب وہ دیکھتا ہے کہ اس کی یہ ساری قوتیں اور قابلیتیں بچپنے بڑھاپے، کی دو ناتوانیوں کے درمیان گھری ہوئی ہیں تو اُسے ناچار خدائی کا تخت چھوڑ کر بندگی کی صف میں آ کھڑا ہونا پڑتا ہے اور اپنی اس پیشانی کو جو کسی کے آگے جھکنا نہیں چاہتی، ایک ایسی طاقت کے آگے جھکانا پڑتا ہے جو تمام قوی اور قابلیتوں کا سرچشمہ اور تمام آسمان و زمین کی مالک و مدبر ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ فروتنی انسان اس لیے نہیں اختیار کرتا کہ اس میں بالطبع کہتری کا احساس یا کسی کو خدا بنانے کا شوق ہے۔ اس میں اس ولولہ تو خدا بننے کے لیے ہے لیکن جب وہ اپنے حوصلوں کی بلند پروازیوں کے ساتھ اپنی قوتوں اور قابلیتوں کی نارسائیوں کو دیکھتا ہے تو ناچار اسے ایک ان دیکھی ہستی کے سامنے اپنے تئیں ڈال دینا پڑتا ہے۔ ایسا کرنے پر انسان مضطر ہے۔ اگر وہ اس سے بچ سکتا تو یقیناً اس کی خواہش یہی ہوتی کہ وہ اس سے اپنے آپ کو بچا لے جائے۔ لیکن وہ مجبور ہے کہ ایک بالاتر ہستی کا اقرار کرے جس کی قدرتِ کاملہ سے یہ سارا کارخانہ وجود میں آیا اور جس کی

حکمت و تدبیر سے یہ سارا نظام چل رہا ہے۔ یہ کبر نفس اور علوء کا داعیہ انسان میں اتنا سخت و شدید ہے کہ لبا اوقات یہ کسی طرح بھی اعترافِ حق پر راضی نہیں ہوتا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ایک بادشاہ کا مناظرہ سورۂ بقرہ میں مذکور ہے جو مدعی تھا کہ "میں زندہ کرتا ہوں اور میں مارتا ہوں اس لیے میں ہی رب ہوں" حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ کہہ کر کہ "اللہ سورج کو مشرق سے طلوع کرتا ہے تم اسے مغرب سے طلوع کر دو" اس کے عجز کو بالکل بے نقاب کر دیا اور وہ اس معارضہ سے ہکا بکا ہو کے رہ گیا، لیکن کبر نفس کا شیطان اتنا سرکش ہے کہ لاجواب ہو کر بھی وہ خدا کے اقرار پر راضی نہ ہوا۔ لیکن جن کی عقل درست اور فطرت سلیم ہوتی ہے وہ اپنے علوء اور اپنے ضعف دونوں کے توازن کو قائم رکھتے ہیں۔ وہ ایک حکیم و مدبّر ہستی کے آگے جھک کے اپنے ضعف کی تلافی اور اپنی ناتوانی کا علاج پا لیتے ہیں اور ان کا قلب مطمئن ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد اگر کوئی شخص کسی اور آستانہ پر جھکتا ہے تو اس کی مثال اس دنی الطبع گداگر کی ہے جو ایک دروازہ سے اپنی تمام مایحتاج پا لینے کے باوجود در در صدائے سوال بلند کرتا پھرتا ہے اور اس کی طبیعت کی دناءت اس حد کو پہنچ گئی ہے کہ لبا اوقات اپنے سے زیادہ ذلیل و بے بس محتاجوں کے آگے ہاتھ پھیلا دینے میں بھی اس کو کوئی شرم نہیں لاحق ہوتی۔

ظاہر ہے کہ یہ حالت انسان کی اصلی فطرت نہیں بلکہ فطرت کا بگاڑ ہے۔ جس طرح گداگروں کی کثرت کے باوجود ہم یقین رکھتے ہیں کہ انسان کی اصلی فطرت خودداری اور عزتِ نفس ہے اسی طرح مشرکوں کی کثرت کے باوجود انسانی فطرت کا اصلی تقاضا توحید ہے۔ ایک عورت اپنے آپ کو ایک مرد کے حوالہ اس لیے کرتی ہے کہ وہ اپنے اندر ایک خلا محسوس کرتی

ہے جو ایک قوام کی قوامیت کے بغیر نہیں بھر سکتا۔ اب اگر کوئی عورت ایسی ہے جو اس خلا کو بھر لینے کے باوجود دوسروں سے آشنائی کرتی پھرتی ہے تو وہ چھنال ہے۔ جس نے اپنا جوہر عفت اور جمال غیرت بالکل کھو دیا ہے۔

پس جو شخص خدا کو مانتا ہے وہ اس لیے نہیں مانتا کہ اسے خدا بنانے کا شوق ہے بلکہ اس لیے مانتا ہے کہ اسے خدا کی احتیاج ہے۔ وہ تمام قوتوں اور قابلیتوں کے باوجود اپنے اندر ایک خلا محسوس کرتا ہے جو ایک خدا کو مانے بغیر نہیں بھر سکتا۔ اس کو مان لینے کے بعد وہ خلا پر ہو گیا اب اگر کوئی اس سے یہ کہتا ہے کہ اس ایک کے سوا کچھ اور بھی ہیں جو بندگی کے مستحق ہیں تو وہ تو یہ کہہ کر الگ ہو جائے گا کہ میرے لیے ایک خدا بس ہے۔ اگر تمھیں دوسرے آستانوں پر بھی پیشانی رگڑنے کی تمنّا ہے تو تم یہ ذلت گوارا کرو، مجھے اس سے معاف رکھو۔

تحمل اصحابی ولم یجد وا وجدی

وللناس اشجان ولی شجن وحدی

انسانی فطرت کی اسی بلندی کی طرف حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنی اس تقریر میں ارشاد فرمایا ہے جو انھوں نے اپنے قید خانہ کے ساتھیوں کے سامنے کی ہے۔

| | |
|---|---|
| وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِیْٓ | اور میں نے پیروی کی اپنے بزرگوں |
| اِبْرٰهِیْمَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ ط | ابراہیم، اسحٰق اور یعقوب کے مذہب |
| مَا كَانَ لَنَآ اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ | کی۔ ہمارے لیے زیبا نہیں کہ ہم اللہ کا |
| مِنْ شَیْءٍ ط ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ | کسی کو ساجھی ٹھہرائیں۔ یہ اللہ کا ہمارے |
| اللّٰهِ عَلَیْنَا وَعَلَى النَّاسِ | اوپر اور لوگوں پر احسان ہے لیکن |

| | |
|---|---|
| وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ۝ | اکثر لوگ اس کا شکر نہیں کرتے۔ |
| يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ | اے میرے قیدخانہ کے ساتھیو! کیا |
| مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ | بہت سے الگ الگ رب بہتر ہیں |
| الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ مَا تَعْبُدُوْنَ | یا ایک ہی اللہ جو سب کو قابو میں رکھنے |
| مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَآ | والا ہے۔ نہیں تم پوجتے ہو اس کے سوا |
| اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ | مگر کچھ ناموں کو جو تم نے اور تمھارے باپ |
| اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ اِنِ | دادا نے رکھ لیے ہیں۔ خدا نے ان کی |
| الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ اَمَرَ | کوئی دلیل نہیں اتاری ہے۔ نہیں ہے |
| اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ؕ | اختیار مگر اللہ کے ہاتھ میں اس نے حکم |
| ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ | دیا ہے کہ نہ بندگی کرو مگر اس کی۔ یہی |
| النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (یوسف ۳۸-۴۰) | فطری دین ہے مگر اکثر نہیں جانتے۔ |

اس تقریر کے ابتدائی حصّہ کی روح یہ ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا بڑا ہی فضل و کرم ہے کہ اس نے اپنے سوا کسی کی عبادت و بندگی کا حکم نہیں دیا اور انسان کے اندر برتری اور سربلندی کا جو احساس ودیعت فرمایا اس کی حرمت و عزت کا خود اس درجہ لحاظ فرمایا کہ غیر کے آگے جھکنے کی ذلت سے اس کو بچایا اور صرف اپنے ہی آگے جھکنے کا حکم دیا، لیکن انسان نے اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کا شکر ادا نہیں کیا اور بلا کسی سبب کے اس نے اپنی نفس کی حرمت کو بٹہ لگایا اور اپنے سے زیادہ حقیر و ذلیل مخلوقات کی پرستش کی۔ اس کے بعد فرمایا کہ خدا کو ماننا ایک ضرورت ہے اور انسان، اپنے نفس کے علوء کے باوجود، اس لیے خدا کو مانتا ہے کہ اس کے مانے بغیر اس کی فطرت کا خلا پُر نہیں ہوتا۔ اب سوال یہ ہے کہ بہتر کیا ہے؟ کیا یہ کہ بہت سے الگ الگ آقا اور رب ہوں اور ان سب کی غلامی کی جائے

یا یہ کہ صرف ایک ہی خدائے واحد و قہار کی اطاعت کی جائے۔ ظاہر ہے کہ خوددار انسان کے لیے ایک ہی رب کی غلامی بہت ہے۔ وہ بہت سے ارباب کیوں تراشے گا! رہی یہ بات کہ اسی ایک نے بعض دوسروں کی اطاعت کا بھی حکم دیا ہو تو اس کے لیے ثبوت کی ضرورت ہے اور اس کا کوئی ثبوت موجود نہیں ہے۔ اس کے بالکل برعکس اس کا حکم یہ ہے کہ تنہا اسی کی بندگی کی جائے اور یہی فطری دین ہے یعنی انسان کی فطرت بھی اس ایک کی شہادت اپنے اندر اور باہر پا رہی ہے، لیکن بہتوں نے اپنے اس فطری دین کو نہیں پہچانا اور شرک کی وادیوں میں بھٹک گئے۔

انسانی فطرت کے اسی علو کی بنا پر موحد و مشرک کی ایک تمثیل بھی بیان ہوئی ہے جس کا منشا یہ ہے کہ انسان بالطبع توحید کو پسند کرتا ہے نہ کہ شرک کو۔

| | |
|---|---|
| ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلًا | اللہ مثال بیان کرتا ہے ایک شخص |
| فِيهِ شُرَكَاءُ مُتَشَاكِسُونَ | (غلام) کی جس میں بہت سے جھگڑنے |
| وَرَجُلًا سَلَمًا لِّرَجُلٍ | والے آقا شریک ہیں اور ایک شخص (غلام) |
| هَلْ يَسْتَوِيَانِ مَثَلًا | کی جو سموچا ایک ہی شخص (آقا) کا ہے |
| اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ بَلْ اَكْثَرُهُمْ | کیا دونوں کی مثال ایک ہو سکتی ہے؟ |
| لَا يَعْلَمُونَ | شکر اللہ کے لیے۔ بلکہ اکثر ان میں سے |
| (زمر۔ ۲۹) | نہیں جانتے۔ |

یعنی بہت سے مختلف المزاج اور مختلف الاغراض آقاؤں کی غلامی کو اپنی پسند سے کون گوارا کر سکتا ہے؟ تو جب کوئی غلام اس ذلت پر راضی نہیں ہوتا، تو پھر انسان یہ کیوں گوارا کرتا ہے کہ ایک خدا کے ساتھ اپنے جی سے دوسرے بہت سے خداؤں کو شریک کر لیتا ہے؟ کیا ایک آقا کے غلام اور بہت سے آقاؤں کے غلام کا حال یکساں ہوگا؟ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ اس کے

بعد فطرتِ انسانی کی صدائے حال بتاتی کہ الحمد للہ۔ یعنی شکر کا سزاوار صرف اللہ ہی ہے۔ کوئی اور اس کے ساتھ شریک نہیں ہے۔

انسان کے اسی علوئے فطرت کو مخاطب کر کے سوال کیا گیا ہے۔

| | |
|---|---|
| أَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهُ | کیا اللہ اپنے بندہ کے لیے کافی نہیں ہے، |

یہی علوِ نفس ہے جس کو انسان شرک میں آلودہ ہوتے ہی کھو بیٹھتا ہے اور دفعتہً رفعت و عزت کے اس آسمان سے جس پر اللہ تعالیٰ نے اس کو سرفراز فرمایا ہے انتہائی ذلت کی پستی میں گر جاتا ہے۔ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَأَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَاءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ أَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ۔

اور دوسری جگہ اس سے زیادہ واضح لفظوں میں فرمایا۔

| | |
|---|---|
| أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ | کیا نہیں دیکھتے کہ اللہ ہی کے لیے سجدہ |
| لَهُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ | کرتے ہیں جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین |
| مَنْ فِي الْأَرْضِ وَالشَّمْسُ | میں ہیں اور سورج اور چاند اور ستارے |
| وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَ | اور پہاڑ اور درخت اور جانور اور |
| الْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَابُّ | بہتیرے انسانوں میں سے بھی اور بہت |
| وَكَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ وَكَثِيْرٌ | سے ایسے ہیں جن پر عذاب واجب |
| حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ وَ | ہو چکا ہے اور جن کو اللہ ذلیل کر دے |
| مَنْ يُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهُ | تو ان کو کوئی عزت دینے والا نہیں |
| مِنْ مُّكْرِمٍ إِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ | ہے اور بے شک اللہ کرتا ہے جو |
| مَا يَشَاءُ (الحج - ۱۸) | چاہتا ہے۔ |

اس آیت میں انسان کی جس ذلت کی طرف اشارہ ہے وہ یہ ہے کہ تمام اشیائے کائنات صرف اللہ واحد کو سجدہ کرتی ہیں اور باوجودیکہ اللہ تعالیٰ

نے ان ساری چیزوں کو انسان کی خدمت گزاری اور نفع رسانی میں سرگرم کر رکھا ہے لیکن ان میں سے کوئی چیز بھی یہ ننگ گوارا نہیں کرتی کہ انسان کی بندگی کرے۔ البتہ انسان ہے کہ ان ساری چیزوں پر فضیلت رکھنے اور ان کا مخدوم ہونے کے باوجود ان میں سے اکثر چیزوں کا پرستار بنا ہوا ہے۔

۴۔ انسان کا ضعف و افتقار | چوتھی چیز انسان کا ضعف و افتقار ہے ضعف و افتقار انسان کی صفت ذاتی ہے جو اس سے کبھی منفک نہیں ہوتی۔ بے شبہ انسان قوتوں اور قابلیتوں کا ایک بہت بڑا خزانہ اپنے اندر رکھتا ہے، وہ اپنی ان قوتوں کی بدولت زمین کے مدفون خزانے اگلوا لیتا ہے، فضاؤں میں اپنا تخت حکومت بچھاتا ہے۔ پہاڑوں کا سینہ چاک کر ڈالتا ہے، سمندروں پر اپنے جہاز دوڑاتا ہے۔ لیکن ان سب کے باوجود وہ اپنی ناتوانی کو جانتا ہے اسے معلوم ہے کہ وہ خود کچھ نہیں ہے کیونکہ وہ علانیہ دیکھتا ہے کہ جن قوتوں اور قابلیتوں کے ذریعہ سے وہ یہ سارے تصرفات کر رہا ہے ان میں سے کسی قابلیت کو بھی وہ وجود میں نہیں لایا ہے اور نہ جن چیزوں پر وہ تصرف کرتا ہے ان میں کسی چیز کو اس نے پیدا کیا ہے۔ یہ ساری چیزیں کسی اور ہی کی بخشی ہوئی ہیں اور اسی کے بنائے ہوئے قانون طبیعی کی پابند بھی ہیں۔ انسان کے اختیار میں جو کچھ ہے وہ بس اتنا ہے کہ کوشش کر کے ان کے قوانین کو سمجھے اور پھر ان کے قوانین کے مطابق ان سے کام لے اور فائدہ اٹھائے اور یہ تمتع بھی بس ایک مدت ہی تک ہے جس کے پورے ہو جانے کے بعد وہ لاکھ چاہے لیکن ان میں سے کسی چیز سے ایک پل کے لیے بھی کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتا یہ چیز انسان میں فطری طور پر ایک ان دیکھی ہستی کی احتیاج پیدا کرتی ہے جس نے اس کو اور ان ساری چیزوں کو وجود بخشا ہے اور جس کے جاری

کیے ہوئے قوانین کے مطابق یہ کارخانہ چل رہا ہے۔ انسان کا یہی ضعف و افتقار ہے جس کی وجہ سے فرمایا گیا ہے اَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ اِلَی اللّٰہِ اور دوسری جگہ فرمایا ہے واللہ الغنی وانتم الفقراء، اللہ بے نیاز ہے اور تم محتاج ہو۔

جو عاقل ہیں وہ زندگی کے ہر دور اور اس کے ہر تغیر میں اپنی احتیاج کو محسوس کرتے رہتے ہیں اور کبھی خدا سے مستغنی اور بے پروا نہیں ہوتے بلکہ ان پر نعمتوں کی فراوانی جس قدر بڑھتی جاتی ہے خدا سے ان کا تعلق اسی قدر بڑھتا جاتا ہے۔ اس کی بہترین مثال حضرت داؤد، حضرت سلیمان، ذوالقرنین اور فاروق اعظم ہیں لیکن جو کم ظرف اور بلید ہوتے ہیں وہ بسا اوقات اپنے اردگرد دولت کی فراوانی، خدم و حشم کی کثرت اور طاقت و قوت کے کرشمے دیکھ کر بے خود ہو جاتے ہیں اور اپنے آپ کو خدائی میں شریک سمجھنے لگتے ہیں۔ قرآن میں اس کی مثال کے لیے فرعون، ہامان، قارون اور ابولہب وغیرہ کے نام پیش کیے گئے ہیں جو اس عہد کے فرعونوں، ہامانوں، قارونوں اور بولہبوں کے ائمۂ ضلالت ہیں۔

جن لوگوں پر اس طرح کی خیرگی طاری ہوتی ہے ان کے لیے قرآن نے جگہ جگہ انسان کے فطری ضعف و افتقار کو مختلف تمثیلوں سے واضح فرمایا ہے کہ انسان کتنی ہی رعونت اور خدا سے غفلت و بے پروائی کا اظہار کرے لیکن اس کی زندگی میں بارہا ایسے حالات پیش آتے ہیں جو اس کی بے بسی اور ناتوانی کا راز کھول ہی دیتے ہیں اور اس وقت اس کے منہ سے وہ چیخ نکل ہی پڑتی ہے جو اس کی فطرت کی پکار ہے۔ اس حالت میں اس کے تمام شرکاء خواہ اپنی ذات ہو یا اس کے لاؤ لشکر یا اس کے غیبی شرکاء و انداد، سب اس کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں اور صرف ایک ہی ذات بچ رہتی ہے جس کا

دامن رحمت اس کو پناہ دیتا ہے۔ یہ دلیل قرآن مجید میں مختلف اسلوبوں سے بیان ہوئی ہے۔ ہم صرف چند مثالوں پر اکتفا کریں گے۔ فرمایا ہے۔

| | |
|---|---|
| قُلْ مَنْ یُّنَجِّیْکُمْ مِّنْ ظُلُمٰتِ | پوچھو کون تم کو نجات دیتا ہے خشکی |
| الْبَرِّ وَالْبَحْرِ تَدْعُوْنَهٗ | اور تری کی تاریکیوں سے تم اس کو |
| تَضَرُّعًا وَّخُفْیَةً لَئِنْ | پکارتے ہو گڑگڑاتے ہوئے اور |
| اَنْجٰىنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ | چپکے چپکے اگر اس نے ہم کو رہائی دی |
| مِنَ الشّٰكِرِیْنَ ۝ قُلِ | اس آفت سے تو ہم شکر گزاروں میں |
| اللّٰهُ یُنَجِّیْكُمْ مِّنْهَا وَ | سے نہیں گے۔ کہہ دو اللہ ہی ہے جو |
| مِنْ كُلِّ كَرْبٍ ثُمَّ | تم کو نجات دیتا ہے اس سے اور |
| اَنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ۔ | ہر مصیبت سے پھر تم اس کا ساجھی |
| (انعام ۶۳-۶۴) | ٹھہراتے ہو۔ |

| | |
|---|---|
| هُوَ الَّذِیْ یُسَیِّرُكُمْ فِی | وہی ہے جو تم کو چلاتا ہے خشکی اور |
| الْبَرِّ وَالْبَحْرِ حَتّٰۤى اِذَا | تری میں، یہاں تک کہ جب تم ہوتے |
| كُنْتُمْ فِی الْفُلْكِ وَجَرَیْنَ | ہو کشتی میں اور کشتیاں ان کو لے کر |
| بِهِمْ بِرِیْحٍ طَیِّبَةٍ وَّفَرِحُوْا | سازگار ہوا سے چلتی ہیں اور وہ مگن |
| بِهَا جَآءَتْهَا رِیْحٌ عَاصِفٌ | ہوتے ہیں، تند ہوا آتی ہے اور موجیں |
| وَّجَآءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ | ان پر ہر طرف سے گھیرے ڈالتی ہیں |
| مَكَانٍ وَّظَنُّوْۤا اَنَّهُمْ اُحِیْطَ بِهِمْ | اور وہ خیال کرنے لگتے ہیں کہ اب |
| دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ | ہلاک ہوئے پکارتے ہیں اللہ کو اسی |
| الدِّیْنَ لَئِنْ اَنْجَیْتَنَا مِنْ | کے لیے اطاعت کو خالص کرتے ہوئے |

هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ۝ فَلَمَّآ اَنْجٰهُمْ اِذَا هُمْ يَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ - (یونس ۲۲-۲۳)

کہ اگر تو نے ہم کو اس آفت سے نجات دی تو ہم شکر گزاروں میں سے ہوں گے پس جب ان کو نجات دے دی دفعتہ وہ زمین میں سرکشی کرنے لگے بلا کسی حق کے۔

سرکش انسان کی سرکشی اور اس کے تمرد و استکبار کی یہ کتنی سچی مثال ہے دنیا کے سمندر میں جب اس کی زندگی کی کشتی بغیر کسی رکاوٹ کے چلتی رہتی ہے وہ اپنی کشتی کے استحکام اور اپنے حسن انتظام پر مغرور رہتا ہے، اپنی تدبیر و دانش کو بڑی چیز سمجھتا ہے، اپنے سروسامان اور اپنے وسائل و ذرائع پر اتراتا ہے۔ اور خدا کی اطاعت و شکر گزاری سے باہر ہو کر بغیر کسی استحقاق کے اپنی خدائی کا اعلان کرتا ہے، غرور سے اکڑتا ہے، گھمنڈ سے اتراتا ہے، فخر کے نشہ سے بدمست ہو جاتا ہے، لیکن جب دفعتہ سازگار ہوا طوفانی بن جاتی ہے کشتی ڈانواڈول ہونے لگتی ہے اور موجوں کے تھپیڑے کشتی کو ایک پرکاہ اور اس کے سارے تدبیر و نظام کو بے حقیقت ثابت کر دیتے ہیں، اس کے منہ سے بے تحاشا چیخ نکل پڑتی ہے کہ اے خدا! اگر اس ورطۂ ہلاکت سے تو نے نجات بخشی تو اب کبھی تجھ سے غفلت نہ ہوگی، اب کبھی گھمنڈ نہ کروں گا، اور کبھی تیری خدائی میں ساجھی بننے کی جرأت نہ کروں گا، بلکہ تیرا شکر گزار بندہ بنوں گا اور تیری ہی اطاعت کروں گا، نہ اپنی اطاعت کروں گا نہ کسی اور کی لیکن جوں ہی اس آفت سے نجات پا جاتا ہے، پھر وہی غفلت اور سرمستی عود کر آتی ہے اور اپنے جس سروسامان اور جس گھمنڈ کو اس نے اتنا بے حقیقت پایا تھا ان ہی کے نشہ میں مخمور ہو کر پھر خدا کا باغی اور مشرک بن جاتا ہے ایسے لوگوں کو خدا نے ختار اور کفور، عہد شکن اور ناشکر گزار کہا ہے

کیونکہ فطرت کے جس عہد کو مصائب کے تازیانے آکر یاد دلاتے ہیں اور انسان اس کی تجدید کرتا ہے، حالات کے بدلتے ہی اس عہد کو توڑ کر پھر کفرانِ نعمت کی حالت اختیار کر لیتا ہے۔

اس تفصیل سے مقصود یہ دکھانا ہے کہ انسان کے اندر افتقار و احتیاج کا احساس بالکل فطری ہے اور یہ افتقار اسے دھکیل کر ایک ایسی ہستی کی طرف لے جاتا ہے جو اس کے لیے مامن و ملجا ہو۔ اگر انسان پر اس کا یہ افتقار آشکارا رہے تو وہ کبھی انانیت، خودسری، رعونت اور بغی و استکبار کے شرک میں مبتلا نہ ہو۔ لیکن وہ اکثر خدا کی نعمتیں پاکر اپنے ضعف و احتیاج کو بھول جاتا ہے۔ لیکن بس بھول جاتا ہے، اس کی فطرت بدل نہیں جاتی۔ چنانچہ جوں ہی اس پر کوئی ایسی مصیبت آتی ہے جو اس کے فریبِ اطمینان کی بنیادوں کو متزلزل کر دیتی ہے، اس کی دبی ہوئی فطرت پھر جاگ اٹھتی ہے اور وہ خدا کی طرف بھاگتا ہے اور اس کے سوا سب کو بھول جاتا ہے۔

سرکش سے سرکش انسانوں میں ہم اس فطرت کو جاگتے اور ابھرتے دیکھتے ہیں۔ مغرور سے مغرور انسان جو انما اوتیتہ علی علم (ہمیں جو کچھ ملا ہے اپنے سائنس کے زور سے ملا ہے) کے گھمنڈ میں خدا کو بھول گئے تھے، جنھوں نے بغیر کسی استحقاق کے خدا کی زمین میں اپنی خدائی کے علم گاڑ دیے تھے جن کو اپنی تدبیروں اور اپنے استحکامات پر اتنا ناز تھا کہ خدا کے نام پر ہنستے تھے، آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ ان کی تدبیروں کی ناکامی اور ان کے استحکامات کے بودے پن نے ان پر انسان کی بے بسی کا راز کھول دیا ہے اور وہ خدا کا نام لینے لگے ہیں ولعل اللہ یحدث بعد ذلک امرا۔

# توحید کے خصوصی دلائل

## دلائل بلحاظ مسلّمات مخاطب

اوپر کی دو فصلوں میں ہم نے الوہیت اور توحید کی وہ دلیلیں بیان کی ہیں جن کی حیثیت عام دلائل کی ہے۔ ان کی اساس اس کائنات کے نوامیس و سنن اور فطرت انسانی کے اذعانات و مسلمات پر ہے۔ اس وجہ سے، ہرچند ان کے مخاطب اول عرب ہیں، لیکن ان کی حجت تمام بنی آدم پر، بلا امتیاز عرب و عجم اور بلا لحاظ کافر و مومن، یکساں اور عام ہے۔ یہ صحیفۂ کائنات ہر شخص کے سامنے کھلا ہوا ہے اور فطرت کی شہادتیں بھی ہر قلب سلیم کے اندر سے بول رہی ہیں۔ صرف وہی لوگ ان حقائق کے انکار کی جرأت کر سکتے ہیں جنھوں نے اپنی آنکھیں پھوڑ لی ہوں اور اپنے کان بہرے کر لیے ہوں، ایسے لوگوں کو دنیا کی کوئی چیز بھی قائل نہیں کر سکتی۔ اب ہم ان دلائل کی توضیح کریں گے جن کی بنیاد مخالف کے اعترافات پر قائم ہے۔ ان کی حیثیت خصوصی دلائل کی ہے۔ یعنی مخاطب جن صحیح اصولوں کو تسلیم کرتا ہے قرآن نے ان کو اپنا لیا ہے اور ان کی اساس پر ان کے مقتضیات و لوازم کی تشریح کر کے، مخاطب سے ان کو تسلیم کرنے کا مطالبہ کیا ہے اور ساتھ ہی جو باتیں ان مسلمات سے متناقض ہیں ان کی نفی کا مطالبہ کیا ہے۔ استدلال کا یہ اسلوب بالکل عقلی و فطری ہے۔ اس پر یہ اعتراض کرنا کہ اس میں اساس استدلال بے ثبوت رہ گئی ہے بالکل

لغو بات ہے۔ استدلال کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ اس اصل کو بھی مدلل و مبرہن کرنے پر وقت ضائع کیا جائے جو حریف کے نزدیک مسلم ہے۔ انہی دلائل کی وجہ سے ہمارے بعض فلاسفہ و متکلمین کو یہ غلط فہمی ہو گئی کہ قرآن کے سارے دلائل الزامی قسم کے ہیں اور ایسے برہانیات سے قرآن بالکل خالی ہے جن کی حجت تمام انسانوں پر عام ہو سکے۔ یہ خیال قرآن سے بے خبری پر مبنی ہے۔ یہ تو قرآنی استدلال کی ایک خاص قسم ہے جس کی بنیاد ایک طرف مخاطب کے اعتراف پر ہے اور دوسری طرف ان برہانیات پر ہے جن کی شرح ہم پچھلی دو فصلوں میں کر آئے ہیں۔ اب ہم اس کی توضیح کی کوشش کریں گے۔

**۱۔ شرکاء کے لیے کوئی دلیل نہیں ہے** اس بات میں قرآن نے عربوں پر سب سے بڑی حجت یہ قائم کی ہے کہ جن کو تم خدا کا شریک ٹھہراتے ہو ان کے لیے تمہارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔ خدا کا سوال تو خارج از بحث ہے کیونکہ اُسے تو تم مانتے ہی ہو اور اس کی شہادت آفاق و انفس سے بھی مل رہی ہے، لیکن اس کے سوا جن کو تم نے خدائی میں شریک بنا رکھا ہے ان کی دلیل لانا تمہارا فرض ہے۔ بغیر دلیل کے کسی معمولی بات کو بھی ماننا انسان کی فطرت کے خلاف ہے چہ جائیکہ کسی کو خدا کا دست و بازو قرار دینا۔ پس اگر اس کی کوئی عقلی دلیل ہے تو اس کو پیش کرو اور اگر کوئی نقلی دلیل ہے تو اس کو سامنے لاؤ۔ رہی یہ بات کہ تم نے اپنے بزرگوں کو ان کی پرستش کرتے دیکھا ہے تو یہ کوئی سند نہیں ہے۔ اتنے بڑے دعوے کے ثبوت کے لیے مجرد یہ بات کافی نہیں ہو سکتی۔

| | |
|---|---|
| وَمَنْ يَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ | اور جو اللہ کے ساتھ کسی دوسرے |
| اِلٰهًا اٰخَرَ لَا بُرْهَانَ لَهٗ | معبود کو پکارتا ہے جس کی اس کے |
| بِهٖ فَاِنَّمَا حِسَابُهٗ | پاس کوئی دلیل نہیں ہے تو اس کا حساب |

| | |
|---|---|
| عِنْدَ رَبِّهٖ (مومنون) | اس کے رب کے پاس ہے۔ |
| مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ | تم نہیں پوجتے اس کے سوا مگر چند ناموں |
| اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ | کو جو تم نے اور تمھارے باپ دادا |
| وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ | نے ٹھہرا لیے ہیں۔ خدا نے ان کی کوئی |
| بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ (یوسف) | دلیل نہیں آتاری ہے۔ |
| اَمْ اَنْزَلْنَا عَلَيْهِمْ سُلْطٰنًا | کیا ہم نے کوئی دلیل آتاری ہے جو |
| فَهُوَ يَتَكَلَّمُ بِمَا كَانُوْا بِهٖ | شہادت دے رہی ہو ان چیزوں |
| يُشْرِكُوْنَ - (الروم) | کی جن کو وہ خدا کا ساجھی ٹھہراتے ہیں۔ |

اہل عرب اس کے جواب میں یہ کہتے کہ ہمارے بزرگوں نے جو شرک اختیار کیا وہ خدا کے حکم سے کیا اور یہی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعلیم ہے۔ قرآن نے اس کا جواب دیا کہ یہ اللہ تعالیٰ پر بہتان ہے۔ خدا نے کبھی شرک کا حکم نہیں دیا ہے۔ اگر تم اس دعوے میں سچے ہو تو اس سے پہلے کی کوئی کتاب لاؤ یا کوئی ایسی سند پیش کرو جس کی بنیاد علم پر ہو۔

| | |
|---|---|
| قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ | کہو ذرا دیکھو تو ان کو جن کو تم خدا |
| مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَرُوْنِيْ مَا | کے سوا پکارتے ہو، مجھے دکھاؤ کیا |
| ذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ | چیز ہے زمین کی جو انھوں نے بنائی |
| اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي | ہے یا کیا چیز ہے جس میں، آسمانوں |
| السَّمٰوٰتِ اِيْتُوْنِيْ بِكِتٰبٍ مِّنْ | میں ان کا ساجھا ہے، میرے پاس |
| قَبْلِ هٰذَآ اَوْ اَثٰرَةٍ مِّنْ | اس سے پہلے کی کوئی کتاب لاؤ یا |
| عِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ | کوئی اور علمی سند اگر تم اپنے دعوے |
| (الاحقاف - ۴) | میں سچے ہو۔ |

رہی یہ بات کہ یہ تمہارے باپ ابراہیمؑ کی تعلیم ہے تو یہ بھی بالکل جھوٹ اور افترا ہے۔ ابراہیمؑ کی زندگی کا ایک نمایاں کارنامہ تو ہجرت کا واقعہ ہے کہ انھوں نے اللہ واحد کے لیے اپنے خاندان و وطن سب کو چھوڑ دیا اور ہجرت کے وقت انھوں نے شرکاء و شفعاء سے جس طرح اپنی علیحدگی کا اعلان کیا اور برائت کا جو یادگار کلمہ کہا آج تک ان کی ذریت کی ایک شاخ بنی اسرائیل میں اس کی روایت موجود ہے جو ان کے تمام اخلاف کے لیے ہمیشہ نشان راہ کا کام دے سکتا ہے۔ سورۂ زخرف میں اس استدلال اور قرآن کے جواب کی پوری تفصیل موجود ہے۔

| | |
|---|---|
| وَقَالُوا لَوْ شَاءَ الرَّحْمٰنُ | اور کہتے ہیں اگر اللہ چاہتا ہم ان کو |
| مَا عَبَدْنٰهُمْ مَا لَهُمْ | نہ پوجتے۔ ان کو اس کا علم نہیں ہے |
| بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ إِنْ هُمْ | وہ محض اٹکل کے تیر چلا رہے ہیں۔ کیا |
| إِلَّا يَخْرُصُونَ ۔ أَمْ اٰتَيْنٰهُمْ | ہم نے اس سے پہلے ان کو کوئی کتاب |
| كِتٰبًا مِنْ قَبْلِهٖ فَهُمْ بِهٖ | دی ہے جس کی وہ اپنے پاس سند |
| مُسْتَمْسِكُونَ، بَلْ قَالُوْا | رکھتے ہیں، بلکہ وہ کہتے ہیں کہ ہم نے |
| إِنَّا وَجَدْنَا اٰبَاءَنَا | اپنے آباؤ اجداد کو ایک دھڑے پر |
| عَلٰى أُمَّةٍ وَإِنَّا عَلٰى اٰثٰرِهِمْ | پایا ہے اور ہم ان کے طریقہ پر راہ یاب |
| مُهْتَدُونَ وَكَذٰلِكَ | ہیں۔ اسی طرح ہم نے تم سے پہلے |
| مَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ | کسی بستی میں کوئی ہوشیار کرنے والا |
| فِيْ قَرْيَةٍ مِنْ نَذِيْرٍ | نہیں بھیجا مگر وہاں کے خوشحالوں نے کہا |
| إِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَا إِنَّا | کہ ہم نے اپنے بزرگوں کو ایک دھڑے |
| وَجَدْنَا اٰبَاءَنَا عَلٰى أُمَّةٍ | پر پایا ہے اور ہم ان ہی کے نقش قدم |

| | |
|---|---|
| وَاِنَّا عَلٰٓی اٰثٰرِھِمْ مُّقْتَدُوْنَ | کی پیروی کریں گے۔ کہا کیا اگرچہ میں تم |
| قٰلَ اَوَلَوْ جِئْتُکُمْ بِاَھْدٰی | سے زیادہ ہدایت کی چیز لے کر |
| مِمَّا وَجَدْتُّمْ عَلَیْہِ اٰبَآءَکُمْ | آیا ہوں جس پر تم نے اپنے بزرگوں |
| قَالُوْٓا اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ | کو پایا ہے، بولے جو تم دے کر |
| بِہٖ کٰفِرُوْنَ، فَانْتَقَمْنَا | بھیجے گئے ہو ہم اس کے منکر ہیں۔ |
| مِنْھُمْ فَانْظُرْ کَیْفَ کَانَ | پس ہم نے ان سے انتقام لیا، پس دیکھو |
| عَاقِبَۃُ الْمُکَذِّبِیْنَ | جھٹلانے والوں کا انجام کیسا ہوا اور |
| اِذْ قَالَ اِبْرٰھِیْمُ لِاَبِیْہِ | یاد کرو جب ابراہیم نے اپنے باپ |
| وَقَوْمِہٖٓ اِنَّنِیْ بَرَآءٌ | سے اور اپنی قوم سے کہا میں بری ہوں |
| مِّمَّا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا الَّذِیْ | ان چیزوں سے جن کو تم پوجتے ہو مگر |
| فَطَرَنِیْ فَاِنَّہٗ سَیَھْدِیْنِ | اس سے جس نے مجھے پیدا کیا۔ پس وہ |
| وَجَعَلَھَا کَلِمَۃً | میری رہبری فرمائے گا اور ہم نے اس |
| بَاقِیَۃً فِیْ عَقِبِہٖ لَعَلَّھُمْ | اعلان برأت کو ایک یادگار کلمہ بنایا |
| یَرْجِعُوْنَ ۔(۲۰-۲۸) | اس کی ذریت میں تاکہ وہ رجوع کریں۔ |

ان آیات کے مطالب کا تجزیہ کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اہل عرب شرک کی حمایت میں جو روایات پیش کرتے تھے وہ بالکل بے بنیاد اور بے سروپا تھیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی کی مدون سرگزشت جس کو ایک علمی سند کی حیثیت دی جا سکتی تھی اور جو بنی اسرائیل کے صحیفوں میں موجود تھی، عربوں کے ان من گھڑت فسانوں کی تردید کے لیے بالکل کافی تھی۔ خصوصیت کے ساتھ ان کی ہجرت کا واقعہ توحید و اخلاص کا ایک یادگار کارنامہ تھا۔ لیکن کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ ذریت ابراہیم کی دونوں شاخوں میں سے کسی نے بھی

اس کلمہ باقیہ کی روح نہیں پہچانی۔ یہود اس نشانِ راہ کے باوجود بارہا بھٹکے اور بالآخر توحید کے صراطِ مستقیم سے وہ اس قدر دور ہو گئے کہ ان کے لیے اس کی طرف لوٹنا ناممکن ہو گیا اور اللہ تعالیٰ نے ان پر لعنت کر دی اور عربوں نے تو اپنی روایات کے دفتر سے سرے سے یہ سرگزشت ہی گم کر دی اور اس کے بالکل برعکس ایسی روایات گھڑ کے کھڑی کر دیں جن سے دین بت پرستی کی تائید نکلے۔

عربوں کے ان اوہام کی تردید میں قرآن نے جگہ جگہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مختلف واقعات زندگی کا، نیز خانہ کعبہ کی تعمیر اور مقصدِ تعمیر کی ابتدائی تاریخ کا اور تمام انبیاء کرام کی دعوت کے مشترک مقصود کا حوالہ دیا ہے کہ ان میں سے کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جس سے تمہارے اس دعوے کی تائید نکلتی ہو کہ خدا نے شرک و بت پرستی کا حکم دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے احکام کو جاننے کا ذریعہ انبیاء ہیں اور انبیاء کی دعوتیں اگلے صحیفوں میں موجود ہیں۔ ان میں سے کسی کی دعوت کو بھی تم شرک کی حمایت میں نہیں پیش کر سکتے۔ انبیاء کی تاریخ کا مدون سرمایہ قرآن کے دعوے کی تصدیق کر رہا ہے اور جہاں کہیں اس تاریخ میں کوئی بات ملائی گئی ہے اس کی تردید خود اسی کے اندر موجود ہے۔

۲۔ لوازم سے استدلال | قرآن کے استدلال خصوصی کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اہلِ عرب خدا کی جن صفتوں کو تسلیم کرتے تھے قرآن نے ان کے لوازم کو بھی تسلیم کرنے کا مطالبہ کیا۔ یہ لوازم دو طرح کے ہیں۔ ایک وہ صفات جو ان مانی ہوئی صفات سے متفرع ہوتی ہیں، نیز ان صفات کی نفی جن سے مانی ہوئی صفات کی نفی لازم آتی ہے۔ دوسرے وہ حقوق و فرائض جو ان صفات کے اقرار سے لازمی نتیجہ کے طور پر اقرار کرنے والے پر عائد ہوتے ہیں۔ اسی طرح ان اعمال و عقائد کی نفی جن سے خدا کے مسلمہ حقوق کی نفی لازم آتی ہے۔

اہل عرب کے متعلق یہ بات معلوم ہے کہ وہ نہ صرف خدا کے وجود کے قائل تھے بلکہ آسمانوں اور زمین کا خالق، روزی رساں، قویٰ اور قابلیتوں کا بخشنے والا، موت اور زندگی کا مالک اور مدبّر امر خدا ہی کو مانتے تھے، لیکن رب یعنی مالک و حاکم خدا کے سوا اوروں کو بھی قرار دیتے تھے۔ قرآن نے ان سے مطالبہ کیا کہ جس کے لیے یہ ساری صفتیں تسلیم کرتے ہو لازم ہے کہ رب بھی اسی کو مانو۔

| | |
|---|---|
| فَذٰلِکُمُ اللّٰہُ رَبُّکُمُ الْحَقُّ | پس وہی اللہ تمہارا حقیقی رب بھی |
| فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ اِلَّا | ہے۔ پس حق کے بعد نہیں ہے مگر |
| الضَّلٰلُ فَاَنّٰی تُصْرَفُوْنَ (یونس ـ ۳۲) | گمراہی۔ تو کہاں بھٹکے جاتے ہو۔ |

یعنی یہ ساری باتیں مان لینے کے بعد تو یہ لازم ہے کہ مالک و حاکم اور آمر و ناہی اسی کو مانو۔ اس حق کے بعد، جو ثابت ہے، اگر کسی اور کو بھی مانتے ہو جس کا کوئی ثبوت نہیں ہے تو یہ بھی ضلالت و گمراہی ہے۔ چنانچہ سورۂ اعراف میں فرمایا کہ جس کو خالق ارض و سما مانتے ہو لازم ہے کہ اسی کو رب بھی مانو۔ اس کے سوا کسی اور کو مالک و حاکم نہ بناؤ۔ جو خالق ہے امر و حکم کا حق اسی کو پہنچتا ہے۔

| | |
|---|---|
| اِنَّ رَبَّکُمُ اللّٰہُ الَّذِیْ | بے شک تمہارا مالک وہ اللہ ہے |
| خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ | جس نے آسمانوں اور زمین کو بنایا |
| ...... اَلَا لَہُ الْخَلْقُ | ...... آگاہ اسی کے لیے خلق اور |
| وَالْاَمْرُ | امر ہے۔ |

جس اللہ کو آسمان و زمین کا خالق مانتے ہو اسی کو رب بھی مانو۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ خالق کوئی ہو اور رب کوئی بن جائے۔ جس نے خلق کیا ہے امر اسی کا حق ہے۔ جب ایک جزیرہ کا انکشاف کرنے والا اور ایک چیز کا ایجاد کرنے والا محض اپنے کشف و ایجاد کی بدولت یہ حق رکھتا ہے کہ اس کی ملکیت اور اس پر

تصرف کا حق اسے حاصل ہو تو خدا کے اس حق سے کیوں انکار کرتے ہو درآنحالیکہ اس کا حق کشف وایجاد سے بدرجہا زیادہ ہے!

اسی طرح خالق کے لیے صفت علم کو لازم قرار دیا۔ یعنی جس ذات کو آسمان و زمین کا خالق مانتے ہو لازم ہے کہ اس کے علم کو محیط کل مانو۔ اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ (کیا وہ نہیں جانے گا جس نے خلق کیا)

اسی طرح یہ لازم ہے کہ جس خدا کو خلق و تدبیر پر قادر مانا ہے، تمام نفع و ضرر اسی کے اختیار میں تسلیم کیا جائے۔ وَاِنْ یَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗ اِلَّا هُوَ، وَاِنْ یَّمْسَسْكَ بِخَیْرٍ فَهُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (اور اگر تم کو اللہ کسی نقصان میں پکڑے تو اس کو نہیں دور کر سکتا مگر وہی اور اگر تم کو کوئی بھلائی پہنچائے تو وہ ہر چیز پر قادر ہے)

اسی طرح تفصیل کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو ان صفات سے بری قرار دیا گیا جو الوہیت کے منافی ہیں یا جن کو تسلیم کرنے سے ان صفات کی نفی لازم آتی تھی جن کو اہل عرب خدا کے لیے تسلیم کرتے تھے۔ یہ باب نہایت وسیع ہے اور اس پر ایک حد تک ہم رسالہ حقیقت شرک میں بحث کر چکے ہیں۔ یہاں صرف اشارہ پر اکتفا کرتے ہیں۔

اس سلسلہ میں اصولی بات یہ فرمائی کہ اللہ تعالیٰ کے لیے صرف اچھی صفتیں سزاوار ہیں۔ کوئی بری صفت الوہیت کے تصور کے منافی ہے۔ اس کائنات کا معمہ حل ہی ایک ایسی ذات کو ماننے سے ہوتا ہے جو تمام صفات جمال و کمال کی جامع ہے۔ اگر اس کے ساتھ کوئی ایسی صفت لگا دی جائے جو جمال و کمال کے منافی ہو تو یہ حل شدہ معمہ پھر معمہ بن کے رہ جاتا ہے اور اس کائنات پر وہی ظلمت پھر طاری ہو جاتی ہے۔ جس سے خدا کے صحیح تصور نے نکالا تھا۔

| | |
|---|---|
| وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی | اور اللہ کے لیے اچھی ہی صفتیں ہیں |
| فَادْعُوْهُ بِهَا وَذَرُوا | تو انھیں صفتوں سے اسے پکارو اور |
| الَّذِیْنَ یُلْحِدُوْنَ فِیْٓ | ان لوگوں کو چھوڑ دو جو اس کی صفات |
| اَسْمَآئِهٖ سَیُجْزَوْنَ مَا كَانُوْا | کے باب میں کج روی اختیار کرتے ہیں |
| یَعْمَلُوْنَ (الاعراف - ۱۸۰) | وہ اپنے کیے کا بدلہ پائیں گے |

اس ذیل میں سب سے زیادہ اہمیت شرکاء و شفعاء کے اعتقاد کو حاصل ہے اس عقیدہ سے خدا کی تمام اصولی صفات کی نفی ہو جاتی ہے۔ قرآن نے ان کے ان نقصانات کو نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ مثلاً یہ کہ شفعاء کو ذریعۂ تقرب بنانے سے لازم آتا ہے کہ خدا کا علم محیط نہیں ہے کیونکہ اگر اس کا علم محیط ہے تو یہ شفعاء اس کے علم میں کیا اضافہ کریں گے؟ اور اگر وہ اپنے علم کے خلاف محض ان کی سفارش کی بنا پر، لوگوں کو نیکوکار اور بدکار ٹھہرائے گا تو اس سے اس کے عدل و حکمت کی نفی لازم آتی ہے۔ اگر یہ خیال ہے کہ اس کی عنایت حاصل کرنے کے لیے تنہا عمل و اطاعت کافی نہیں ہے بلکہ کسی کا وسیلہ بھی ناگزیر ہے تو اس سے ہر بندہ کے ساتھ اس کی قربت، اس کی رحمت عام، اور اس کے غفور و کریم ہونے کی نفی ہوتی ہے اور یہ ایک بدترین سوءظن ہے جس میں ایک بندہ اپنے پروردگار کے متعلق مبتلا ہو سکتا ہے۔

علیٰ ہذا القیاس کسی کو خدائی کے انتظام میں ساجھی ٹھہرانا یا تو خدا کے کمال قدرت کی نفی ہے یا کمالِ غیرت کی کیونکہ کسی اور کی حصہ داری وہی خدا گوارا کر سکتا ہے جس کے لیے آسمان و زمین کا سنبھالنا مشکل ہو۔ یا پھر وہ بے غیرت ہو کہ اسے اپنے حدود و حقوق میں دوسروں کی مداخلت سے کوئی ننگ نہ لاحق ہو اور الوہیت کا تصور ان تمام عیوب و نقائص سے بالکل پاک ہے۔ قرآن نے جگہ جگہ عربوں کو ان

تناقضات کی طرف توجہ دلائی ہے اور ان سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے لیے کوئی ایسی صفت نہ مانیں جو خدائی کے برتر مفہوم سے بے جوڑ یا جس سے ان صفات کی نفی لازم آتی ہے جن کو وہ تسلیم کر چکے ہیں۔

قرآن مجید میں یہ الزامی اور تنزیہی پہلو بالکل ساتھ ساتھ نمایاں ہوتے ہیں اور انداز کلام عموماً مجادلہ کا نہیں بلکہ ایک مسلمہ حقیقت کے بیان کا ہوتا ہے کیونکہ ایک امر کے اقرار کے ساتھ اس کے لوازم کا اقرار اور اس کے اضداد کا انکار ایک امر بدیہی ہے جس سے صرف وہی لوگ گریز کر سکتے ہیں جو ہٹ دھرم ہوں۔

مندرجہ ذیل آیات پر مذکورہ بالا پہلو سے غور کرنا چاہیے۔

| | |
|---|---|
| وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا | اور وہ کہتے ہیں خدا کے بیٹے بیٹیاں |
| سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ لَّهٗ مَا | ہیں۔ وہ پاک ہے، بلکہ اسی کے لیے |
| فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ | ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے |
| كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ہ بَدِيْعُ | سب اسی کے فرمانبردار ہیں، موجد ہے |
| السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاِذَا | آسمانوں اور زمین کا اور جب کسی |
| قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ | امر کا فیصلہ کرتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ |
| كُنْ فَيَكُوْنُ (بقرہ-۱۱۵) | ہو جا پس وہ ہو جاتی ہے۔ |

یہاں "سُبْحٰنَهٗ" (وہ پاک ہے) کا لفظ ایک دلیل کے طور پر آیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا کے لیے اولاد کا تصور الوہیت کے تصور کے منافی ہے۔ الوہیت کا تصور مقتضی ہے کہ وہ ہر طرح کی احتیاج اور ہر قسم کے کفو و برادری کی نسبت سے ارفع و منزہ ہو۔ وہ آسمان و زمین کا موجد ہو، ان کو عدم سے وجود میں لایا ہو، اور اس کی قدرت کاملہ کا یہ حال ہو کہ جب چاہے مجرد اپنے حکم سے جس چیز کو چاہے وجود میں لاوے۔ ایک ایسی ہی ذات خدا ہو سکتی ہے اور تم کو

خدا کے لیے ان صفات سے انکار نہیں ہے۔ لیکن ان کے ساتھ تم بعض ایسی صفتیں بھی مان لیتے ہو جو ان سے بالکل متناقض ہیں، جو نہ تو مفہوم الوہیت کے شایانِ شان ہیں اور نہ تمہاری مانی ہوئی صفتوں کے ساتھ وہ کوئی مطابقت رکھتی ہیں۔

دوسری جگہ فرمایا ہے:-

| | |
|---|---|
| قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا | کہتے ہیں اللہ کے اولاد ہے۔ وہ پاک |
| سُبْحٰنَهٗ هُوَ الْغَنِیُّ لَهٗ | ہے، وہ مستغنی ہے، اسی کے اختیار |
| مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ | میں ہے۔ جو کچھ آسمانوں میں ہے اور |
| اِنْ عِنْدَكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ | جو کچھ زمین میں ہے، نہیں ہے تمہارے |
| بِهٰذَا (یونس - ۶۸) | پاس اس کی کوئی دلیل۔ |

ایک جگہ اوثان و اصنام کے ضعف و بے چارگی کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ الوہیت کے تصور کی یہ انتہائی تحقیر ہے کہ ایسے بے بس وجودوں کو اس خدا کا دست و بازو قرار دو جس کو قوی و عزیز مانتے ہو اور جس کی قوت و عزت کی سب سے بڑی شہادت یہ کائنات ہے۔

| | |
|---|---|
| یٰاَیُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ | اے لوگو، ایک مثل بیان کی جاتی ہے |
| فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ ؕ اِنَّ الَّذِیْنَ | اس کو غور سے سنو، خدا کے سوا جن |
| تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ | کو تم پکارتے ہو وہ ایک مکھی بھی نہیں |
| لَنْ یَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّ | بنا سکتے اگرچہ سب اس کے لیے اکٹھے |
| لَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ ؕ وَاِنْ یَّسْلُبْهُمُ | ہو جائیں اور اگر مکھی ان سے کوئی |
| الذُّبَابُ شَیْـًٔا لَّا یَسْتَنْقِذُوْهُ | چیز چھین لے جائے تو اس سے اس |
| مِنْهُ ؕ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَ | کو واپس نہیں لے سکتے، طالب اور |
| الْمَطْلُوْبُ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ | مطلوب دونوں ناتواں! انھوں نے |

قَدْرِهٖ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِیٌّ عَزِیْزٌ۔ (الحج ۲۲-۷۴)

اللہ کی حقیقی قدر نہیں پہچانی۔ بے شک اللہ قوت والا اور غالب ہے۔

ایک جامع مثال ملاحظہ ہو جس میں توحید کی مختلف الزامی، تنزیہی، آفاقی اور نفسی دلیلیں ایک ہی سلسلہ میں بیان ہوئی ہیں۔

وَالَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِیَآءَ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِیُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ؕ اِنَّ اللّٰهَ یَحْكُمُ بَیْنَهُمْ فِیْ مَا هُمْ فِیْهِ یَخْتَلِفُوْنَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِیْ مَنْ هُوَ كٰذِبٌ كَفَّارٌ ۔ لَوْ اَرَادَ اللّٰهُ اَنْ یَّتَّخِذَ وَلَدًا لَّاصْطَفٰى مِمَّا یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ هُوَ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ۔ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ۚ یُكَوِّرُ الَّیْلَ عَلَى النَّهَارِ وَیُكَوِّرُ النَّهَارَ عَلَى الَّیْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؕ كُلٌّ یَّجْرِیْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ اَلَا هُوَ الْعَزِیْزُ الْغَفَّارُ ۔

اور جن لوگوں نے اللہ کے سوا مددگار بنا لیے ہیں، کہتے ہیں ہم ان کو نہیں پوجتے ہیں مگر اس لیے کہ یہ ہمیں اللہ سے قریب کر دیں۔ اللہ ان کے درمیان فیصلہ کرے گا اس چیز کے بارے میں جس میں وہ جھگڑ رہے ہیں۔ اللہ نہیں راہ یاب کرے گا ان کو جو جھوٹے اور ناشکرے ہیں۔ اگر اللہ چاہتا کہ اپنے لیے اولاد بنائے تو اپنی مخلوق میں سے منتخب کر لیتا جو چاہتا۔ وہ پاک ہے، وہ تو ایک ہی اللہ ہے سب کو قابو میں رکھنے والا۔ اس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے غایت کے ساتھ، ڈھانکتا ہے رات کو دن پر اور دن کو رات پر اور سورج اور چاند کو مسخر کیا ہے۔ ہر ایک متعین وقت کے لیے چلتا ہے، آگاہ! وہ غالب اور بخشنے والا ہے۔

| | |
|---|---|
| خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ | تم کو پیدا کیا ایک جان سے پھر |
| ثُمَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا | اس کی جنس سے بنائی اس کی جورو |
| وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ | اور اتاریں تمھارے لیے چوپایوں میں |
| ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ يَخْلُقُكُمْ | سے آٹھ قسمیں۔ پیدا کرتا ہے تم کو |
| فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ خَلْقًا مِّنْ | تمھاری ماؤں کے پیٹوں میں، خلقت کے |
| بَعْدِ خَلْقٍ، فِيْ ظُلُمٰتٍ | بعد خلقت، تین پردوں کے اندر، وہی |
| ثَلٰثٍ، ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ | اللہ تمھارا رب ہے، اسی کے لیے بادشاہی |
| لَهُ الْمُلْكُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا | ہے۔ نہیں ہے کوئی معبود مگر وہ۔ تو کہاں |
| هُوَ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ ۝ اِنْ | بھٹک جاتے ہو، اگر تم ناشکری کروگے |
| تَكْفُرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ | تو اللہ تم سے بے پرواہ ہے اور وہ |
| عَنْكُمْ وَلَا يَرْضٰى لِعِبَادِهِ | اپنے بندوں کے لیے ناشکری کو پسند |
| الْكُفْرَ وَاِنْ تَشْكُرُوْا يَرْضَهُ | نہیں کرے گا اور اگر شکر کروگے تو اس |
| لَكُمْ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ | کو پسند کرے گا اور نہیں اٹھائے گی کوئی |
| اُخْرٰى ۝ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ | جان کسی دوسری جان کا بوجھ۔ پھر |
| مَّرْجِعُكُمْ فَيُنَبِّئُكُمْ | تمھارے رب کی طرف تمھارا لوٹنا ہے تو |
| بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ط | تم کو خبر دے گا تمھارے کیے کی، وہ سینوں |
| اِنَّهُ عَلِيْمٌ بِذَاتِ | کے بھیدوں کو جاننے والا ہے اور جب |
| الصُّدُوْرِ ۝ وَاِذَا مَسَّ | انسان کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے وہ اپنے |
| الْاِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَا | پروردگار کو پکارتا ہے، اس کی طرف |
| رَبَّهُ مُنِيْبًا اِلَيْهِ مِنْ | متوجہ ہوکر، پھر جب اس کو بخش دیتا |
| قَبْلُ وَجَعَلَ لِلّٰهِ | ہے اپنی طرف سے نعمت وہ بھول |

| | |
|---|---|
| اَنْدَادًا لِّيُضِلَّ عَنْ | جاتا ہے اس کو جس کی طرف بلا رہا تھا اس |
| سَبِيْلِهٖ قُلْ تَمَتَّعْ | سے پہلے اور اللہ کا شریک بنالیتا ہے تاکہ |
| بِكُفْرِكَ قَلِيْلًا اِنَّكَ مِنْ | اس کے رستے سے گمراہ کرے۔ کہہ دو اپنے |
| اَصْحٰبِ النَّارِ۔ | کفر کے باوجود تھوڑا سا متمتع ہو لے تو جہنم |
| (زمر ۳-۸) | والوں میں سے ہے۔ |

جو شخص ان آیات پر غور و تدبر کرے گا اس کے سامنے بالتدریج توحید کے اثبات اور شرک کی نفی کے مندرجہ ذیل پہلو آئیں گے۔

(ا) جو لوگ کسی کو خدا کا شریک ٹھہراتے ہیں وہ جھوٹے اور ناشکرے ہیں۔ ان کے پاس اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ خدا نے کسی کو اپنا شریک بنایا ہے۔ اگر ہے تو اس کو پیش کریں۔ اس دلیل کی تفصیل فصل کے شروع میں گزر چکی ہے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔

(ب) یہ خیال کہ خدا کی بیٹیاں ہیں، جو اس کے ہاں سفارشی ہوں گی، بالکل باطل ہے۔ خدا کے لیے اولاد کا تصور ہی سرے سے غلط ہے۔ خدا کو واحد و قہار (قابو CONTROL میں رکھنے والا) ہونا چاہیے۔ وہ ہر قسم کے احتیاج سے بالاتر ہے۔ اس کو بیٹوں اور بیٹیوں کی کیا ضرورت۔ پھر ستم یہ ہے کہ اہل عرب خدا کے لیے بیٹیاں مانتے تھے حالانکہ خود بیٹیوں سے سخت نفرت کرتے تھے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ دوہری غلطی کر رہے تھے۔ ایک یہ کہ خدا کے لیے اولاد تسلیم کر رہے تھے۔ دوسری یہ کہ اولاد میں سے بھی خدا کے حصہ میں وہ اولاد دیتے تھے جس سے خود نفرت کرتے تھے۔

(ج) عالم کی خلقت عبث نہیں ہوئی ہے بلکہ ایک غایت کے ساتھ ہوئی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ جزاء کا ایک دن ضرور آنے والا ہے اور عدل کامل کا ظہور

یقینی ہے۔ اس تصور کے ساتھ شفاعت، کا تصور نہیں جمع ہو سکتا کیونکہ شفاعت کا تصور عالم کے بامقصد ہونے کی نفی کر دیتا ہے۔ شفاعت عدل کی نفی ہے۔

(د) اس کے بعد دلیل توافق اور دلیل تسخیر (جو اوپر بیان ہو چکی ہے) سے یہ نتیجہ نکالا کہ اس کائنات کا خالق عزیز و غفار ہے۔ 'عزیز' یعنی سب پر غالب اور سب کی رسائی سے بالاتر۔ کوئی نہیں ہے جو اس کے اذن کے بغیر اس کے ہاں ایک لفظ بول سکے۔ 'غفار' یعنی بخشنے والا اور گناہوں پر پردہ ڈالنے والا۔ اس لیے اس کے ہاں کسی سفارشی کی ضرورت نہیں ہے۔ آدمی کا اپنا عمل خود سفارشی ہے۔

(ہ) اس کے بعد خلقت اور ربوبیت کے دلائل سے اپنے علم کے احاطہ پر استدلال کیا اور پھر نتیجہ نکالا کہ جس نے پیدا کیا، جس نے پرورش کے وسائل مہیا کیے، جو ماؤں کے پیٹوں کے اندر، تہ بہ تہ پردوں کے پیچھے اپنی کاریگری کے کرشمے دکھاتا ہے وہ خدا مستحق ہے اس بات کا کہ اس کو رب مانو۔ اسی کے ہاتھ میں آسمان اور زمین کی بادشاہی ہے۔ نہ اس کا کوئی شریک ہے۔ نہ ہونا چاہیے۔

(و) اس کے بعد قانونِ عدل بیان کر کے شفاعت کی ساری توقعات کی بنیاد ڈھا دی کہ خدا اپنے بندوں کی طرف سے نہ کفر کو پسند کرتا ہے نہ شکر کو ناپسند۔ تو جو شخص چاہے اللہ تعالیٰ کا شکر گزار بندہ بن کر اس کی رضا اور قرب حاصل کرے اور جو چاہے ناشکری کر کے اس کے قہر و غضب میں اپنے تئیں مبتلا کر لے۔ ان دونوں باتوں کا انحصار آدمی کے اپنے عمل پر ہے کوئی دوسرا نہ شکر کو کفر بنا سکتا نہ کفر کو شکر۔ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی۔

(ز) اس کے بعد اپنے احاطۂ علم کو بیان کر کے شفاعت کی ضرورت کی نفی کر دی کہ وہ دلوں کے بھیدوں تک سے واقف ہے کوئی دوسرا اس کے

علم میں کیا اضافہ کرے گا۔

(ح) آخر میں توحید کی وہ دلیل بیان کی ہے جو دلیل افتقار کے عنوان سے ہم دلائل النفس کے تحت بیان کر چکے ہیں۔ یہاں اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔

ان تمام لوازم اور تمام تر تنزیہات کے بعد خدا کا تصور جس شکل میں خدا کے سامنے آیا اس کی ایک عمدہ مثال آیت الکرسی ہے۔

| | |
|---|---|
| اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ | اللہ، نہیں کوئی معبود مگر وہ، زندہ |
| اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ، لَا تَاْخُذُهٗ | ہے اور قائم رکھنے والا، نہ اس کو اونگھ |
| سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ، لَهٗ مَا | لاحق ہوتی ہے نہ نیند، اس کے قبضہ |
| فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی | میں ہے جو کچھ کہ آسمانوں میں ہے اور |
| الْاَرْضِ، مَنْ ذَا الَّذِیْ | جو کچھ زمین میں ہے۔ کون ہے جو |
| یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا | اس کے ہاں بغیر اس کی اجازت کے |
| بِاِذْنِهٖ یَعْلَمُ مَا | سفارش کر سکے۔ وہ جانتا ہے جو کچھ |
| بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَمَا | ان کے آگے ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے |
| خَلْفَهُمْ وَلَا یُحِیْطُوْنَ | ہے اور وہ اس کے علم میں سے کسی |
| بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖۤ اِلَّا | چیز کا احاطہ نہیں کر سکتے مگر وہ جو چاہے |
| بِمَا شَآءَ وَسِعَ كُرْسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ | اس کی کرسی آسمانوں اور زمین کو محیط |
| وَالْاَرْضَ وَلَا یَـُٔوْدُهٗ حِفْظُهُمَا | ہے اور ان کی حفاظت اس پر گراں |
| وَهُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ۔ | نہیں ہے اور وہ بلند و بزرگ ہے۔ |

دوسری نہایت عمدہ اور جامع مثال سورۂ حشر میں ہے اور اس میں تنزیہہ کی جگہ اثبات کا پہلو غالب ہے۔

| | |
|---|---|
| هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ | وہ اللہ ہے، نہیں کوئی معبود مگر وہ، |
| اِلَّا هُوَ عَالِمُ الْغَیْبِ وَ | ڈھکے اور کھلے کا جاننے والا، وہ |
| الشَّهَادَةِ هُوَ الرَّحْمٰنُ | رحمٰن و رحیم ہے۔ وہی اللہ ہے، نہیں |
| الرَّحِیْمُ هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَا | ہے کوئی معبود مگر وہ بادشاہ، پاک، |
| اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ | مسلم، امن دینے والا، معتمد، غالب، |
| السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَیْمِنُ | عالی جناب، متکبر (غیور) پاک ہے |
| الْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ | اللہ ان چیزوں سے جن کو یہ شریک ٹھہراتے |
| سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا یُشْرِكُوْنَ ۝ | ہیں وہی اللہ ہے خلق کرنے والا (ڈیزائنر) |
| هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ | وجود بخشنے والا، صورت گری کرنے والا |
| لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى یُسَبِّحُ | اسی کے لیے ہیں ساری اچھی صفتیں، اسی |
| لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ | کی تسبیح کرتی ہیں جو چیزیں آسمانوں اور زمین |
| وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ۔ | میں ہیں۔ اور وہ غالب حکمت والا ہے۔ |

اسی ذیل میں سورۂ اخلاص کو بھی سامنے رکھنا چاہیے۔

| | |
|---|---|
| قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ، اَللّٰهُ | کہہ اللہ بے ہمہ ہے، اللہ باہمہ |
| الصَّمَدُ ، لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ | ہے، نہ کسی کا باپ نہ کسی کا بیٹا۔ |
| وَلَمْ یَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ | اور نہ کوئی اس کا ہمسر ہے۔ |

خدا کا یہ تصور ان مسلمات کی اساس پر آراستہ ہوا جن کا اہل عرب کو اقرار تھا۔ قرآن نے یہ کیا کہ جن صفتوں کو اہل عرب مانتے تھے ان کے لوازم کو بھی اس نے ان کے سامنے رکھ دیا کہ ان کو بھی تسلیم کرو۔ علی ہذا القیاس جن باتوں سے ان مسلمات یا ان کے لوازم کی نفی لازم آتی تھی، مطالبہ کیا کہ ان کا انکار کرو۔

اسی طرح ان صفات کو تسلیم کرنے سے تسلیم کرنے والوں پر اللہ تعالیٰ کے

جو حقوق عائد ہوتے تھے ان کو بھی بلا شرکت غیرے تسلیم کرنے کا مطالبہ کیا۔

سورۂ اعراف میں یہ ثابت کرنے کے بعد کہ جس نے خلق کیا ہے لازماً وہی رب ہے اور امر و حکم کا حق اسی کو حاصل ہے یہ نتیجہ نکالا کہ خُفیہ و علانیہ اور امید و بیم ہر حال میں اسی کو پکارنا چاہیے، مشکلوں کو آسان کرنے والا، خطرات و مصائب کا دور کرنے والا اور امیدوں کو پورا کرنے والا وہی ہے اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً (اپنے رب کو پکارو گڑگڑاتے ہوئے اور چپکے ہوئے) وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا (اور اسی کو پکارو بیم و رجا میں)

سورۂ بقرہ میں فرمایا کہ جس کو خالق مانتے ہو اسی کی بندگی اور اطاعت بھی کرو، دوسروں کو اس بندگی اور اطاعت میں شریک نہ کرو۔

| | |
|---|---|
| يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ | اے لوگو! اپنے اس رب کی بندگی کرو |
| الَّذِيْ خَلَقَكُمْ | جس نے تم کو پیدا کیا ہے۔ |

اس بندگی کے لیے جگہ جگہ یہ شرط لگائی کہ خالص اطاعت کے ساتھ اس کی بندگی کرو۔ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ یعنی یہ جائز نہیں ہے کہ پوجا خدا کی ہو اور اطاعت کسی اور کی۔ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ (نہیں ہے کوئی معبود مگر وہ، پس اسی کو پکارو اسی کے لیے اطاعت کو خاص کرتے ہوئے)

اسی طرح فرمایا جس رب کے لیے آسمان و زمین کی بادشاہی ثابت ہے، حمد و شکر کا سزاوار صرف وہی ہے، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ (اسی کی بادشاہی ہے اور اسی کے لیے شکر گزاری ہے)

سورۂ بقرہ ہی میں خدا کو منعم حقیقی ثابت کرنے کے بعد فرمایا کہ اسی کو محبت حقیقی کا مرکز ہونا چاہیے وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِلّٰهِ۔ پھر اسی ذیل میں فرمایا کہ جب سب کچھ خدا ہی کی بخشش سے ملا ہے تو صرف خدا ہی کو ان کے حرام

یا حلال کرنے کا حق حاصل ہے۔ دوسروں کے لیے ان کو حلال و حرام کرنے کا حق تسلیم کرنا یا دوسروں کا ان کو حلال و حرام کرنا شرک ہے (دیکھو آیات ۱۶۲-۱۶۹ بقرہ) سورہ نحل (آیات ۴۸-۵۹) میں آسمان و زمین میں ایک ہی خدا کا تصرف ثابت کرنے کے بعد اس کا لازمی نتیجہ یہ قرار دیا کہ فَاِیَّایَ فَارْهَبُوْنَ (پس مجھ سے ڈرو) اور غیر اللہ سے ڈرنے پر تعجب کا اظہار فرمایا (افغیر اللہ تتقون (کیا اللہ کے سوا دوسروں سے ڈرتے ہو)

سورہ انعام میں فرمایا کہ جو آسمان و زمین کا فاطر ہے لازم ہے کہ اسی کو یاور و ناصر بنایا جائے اور اپنے تئیں بالکلیہ اسی کے حوالے کیا جائے۔

| | |
|---|---|
| قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَتَّخِذُ | کہو کیا میں اللہ کے سوا جو آسمانوں |
| وَلِيًّا فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ | اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے |
| وَالْاَرْضِ وَهُوَ يُطْعِمُ | کسی اور کو اپنا مرجع بناؤں حالانکہ |
| وَلَا يُطْعَمُ قُلْ اِنِّيْٓ | وہ کھلاتا ہے کھاتا نہیں۔ کہو مجھے تو |
| اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ | حکم ملا ہے کہ میں پہلا حوالہ کرنے والا |
| مَنْ اَسْلَمَ | بنوں اپنے تئیں اللہ کو۔ |

سورۂ یونس میں اللہ تعالیٰ کو ہادی ثابت کرنے کے بعد فرمایا کہ وہی اس بات کا سزاوار ہے کہ اس کی پیروی کی جائے۔

| | |
|---|---|
| قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَآئِكُمْ | پوچھو تمہارے شرکاء میں سے کوئی |
| مَّنْ يَّهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ | ہے جو حق کی طرف ہدایت کرتا ہے |
| قُلِ اللّٰهُ يَهْدِيْ لِلْحَقِّ | کہدو اللہ حق کے لیے ہدایت کرتا |
| اَفَمَنْ يَّهْدِيْٓ اِلَى | ہے تو کیا جو حق کی طرف ہدایت کرتا |
| الْحَقِّ اَحَقُّ اَنْ يُّتَّبَعَ | ہے زیادہ حق دار ہے اس بات کا |

اَمَّنۡ لَّا یَهِدِّیۡۤ اِلَّاۤ اَنۡ یُّهۡدٰیؕ فَمَا لَکُمۡ کَیۡفَ تَحۡکُمُوۡنَ ﴿۳۵﴾

کہ اس کی پیروی کی جائے یا وہ جو ہدایت نہیں پکڑ سکتے الا آنکہ ان کو ہدایت کی جائے، تو کیسا فیصلہ کرتے ہو۔

سورۂ فاتحہ میں عالم کے رب ہی کا حق یہ بتایا کہ شکر اسی کے لیے ہو، بندگی اسی کی کی جائے۔ استعانت اسی سے ہو اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ (ہم تجھی کو پوجتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں)

الغرض جو شخص خدا کو ایک مانتا ہے اس کے لیے لازم ہے کہ وہ خدا کے حقوق میں کسی نوعیت سے کسی دوسرے کو شریک کرکے اس کی صفات کی نفی یا اس کے حقوق کا ابطال نہ کرے۔ مثلاً جو شخص خدا کو کھلے اور چھپے کا عالم مانتا ہے وہ کسی کو شفیع و سفارشی مان کر اس کی صفت علم کی نفی نہ کرے۔ جو شخص خدا کو رحمان و رحیم مانتا ہے وہ شفاعت کا عقیدہ رکھ کر خدا کے عدل سے بدگمان نہ ہو[1]۔ جو خدا

[1] جس شفاعت کا عقیدہ مشرکین اپنے شفعا کے متعلق رکھتے تھے اور جس سے خدا کی صفات کی شرکت اور اس کے علم اور عدل و حکمت کی نفی لازم آتی ہے وہ شرک اور کفر ہے اور ہرگز جائز نہیں ہے، کہ اس طرح کی شفاعت کا عقیدہ ملائکہ اور انبیاء و صالحین کے متعلق رکھا جائے۔ قرآن مجید میں اس بات کی صاف تصریح کر دی گئی ہے کہ کسی کو بھی خدا کے ہاں تدلل کا مقام حاصل نہ ہوگا۔ سب اس کے سامنے عاجز و سرفگندہ کھڑے ہوں گے۔ نیز کوئی شخص بغیر اذن الٰہی کے اس کے حضور میں زبان نہ کھول سکے گا۔ نیز ایک حرف بھی حق کے خلاف نہ کہہ سکے گا اور کوئی شفاعت ایسی نہ ہوگی جس سے حق اور باطل اور باطل حق بن جائے۔ پس انبیاء و صالحین اور ملائکہ سے جو شفاعت ثابت ہے وہ اس مشرکانہ شفاعت سے بالکل مختلف ہے اور اس پر مفصل بحث انشاء اللہ ہم حقیقت معاد میں کریں گے اور بعض ضروری باتوں سے رسالہ حقیقت رسالت میں بھی تعرض کریں گے۔

کو بادشاہ تسلیم کرتا ہے، وہ اس کی بادشاہی میں کسی دوسرے کی اطاعت نہ کرے۔ جو خدا کو پاک و پاکیزہ جانتا ہے وہ پاکیزگی کو اس کے ہاں تقرب کا وسیلہ بنائے نہ کہ شرکاء و انداد کو۔ جو شخص خدا کو سلام یعنی سکھ اور چین تسلیم کرتا ہے وہ سکھ اور طمانیت اسی سے طلب کرے۔ جو اس کو امن دینے والا مانتا ہو وہ اسی کی پناہ میں چھپے۔ جو اس کو معتمد مانتا ہے وہ اسی پر بھروسہ کرے اور اسی سے طالبِ مدد ہو۔ جو اس کو غالب اور عالی جناب مانتا ہے وہ اس کے آگے سب کو یکساں عاجز و سرفگندہ مانے۔ جو اس کو غیور مانتا ہے لازم ہے کہ وہ کسی غیر کو سجدہ کرکے اس کی غیرت و کبریائی کو جوش نہ دلائے۔ جو خدا ہی کو خالق، وجود بخشنے والا اور صورت گری کرنے والا مانتا ہے لازم ہے کہ اس کے علم کو محیط اور اس کی قدرت کو کامل تسلیم کرے۔

۳۔ دلیل عدل | توحید کے انفسی دلائل کے سلسلہ میں ہم ثابت کرچکے ہیں کہ عدل انسان کی فطرت ہے اور یہ عدل انسان کو ایک خدا کی شکرگزاری اور اس کی بندگی پر مجبور کرتا ہے۔ اس شعورِ عدل کو قرآن نے عہدِ فطرت سے تعبیر کیا ہے اور اس کی ذمہ داری ہر انسان پر عائد کی ہے۔ وہاں یہ دلیل عام دلیل کی حیثیت سے بیان ہوئی تھی اور اس کی حجت اہل عرب اور تمام بنی آدم پر یکساں تھی۔ قرآن سے اسی اصل سے بعض خاص دلیلیں بھی پیدا کیں جن کی ترکیب میں فطرتِ انسانی اور مسلمات عرب دونوں شامل ہیں۔ مثلاً اہل عرب تمام عالم کا خالق اور روزی رسان خدا ہی کو مانتے تھے، لیکن رب اور حاکم دوسروں کو بھی بنا لیتے تھے اور پھر ان کا رتبہ اس قدر بڑھاتے کہ ان کو خدا کے برابر لے جاکر بٹھا دیتے، بلکہ بسا اوقات خود خدا سے بھی بڑھا دیتے۔ قرآن نے ان کے اس مسلمہ اور انسانی فطرت کی عدل پسندی کی بنا پر ان سے یہ سوال کیا کہ جب تم اپنے لیے نہیں پسند کرتے کہ اپنے

غلاموں اور مملوکوں کو درجہ اور روزی میں اپنے برابر کا شریک قرار دو تو پھر جن کو خدا کی مخلوق و مملوک مانتے ہو ان کو خدا کے اختیارات اور خدا کے حقوق میں کیوں شریک کرتے ہو؟ تمہاری فطرت جس بات سے اپنے لیے انکار کرتی ہے اسی چیز کو اللہ جل شانہ کے لیے کس طرح گوارا کر لیتی ہے حالانکہ ہونا یہ تھا کہ خدا کے بارہ میں تم اس سے کہیں زیادہ نفرت کرتے۔ اس اصل کو سامنے رکھ کر مندرجہ ذیل آیتوں پر غور کرنا چاہیے۔ ان میں یہ دلیل مختلف طریقوں سے بیان ہوئی ہے۔

| | |
|---|---|
| وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى | اور اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض |
| بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ فَمَا الَّذِيْنَ | پر روزی میں فضیلت دی ہے تو وہ |
| فُضِّلُوْا بِرَآدِّيْ رِزْقِهِمْ | جن کو فضیلت بخشی گئی ہے اپنی روزی |
| عَلٰى مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ | اپنے مملوکوں کو نہیں دے دیتے کہ |
| فَهُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ ؕ اَفَبِنِعْمَةِ | آپس میں برابر ہو جائیں۔ کیا وہ اللہ |
| اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ○ وَاللّٰهُ | کی نعمت کا انکار کرتے ہیں اور اللہ |
| جَعَلَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ | نے تمہارے لیے تمہاری جنس سے بیویاں |
| اَزْوَاجًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ | بنائیں اور تمہاری بیویوں سے تمہارے |
| اَزْوَاجِكُمْ بَنِيْنَ وَحَفَدَةً | لیے بیٹے اور پوتے پیدا کیے اور تم کو |
| وَّرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ط | پاکیزہ چیزوں کی روزی دی تو کیا وہ |
| اَفَبِالْبَاطِلِ يُؤْمِنُوْنَ وَ | باطل پر ایمان لاتے ہیں اور اللہ کی |
| بِنِعْمَتِ اللّٰهِ هُمْ يَكْفُرُوْنَ | نعمت کا انکار کرتے ہیں اور اللہ کے |
| وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ | سوا ایسی چیزوں کی بندگی کرتے ہیں |
| مَا لَا يَمْلِكُ لَهُمْ رِزْقًا | جو ان کے لیے آسمان و زمین سے |
| مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ شَيْئًا | ذرہ برابر بھی ان کے لیے نہ رزق |

| | |
|---|---|
| وَلَا يَسْتَطِيعُونَ فَلَا | پر اختیار رکھتی ہیں اور نہ اختیار حاصل |
| تَضْرِبُوا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ | کر سکتی ہیں۔ تو اللہ کے لیے مثلیں نہ بیان |
| اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ | کرو، اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔ |
| لَا تَعْلَمُوْنَ ضَرَبَ اللّٰهُ | اللہ تعالیٰ مثال بیان کرتا ہے ایک |
| مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوْكًا | غلام مملوک کی جو کسی چیز پر اختیار نہیں |
| لَّا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ وَّ | رکھتا اور اس (آزاد) کی جس کو ہم نے |
| مَنْ رَّزَقْنٰهُ مِنَّا رِزْقًا | اچھی روزی دے رکھی ہے اور وہ |
| حَسَنًا فَهُوَ يُنْفِقُ مِنْهُ | اس میں سے کھلے اور چھپے خرچ کرتا |
| سِرًّا وَّجَهْرًا، هَلْ يَسْتَوٗنَ | ہے۔ کیا وہ دونوں برابر ہوں گے؟ |
| اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ بَلْ اَكْثَرُهُمْ | شکر اللہ کے لیے ہے بلکہ ان میں سے |
| لَا يَعْلَمُوْنَ، وَضَرَبَ | اکثر نہیں جانتے اور اللہ مثل بیان |
| اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلَيْنِ | کرتا ہے دو آدمیوں کی۔ ایک گونگا |
| اَحَدُهُمَا اَبْكَمُ لَا | ہے کسی چیز پر قدرت نہیں رکھتا۔ |
| يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ وَّهُوَ كَلٌّ عَلٰى | اور وہ اپنے آقا پر ایک بوجھ ہے، |
| مَوْلٰىهُ اَيْنَمَا يُوَجِّهْهُّ لَا | جہاں اس کو بھیجتا ہے کوئی کام ٹھکانے |
| يَاْتِ بِخَيْرٍ هَلْ يَسْتَوِيْ | کا کر کے نہیں دیتا کیا وہ اور وہ شخص |
| هُوَ وَمَنْ يَّاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَهُوَ | جو عدل کا حکم دیتا ہے اور وہ سیدھے |
| عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۔ (النحل ۷۱-۷۶) | رستہ پر ہے دونوں برابر ہوں گے؟ |

یہی ساس استدلال سورۂ نجم کی اس آیت میں ہے۔

| | |
|---|---|
| اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَ | کیا تمھارے لیے لڑکے ہیں اور اللہ |
| لَهُ الْاُنْثٰى تِلْكَ اِذًا | کے لیے لڑکیاں یہ تو بڑی بھونڈی |

قِسْمَۃٌ ضِیْزٰی                تقسیم ہے۔

**اہل کتاب اور منافقین** یہود و نصاریٰ اور منافقین، جیسا کہ ہم "حقیقت شرک" میں بیان کر چکے ہیں، بالعموم یا تو خدا کی صفات کے صحیح تصور میں بھٹکے تھے یا ان سے متناقض چیزیں مانتے تھے یا ان صفات کے لوازم کو تسلیم کرنے سے گریز کرتے تھے اس وجہ سے وہ عمومی دلائل کی جگہ خصوصی دلائل کے مخاطب ہیں۔ ان کے سامنے ان کے مسلمات رکھ دیے گئے ہیں اور ان سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ جو باتیں ان سے متناقض انھوں نے مان رکھی ہیں ان کو ترک کریں اور جو باتیں ان سے لازم آتی ہیں، ان کو تسلیم کریں۔ ان کے سامنے توحید کی حقیقت جس طرح پیش کی گئی ہے اس کی تفصیل ہم "حقیقت شرک" میں بیان کر چکے ہیں، یہاں اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔ محض استدلال کی نوعیت اور اس کی اساس واضح کرنے کے لیے چند باتوں کی طرف اشارہ کر دینا کافی ہوگا۔

مثلاً اہل کتاب کے یہاں یہ چیز مسلم تھی کہ خدا کے سوا کوئی رب نہیں ہے۔ قرآن نے ان سے مطالبہ کیا کہ اگر یہ بات مانتے ہو تو مسیح علیہ السلام اور احبار و رہبان کو رب نہ بناؤ۔ اور ساتھ ہی یہ امر بھی واضح کر دیا گیا کہ کسی کے لیے امر و نہی کا مطلق حق تسلیم کر لینا درحقیقت اس کو رب بنا لینا ہے زبان سے اس کو رب کہو یا نہ کہو۔ اسی طرح یہود کو اپنی نسبت یہ گمان تھا کہ وہ اللہ کے محبوب اور چہیتے ہیں اور بندگی سے کچھ مافوق درجہ رکھتے ہیں۔ قرآن نے ان کی اس تاریخ سے جس کو وہ مانتے تھے، ان پر ثابت کر دیا کہ ان کا یہ خیال غلط ہے۔ ان کی تاریخ شاہد ہے کہ جب کبھی انھوں نے خدا کی بندگی و اطاعت سے باہر قدم نکالا ہے خدا نے ان کو نہایت عبرت انگیز سزائیں دی ہیں جو اس امر کا نہایت واضح ثبوت ہے کہ ان کا درجہ بشریت سے کچھ اونچا نہیں ہے۔ نیز

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پوری سرگزشت ان کو سنا کر ان پر یہ حقیقت واضح فرمائی کہ ان کو خدا کے ہاں جو تقرب اور درجہ حاصل ہوا وہ بندگی اور اطاعت کا ثمرہ تھا۔ تو ان کی اولاد کو خدائی کا مقام کیسے حاصل ہو جائے گا۔

اسی طرح نصاریٰ نے حضرت مسیح علیہ السلام کو خارق عادت پیدائش کو ان کی الوہیت کے ثبوت میں پیش کیا تو قرآن نے ان کے مسلمات سے ان کے خلاف حجت پیش کی کہ تم آدم اور یحییٰ کی ولادت کو بھی خارق عادت، مانتے ہو لیکن ان کی الوہیت کے مدعی نہیں ہو۔ نیز حضرت مسیح علیہ السلام اور ان کی والدہ کا کھانا کھانا بھی ان کی بشریت کے ثبوت میں پیش کیا کیونکہ کھانا کھانا بھی یہود و نصاریٰ کے ہاں بشریت کی ایک مسلم دلیل تھی اور اسی دلیل سے حضرت مسیح علیہ السلام نے اپنے بارہ میں اپنے شاگردوں کی ایک غلط فہمی دور کی تھی جس کی تفصیل حقیقت شرک میں گزر چکی ہے۔ نیز حضرت مسیح علیہ السلام کے بعض اقوال کا جو غلط ترجمہ ہو گیا تھا، قرآن نے اس کی تصحیح کر دی۔ مثلاً حضرت مسیح علیہ السلام کی زبان سے انجیلوں میں بار بار یہ نقل ہوتا ہے "میرا باپ اور تمھارا باپ" قرآن کی اس کی تعبیر رَبِّیْ وَرَبُّکُمْ "میرا رب اور تمھارا رب" سے کی ہے اور یہ تعبیر انجیلوں کے دوسرے بیانات نیز انجیلوں کی اصل زبان یعنی عبرانی کے بالکل مطابق ہے۔

منافقین کی تمام ضلالت ان لوازم اور حقوق کے سمجھنے میں تھی جو خدا اور اس کی صفتوں پر ایمان لانے سے بندے پر عائد ہوتے ہیں اور اس ضلالت کا سبب یہ نہیں تھا کہ ان لوازم کے ادراک میں کوئی اشکال تھا۔ یہ ساری باتیں بالکل واضح تھیں اور اگر ان میں کوئی اشکال تھا تو وہ قرآن کی بار بار کی وضاحت سے دور ہو گیا تھا۔ لیکن منافقین کی بیماری عقلی نہیں قلبی تھی۔ ان کے دلوں کے

اندر اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ توحید کے مقتضیات کا ساتھ دے سکتے اس لیے اگر ایک راستہ سے خدا کے دین میں داخل ہوتے تھے تو دوسرے راستوں سے بھاگ کھڑے ہونے کے لیے تیار رہتے تھے۔ ان کی اس کمزوری کو دور کرنے کے لیے قرآن نے ایک طرف تو اللہ تعالیٰ کی قدرت کے ان کرشموں کو بیان کیا جو مسلمانوں کی قلت و ضعف کے باوجود ان کی فتح و کامیابی کی صورت میں ظاہر ہوئے اور دوسری طرف توحید کے تمام گوشوں کی پوری پوری توضیح کی۔ چنانچہ تقریباً ان تمام سورتوں میں جن میں منافقین مخاطب ہیں یہ دکھایا گیا ہے کہ اس کائنات کی تمام چیزیں اللہ واحد کے آگے سرفگندہ اور اس کی حمد و تسبیح میں سرگرم ہیں تاکہ خدا کی حمد و تسبیح میں تمام کائنات کی اس ہم آہنگی کو دیکھ کر ان کے دلوں میں ہمت پیدا ہو اور اس خیال سے ان کے دل پست نہ ہوں کہ اس راہ پر چلنے والے تھوڑے ہیں، بلکہ یہ دیکھ کر ان کا حوصلہ بڑھے کہ تھوڑے سے ناشکرے انسانوں کے سوا ساری کائنات اس راہ میں سرگرم سفر ہے اور قافلوں سے بھری ہوئی سڑک یہی ہے جو بظاہر سنسان نظر آ رہی ہے۔ قرآن میں جو لوگ مسبحاتؔ کی روح سمجھ گئے ہیں ان کو ہمارے اشارات کے سمجھنے میں کوئی دقت نہ ہوگی۔

---

لہ مسبحات سے ہماری مراد وہ سورتیں ہیں جو "سَبَّحَ" اور "یُسَبِّحُ" سے شروع ہوتی ہیں۔ ان سورتوں میں بالعموم روئے سخن ان منافقین کی طرف ہے جنھوں نے زبان سے اقرار پوری توحید کا کر لیا تھا لیکن اس کی ذمہ داریوں کو اٹھانے میں تھڑدلے پن کا ثبوت دے رہے تھے اور مشرکین مکہ اور یہود کی جتھے بندی سے خائف تھے کہ ممکن ہے ان کی منظم طاقت کے مقابلہ میں مسلمانوں کو ان کی قلت تعداد کی وجہ سے پسپا ہونا پڑے تو تقاضائے مصلحت یہی ہے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) سے بھی رابطہ رکھا جائے اور یہود و مشرکین سے بھی ناتا نہ ٹوٹنے پائے۔ ان منافقین کے سامنے قرآن مجید نے بار بار یہ حقیقت واضح فرمائی کہ آسمان و زمین کی ساری چیزیں خدا کی تسبیح کرتی ہیں۔ تسبیح کی (باقی اگلے صفحہ پر)

# پچھلی فصلوں کا خلاصہ

اوپر کی تین فصلوں میں جو باتیں بیان ہوئی ہیں ہم ان کا اجمالی خلاصہ بھی پیش کر دیتے ہیں تاکہ یہ پھیلے ہوئے مطالب بسہولت پڑھنے والوں کی گرفت میں آجائیں۔

(۱) ان تفصیلات سے پہلی بات، یہ ثابت ہوئی کہ جو لوگ کہتے ہیں، قرآن کے استدلال کی ساری عمارت الزامی اور خطیبانہ قسم کی دلیلوں پر قائم ہے اور وہ ٹھوس عقلی و فطری دلائل سے بالکل خالی ہے۔ وہ قرآن کے متعلق نہایت مکروہ قسم کے سوءظن میں مبتلا ہیں۔ بلاشبہ قرآن مجید میں الزامی دلائل ہیں لیکن یہ قرآنی استدلال کی ایک خاص قسم ہے اور اس کی مخاطب وہ جماعتیں ہیں جو بعض صحیح اصولوں کو تسلیم کرتی ہیں۔ قرآن نے ان کے ان مسلمات سے ان پر حجت قائم

---

(حاشیہ صفحہ گزشتہ) اصل حقیقت ڈنڈوت اور جبیں سائی (PROSTRATION) ہے۔ جس کے معنی ہوئے کہ دنیا کی ساری چیزیں خدا کے بنائے ہوئے قانون کی مطیع و فرماں بردار ہیں اور سر مو اس کے حکم سے انحراف نہیں کر رہی ہیں اور اپنے عمل سے خلائق کو دعوت دے رہی ہیں کہ سب اسی کی اطاعت میں سرگرم ہوں۔ نیز کسی کو بھی یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ اللہ کے فرمانبرداروں کی تعداد تھوڑی ہے بلکہ حقیقت حال اس کے بالکل برعکس ہے یعنی ساری کائنات خدا کی فرمانبردار اور مطیع ہے۔ اس کی نافرمانی کرنے والے اگر ہیں تو بس انسانوں کے اندر ہیں، تو جو شخص خدا کی راہ میں قدم رکھے وہ یہ خیال نہ کرے کہ وہ تنہا ہے بلکہ اسے یہ خیال کرنا چاہیے کہ تھوڑے سے بلید انسانوں کے سوا جنھوں نے اپنے نفس کو یا دوسروں کو معبود بنا رکھا ہے، آسمان سے لے کر زمین تک ایک ایک ذرہ اس کے ہم رکاب ہے۔

کی ہے اور یہ استدلال کا ایک بالکل فطری اور عقلی طریقہ ہے جو تمام بنی آدم میں یکساں مسلم ہے۔ باقی قرآن کے عام استدلال کی اساس فطرت اور کائنات کی آیات پر ہے جن کی حجت، عربی و عجمی اور عامی و فلسفی سب کے لیے یکساں ہے اور یہی وجہ ہے کہ قرآن تمام بنی آدم کی ہدایت کے لیے نازل ہوا اور اب قیامت تک دنیا کی ہدایت و رہنمائی کے لیے کافی ہے۔

(ب) دوسری حقیقت، یہ ثابت ہوئی کہ قرآنی استدلال ہمارے متکلمین و فلاسفہ کے استدلال سے بالکل مختلف ہے۔ ان کی ساری کاوش کا خلاصہ زیادہ سے زیادہ صرف ایک علۃ العلل کا اثبات ہے جس سے نہ تو اس کائنات کا معمہ ہی حل ہوتا اور نہ وہ خلا ہی بھرتا جس کو ہر انسان اپنے اندر محسوس کرتا ہے اور جس کو بھرنے کی اس کے اندر اتنی شدید خواہش ہے کہ بسا اوقات، اگر وہ صحیح چیز نہیں پاتا تو کسی غلط ہی چیز سے بھرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے برعکس قرآنی استدلال سے ایک ایسے خدا کا ثبوت ملتا ہے جو تمام اچھی صفتوں سے متصف ہے۔ جس نے اپنے ارادہ سے دنیا کو پیدا کیا ہے اور حکمت و رحمت کے ساتھ دنیا کی تدبیر و پرورش فرما رہا ہے۔ یہ نہیں ہے کہ جس طرح سورج سے بالاضطرار خلق کو فائدہ پہنچ رہا ہے اسی طرح خدا سے یہ دنیا بالاضطرار وجود میں آگئی اور اس سے اضطراراً فیض پا رہی ہے۔ نیز یہ بھی نہیں ہے کہ وہ دنیا کو خلق کر کے اس کے روزمرہ معاملات سے بے تعلق ہو گیا ہو، یہاں تک کہ اگر وہ غائب ہو جائے تو اس کے غائب ہو جانے سے دنیا کو کوئی نقصان نہ پہنچے جیسا کہ یونانی فلسفیوں کا خیال تھا۔ بلکہ وہ تمام عالم کے تدبیر و نظام پر حاوی اور مسلط ہے۔ اس کا علم جزئیات اور کلیات کو یکساں محیط ہے۔ زمین کے اندر جو کچھ داخل ہوتا ہے اور آسمان کے اوپر سے جو اترتا ہے وہ سب کو جانتا ہے۔ تمام خیر و شر اس کے ہاتھ میں ہے۔ روشنی اور

تاریکی دونوں کا نکالنے والا ہی ہے۔ اس کے اذن کے بغیر نہ ایک ذرہ اپنی جگہ سے ٹل سکتا نہ ایک پتہ اپنی شاخ سے گر سکتا۔ نیز وہ بے ہمہ اور باہمہ ہے۔ جب کچھ نہیں تھا تب وہ تھا اور جب کچھ نہ ہوگا تب بھی وہ ہوگا۔ وہ خالق ہے، باری ہے، مصوّر ہے، رزاق ہے، علیم و قدیر ہے، رحمن و رحیم ہے، عزیز و حکیم ہے، غالب و قہار ہے، مومن و مہیمن ہے، غفار و ستار ہے، قدوس و سلام ہے، ملک اور رب ہے، غفور و ودود ہے، ہادی و کریم ہے۔ وہ سب سے مستغنی اور سب کی پناہ ہے، نہ کسی کا باپ ہے نہ کسی کا بیٹا ہے۔ نہ کوئی اس کی ذات برادری کا ہے۔

(ج) تیسری بات یہ معلوم ہوئی کہ خدا کی ان صفتوں کے لوازم ہیں اور جس طرح وہ اپنی صفات میں یکتا اور بے شریک ہے اسی طرح ان لوازم میں بھی اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ مثلاً یہ کہ جب وہ خالق ہے تو اسی کو رب مانا جائے، اسی کے امر و حکم کی پیروی کی جائے۔ زندگی کے ہر مرحلہ میں اسی کی اطاعت و بندگی ہو۔ جب وہی رزاق ہے تو حقیقی شکرگزاری اور حقیقی محبت کا مرکز وہی ہے اور ساری شکرگزاریاں اور ساری محبتیں اس کی شکرگزاری اور محبت کے تابع ہیں۔ جب وہ مومن و مہیمن ہے تو اسی پر توکل کیا جائے، اسی سے استعانت ہو، اسی سے فریاد کی جائے جب وہ عزیز و حکیم ہے تو حقیقی اعتماد کے لائق وہی ہے اور لازم ہے کہ رنج و راحت، دکھ سکھ ہر حال میں اسی پر بھروسہ کیا جائے۔ جب وہ علیم و قدیر ہے تو تمام سِرّ و علانیہ کو اس پر آشکارا مانا جائے۔ جب وہ ہادی ہے تو واجب ہے کہ اسی کی ہدایت کی پیروی کی جائے۔ نیز یہ بھی ضروری ہوا کہ ان تمام باتوں سے قول و فعل میں اجتناب کیا جائے جن سے ان لوازم کی نفی لازم آئے یا ان میں دوسروں کی حصہ داری ثابت ہو۔

رہا یہ سوال کہ خدا کی مرضی اور زندگی کے ہر شعبہ کے لیے اس کے احکام کے جاننے کا ذریعہ کیا ہے تاکہ انسان اس کی توحید کا پورا حق ادا کر سکے اور غیر اللہ کی اطاعت سے آلودہ نہ ہو تو اس پر تفصیل کے ساتھ ہم اپنے رسالہ "حقیقت رسالت" میں بحث کریں گے[1]۔ یہاں اس سوال سے تعرض کا موقع نہیں ہے۔ یہاں تک ہم نے جو بحث کی ہے اس کا خلاصہ صرف اس قدر ہے کہ کائنات اور فطرت انسانی کی کھلی ہوئی شہادت یہ ہے کہ اس کائنات کا ایک خالق و مدبر ہے جو تمام صفات حسنیٰ سے متصف ہے اور اس تمام کائنات پر آمر و متصرف ہے۔ وہی ہمارا مولیٰ اور رب ہے، جس کی عبادت اور اطاعت ہم پر واجب ہے۔ وہی ہماری تمام شکر گزاریوں، تمام نیاز مندیوں اور تمام التجاؤں کا مرکز ہے۔ لا الہ الا ھو ولا رب سواہ۔

---

[1] افسوس کہ یہ رسالہ نہ میں اب تک لکھ سکا اور نہ اب بظاہر اس کی توقع ہے۔

# توحید کے اثرات

پچھلی فصلوں میں توحید کی جو حقیقت پیش کی گئی اس سے یہ بات پوری طرح واضح ہوگئی ہے کہ توحید مجرد ایک علمی حقیقت نہیں بلکہ ایک نہایت اہم عملی حقیقت ہے۔ انسانی زندگی پر، خواہ انفرادی ہو یا جماعتی، اس کے نہایت گہرے اثرات مترتب ہوتے ہیں۔ ان میں سے بعض کی طرف ہم یہاں اشارہ کریں گے۔

انفرادی زندگی پر اس کا سب سے زیادہ نمایاں اثر یہ پڑتا ہے کہ یہی عقیدہ انسان کو آزادی و حریت کا وہ بلند مقام بخشتا ہے جس کا وہ اشرف المخلوقات ہونے کی وجہ سے مستحق ہے۔ تمام کائنات انسان کے لیے پیدا ہوئی ہے لیکن جب تک انسان توحید سے آشنا نہیں ہوتا اس وقت تک اس کی دناءت و رذالت کا یہ حال ہوتا ہے کہ وہ دنیا کی حقیر سے حقیر چیزوں سے ڈرتا اور کانپتا ہے جو چیزیں اس کی تابعداری اور اطاعت کے لیے پیدا ہوئی ہیں وہ خود ان کی تابعداری اور اطاعت کرتا ہے۔ اپنے ہی جیسے انسان کو اپنا رب اور آقا بناتا ہے، غلاموں کی طرح ان کے آگے جھکتا ہے، ان کو ان داتا، خداوندِ نعمت، غریب پرور وغیرہ خطابات سے مخاطب کرتا ہے، ان کے لیے ہر طرح کے امر و نہی کا حق تسلیم کرتا ہے یہاں تک کہ زندوں سے گزر مردوں کی قبروں پر بھی اپنی درخواستیں اور التجائیں پیش کرتا ہے، ان کو امور کائنات میں متصرف، عالم الغیب اور نافع و ضار سمجھتا ہے بالآخر ہر چکنے پتھر اور ہر اونچے درخت کو معبود بنا لیتا ہے اور ہر گھنی جھاڑی، ہر سنسان مقام، ہر بہتا دریا، ہر اونچا پہاڑ اور ہر ضرررساں قوت اور نفع بخش طاقت

اس کو بندگی کی دعوت دیتی ہے اور ان میں سے کسی کے سامنے بھی اس کو اپنے نفس کو ذلیل کرنے میں کوئی غیرت نہیں لاحق ہوتی۔ وہ ایک مرتبہ اپنے مقامِ عزت سے گر کر برابر گرتا ہی چلا جاتا ہے اور اس شرف کو بالکل کھو دیتا ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے اس کو سرفراز کیا تھا۔ یہی حقیقت ہے جو سورہ حج کی اس آیت میں بیان ہوئی ہے۔

وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ (الحج - ۳۱)

اور جو شخص اللہ کا ساجھی ٹھہراتا ہے تو گویا کہ وہ آسمان سے گر پڑا پس اس کو چڑیاں اچک لے یا ہوا اڑا لے جائے کسی دور دراز گوشہ میں۔

جن چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے انسان کی خدمت گزاری میں لگایا وہ اس کی خدمت گزار ہونے کے باوجود یہ ننگ گوارا نہیں کرتیں کہ اس کو سجدہ کریں۔ ان کا سجدہ اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے لیکن انسانوں کی دناءت کا یہ عالم ہے کہ ان سب کا مقصود ہونے کے باوجود، ان میں سے ہر ایک کے در کا نقش سجدہ اس کی پیشانی پر ثبت ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَكَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ وَكَثِيْرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ وَمَنْ يُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ

کیا نہیں دیکھتے کہ اللہ ہی کے لیے سجدہ کرتے ہیں جو آسمانوں اور جو زمین میں ہیں اور سورج اور چاند اور ستارے اور پہاڑ اور درخت اور جانور بہتیرے انسانوں میں سے بھی۔ اور بہتیرے ہیں جن پر اللہ کا عذاب واجب ہو چکا ہے اور جس کو اللہ ذلیل کر دیتا

مِنْ مُّكْرِمٍ اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ — ہے اس کو کوئی عزت دینے والا نہیں

مَا يَشَآءُ (الحج - ۱۸) — ہے اور اللہ کرتا ہے جو کچھ چاہتا ہے

لیکن توحید کا چمکارا پاتے ہی دفعتہً اس کی حالت میں ایسا انقلاب عظیم واقع ہو جاتا ہے کہ وہی انسان جس کو ہم نے اس حال میں دیکھا تھا کہ وہ اس دنیا کی ہر چیز سے نیچے تھا اس قدر بلند ہو جاتا ہے کہ خدا کے سوا ہر چیز اس سے نیچے آجاتی ہے۔ اس تغیر حال کی بہترین مثال ہمیں حضرت موسٰی علیہ السلام اور ان سے مقابلہ کرنے والے ساحروں کی سرگزشت میں ملتی ہے۔ جن جادوگروں کو فرعون نے اکٹھا کیا تھا گھڑی بھر پہلے ان کی دناءت طبع کا یہ حال تھا کہ میدان مقابلہ میں اترنے سے پہلے اپنی مزدوری کی طرف سے اطمینان کر لینا چاہتے ہیں اور نہایت ذلیل خوشامدانہ انداز میں التجا کرتے ہیں۔ ءَاِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغَالِبِيْنَ (سرکار! اگر ہم فتحمند رہے تو مزدوری بھرپور ملے گی نا؟) لیکن زیادہ دیر نہیں گزرتی کہ توحید کا ایک پرتو پڑتے ہی ان کی طبیعت میں ایسا تغیر عظیم رونما ہو جاتا ہے کہ فرعون ان کو ایمان لانے پر سخت سے سخت سزا کی دھمکی دیتا ہے اور کہتا ہے کہ میں تمہارے ہاتھ پاؤں کاٹ کر تم کو سولی پر لٹکا دوں گا لیکن ان پر اس دھمکی کا کوئی اثر نہیں ہوتا اور وہ بے دھڑک جواب دیتے ہیں، کچھ پروا نہیں، ہم اپنے رب کے پاس ہی جائیں گے، تمہیں جو کچھ کرنا ہے کر لو۔ تمہارا زور بس اسی دنیا کی زندگی پر چل سکتا ہے وَمَا تَنْقِمُ مِنَّا اِلَّا اَنْ اٰمَنَّا بِاٰيٰتِ رَبِّنَا لَمَّا جَآءَتْنَا، رَبَّنَا اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّتَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک موحد پر یہ راز کھل جاتا ہے کہ دکھ ہو یا سکھ زندگی ہو یا موت، ہر ایک کے آنے اور جانے کا راستہ ایک ہی ہے۔ پس وہ

امید و بیم ہر حال میں ایک ہی سے امید رکھتا اور اسی سے ڈرتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ یہ دنیا مختلف دیوتاؤں اور کارفرماؤں کی رزم گاہ نہیں ہے، ایک ہی عزیز و حکیم ہے جو اپنی قدرت و حکمت سے اس کارخانہ کو چلا رہا ہے اور ممکن نہیں ہے کہ اس کی مشیت کے خلاف اس عالم کے معاملات میں کوئی ایک ذرہ برابر دخل دے سکے۔ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اس عالم کا خالق حق اور محب، حق ہے اس وجہ سے اس عالم میں باطل مجرد کا وجود نہیں ہے۔ باطل کی حیثیت اس دنیا میں طفیلی کی ہے جو حق کے ساتھ لگ جاتا ہے اور بالواسطہ وہ بھی حق ہی کی خدمت کرتا ہے۔ جس پر یہ راز کھل گیا اس نے دنیا جہان کی دولت پالی۔ اس کا خزانہ لازوال اور اس کی زندگی غیر فانی ہے۔ وہ نہ تو کبھی ہراساں ہوتا نہ کبھی اس کو تنہائی دکھ دیتی۔ وہ ایک سدابہار درخت سے کھاتا اور ایک ہمیشہ جاری رہنے والے چشمے سے آسودہ حال رہتا ہے۔

| | |
|---|---|
| اَلَمْ تَرَ کَيْفَ ضَرَبَ | کیا نہیں دیکھا کس طرح اللہ نے |
| اللّٰهُ مَثَلًا کَلِمَةً | مثل بیان کی ایک مبارک کلمہ کی۔ وہ |
| طَيِّبَةً کَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ | ایک مبارک درخت کے مانند ہے |
| اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا | جس کی جڑیں زمین میں جمی ہوئی ہوں |
| فِی السَّمَآءِ تُؤْتِیْٓ اُکُلَهَا | اور شاخیں فضا میں پھیلی ہوئی ہوں |
| کُلَّ حِيْنٍۢ بِاِذْنِ رَبِّهَا | جو ہمیشہ اپنا پھل دیتا ہے اپنے رب |
| وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ | کے حکم سے اور اللہ مثلیں بیان کرتا |
| لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَکَّرُوْنَ | ہے لوگوں کے لیے تاکہ وہ یاد دہانی |
| (ابراہیم۔ ۲۴) | حاصل کریں۔ |

یہی لوگ ہیں جن کا دماغ مصیبت و راحت ہر حال میں متوازن رہتا ہے

اور تنگی و فراخی کی کوئی حالت ان کے دل کے اطمینان کو درہم برہم نہیں کرتی۔ نہ وہ گھبراتے نہ مایوس ہوتے، نہ وہ اکڑتے اور نہ فخر کرتے، جس خندہ جبینی کے ساتھ وہ آرام کی گھڑیوں کا استقبال کرتے ہیں اسی شادمانی کے ساتھ آزمائشوں اور مصیبتوں کا بھی خیر مقدم کرتے ہیں۔ یَا اَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِیْ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً۔

یہ ایک موحد کا باطن ہے۔ وہ اپنے باطن میں بالکل یکسو اور حنیف ہو جاتا ہے اور پھر یہی یکسوئی اور حنیفیت اس کے ظاہر پر بھی طاری ہو جاتی ہے۔ وہ جس طرح قوانین طبیعی کے آگے بے بس اور مسلوب الاختیار ہوتا ہے وہی بے بسی اور مسلوب الاختیاری وہ اللہ تعالیٰ کے احکام و اوامر کے آگے اختیار کر لیتا ہے، اور اللہ تعالیٰ نے اسے جو آزادی بخشی ہے اپنی خوشی سے اسے اللہ کی مرضی کے ماتحت کر دیتا ہے۔ سورج اور چاند، ابر و ہوا، دریا اور پہاڑ مجبورانہ خدا کی اطاعت کرتے ہیں۔ یہ مہاروں میں بندھی ہوئی اونٹنیوں کے مانند اپنے متعین راستوں پر چلتے ہیں۔ لیکن مومن انسان خود اپنے ہاتھوں سے اپنی ناکوں میں نکیل ڈال کر اس قافلہ میں شامل ہو جاتا ہے اور یہی انسان کا اصلی شرف ہے۔ یہی اختیاری انقیاد و اطاعت توحید کی اصلی روح ہے اور جو اس انقیاد میں جتنا ہی کامل ہے وہ اسی قدر توحید میں کامل ہے۔ راہ توحید کے سلوک کا پہلا درجہ یہ ہے کہ انسان اپنے نفس کی بندگی سے چھوٹ کر اپنے آپ کو اللہ کی بندگی میں دیتا ہے، دوسرا درجہ یہ ہے کہ قوم، ملک، وطن اور تمام رسوم و قیود سے آزاد ہو کر خدا کی طرف بھاگتا ہے۔ آخری درجہ یہ ہے کہ خوشی خوشی اس زندگی پر اللہ کے قرب اور اس کی معیت کو ترجیح دیتا ہے۔ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ لَا شَرِیْکَ لَهٗ وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا

اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ۔

اسی طرح توحید کا اجتماعی اثر بھی نہایت گہرا ہے۔ انسانی معاشرت کی بنیاد کامل عدل اور صحیح مساوات پر قائم ہے اور کامل عدل اور صحیح مساوات وحدت اللہ اور وحدت آدم کے بغیر ناممکن ہے۔ دنیا کی موجودہ ابتری اور تباہی کا اصلی سبب یہ ہے کہ جس رفتار سے دنیا کی سائنس نے ترقی کی ہے اس رفتار سے اس کے تمدنی شعور نے ترقی نہیں کی ہے۔ سائنس کی ترقیوں کا تو یہ عالم ہے کہ انسان نے ساری جغرافیائی حدبندیاں توڑ ڈالیں اور اپنی ایجادوں اور مشینوں کے زور سے اس وسیع زمین کو ایک مکان کے صحن کی طرح بنا دیا ہے لیکن دلوں اور دماغوں کی تنگی کا یہ حال ہے کہ ہر قوم کا خدا بھی الگ ہے اور ہر ایک اپنا آدم بھی الگ بنائے ہوئے ہے۔ اگر اس طرح کے انسان کسی طرح اپنی حدبندیوں کو توڑ کر ایک دوسرے کے حدود میں گھس جائیں تو ان میں اس طرح کا جدال و قتال متوقع ہے جس کا ہم آج دنیا کی قوموں میں مشاہدہ کر رہے ہیں۔ ان کی صورتیں انسانوں کی سی ہیں لیکن ان کے دل درندوں کے ہیں۔ ان کو قدرت نے دریاؤں، پہاڑوں اور جنگلوں کی حدبندیوں کے ذریعہ سے الگ الگ کر رکھا تھا، لیکن سائنس نے یہ حدیں توڑ دیں اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ایک دوسرے پر درندوں کی طرح ٹوٹ پڑے ہیں اور ساری دنیا کا امن تاراج ہو گیا ہے۔ جو لوگ ان مشکلات پر غور کر رہے ہیں۔ وہ اس نتیجہ تک تو پہنچ گئے ہیں کہ جن اصولوں پر ہمارے موجودہ تمدن و معاشرت کی عمارت قائم تھی وہ اصول موجودہ دنیا کے لیے ناکافی ہیں۔ یہ بچپن کی لنگوٹی پورے قد کے انسان کے لیے نہایت تنگ ہے اب ضرورت ہے کہ اس کے قامت کے لحاظ سے اس کے لیے نیا جامہ تراشا جائے۔ نسل اور رنگ، وطن اور سرزمین کی اساسات پر جن تمدنوں کی اٹھان ہوئی

تھی اور جو سیاسی تنظیمات وجود میں آئی تھیں ان کے خاتمہ کا وقت آ گیا۔ اب دنیا کو ایک نئے نظم (NEW ORDER) کی تلاش ہے لیکن وہ نیا نظم کیا ہو؟ اس سوال کا کوئی صحیح جواب اب تک نہیں دیا جا سکا۔ بعض کہتے ہیں کہ اب دنیا کو قومی اور ملکی حکومتوں کی جگہ ایک عالم گیر حکومت (WORLD STATE) کی ضرورت ہے۔ جس کی بنیاد عالمگیر انسانیت کے تصور پر ہو۔ لیکن وہ یہ نہیں بتاتے کہ یہ عالمگیر انسانیت کا مبارک تصور وجود میں کس طرح آئے جب کہ قوموں کی افراتفری کا یہ عالم ہے کہ نہ ان میں خدا مشترک ہے نہ آدم؛ ہر قوم کا دعویٰ یہ ہے کہ اَنَا وَلَا غَیْرِیْ ہر ایک کا خدا الگ ہے، اس کی نسل الگ ہے، اس کا باوا آدم الگ ہے، وہ اپنی تہذیب میں، اپنے معتقدات میں، اپنے اخلاق میں بالکل علیحدہ ہے اور اس علیحدگی کو نہ صرف باقی رکھنا چاہتی ہے بلکہ دوسروں پر اس کو بالجبر مسلط بھی کرنا چاہتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب تک دماغوں میں یہ گرہ موجود ہے ان قوموں میں اتحاد کے لیے کوئی مشترک سررشتہ موجود نہیں ہے۔ مشترک سررشتہ صرف ایک ہی ہو سکتا ہے کہ ایک ہی خدا کو سب اپنا خدا مانیں، اسی کے اتارے ہوئے قانون کو سب اپنے لیے شریعت بنائیں اور ایک ہی آدم کے مشترک گھرانے کا سب اپنے آپ کو فرد سمجھیں۔ اس اساس پر بلاشبہ ایک عالمگیر قومیت اور ایک عالمگیر سیاسی تنظیم کی عمارت قائم ہو سکتی ہے اور دنیا کی موجودہ مصیبتوں کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔ اس کے سوا جتنی تدبیریں بھی اس مشکل کو حل کرنے کی اختیار کی جائیں گی وہ رشتہ میں ایک اور گرہ کا اضافہ کریں گی، کسی مشکل کو حل نہیں کریں گی۔

یہی راز ہے کہ قرآن نے (سورۂ نساء کے شروع میں) انسانی معاشرے کی بنیاد دو چیزوں پر قائم کی ہے، مذہب اور خاندان۔ پھر مذہب کی بنیاد توحید پر رکھی، یعنی صرف اللہ کو رب، اور قانون دینے والا مانا جائے، دوسروں کے لیے

اس میں کسی طرح کی حصہ داری نہ ہو۔ اور خاندان کی بنیاد وحدتِ آدم کے تصور پر رکھی یعنی تمام نسل انسانی ایک ہی آدم سے ہے، کسی کو کسی پر فضیلت نہیں حاصل ہے مگر دین اور تقویٰ کی وجہ سے۔ پہلی چیز نے خداؤں اور الٰہوں کے تعدد اور قانون سازی اور حکمرانی کے مدعیوں کے تزاحم سے دنیا کو نجات دی اور دوسری چیز نے خاندان اور نسل ونسب کے سارے گھمنڈوں کو باطل کر دیا۔ سارے انسان ایک خدا کے بندے اور ایک آدم کے بیٹے بن گئے۔ کالے اور گورے عربی اور عجمی میں کوئی فرق نہیں رہا۔ سب کے لیے ایک ہی قانون اور ایک ہی نظام ہے۔ سب کے لیے یکساں امن ہے، یکساں عدل ہے، یکساں جدوجہد کا میدان ہے، یکساں استحقاق ہے اور یکساں ذمہ داری ہے۔ یہاں کسی نسل کے متعلق یہ خیال قائم کر لینا کہ وہ پیدائشی غلام ہے شدید گناہ ہے۔ یہاں ایرین اور سامی نسل کے درمیان کسی قسم کا امتیاز فساد فی الارض ہے۔ یہاں ریڈ انڈین کو محض رنگ کی بنیاد پر حقوق سے محروم کرنا ظلم کبیر ہے۔ اس نظام میں صرف وہ لوگ مساویانہ حقوق سے محروم ہیں جو ان اصولوں کے منکر ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ انسانیت کے، امن وعدل کے دشمن ہیں۔ وہ زمین میں فساد چاہتے ہیں اور انسانی معاشرے کی ان اساسات کو ہدم کر دینا چاہتے ہیں جن سے محروم ہو کر دنیا کبھی چین نہیں حاصل کر سکتی۔

آج جو لوگ دنیا کے لیے نئے نظم کی تلاش میں سرگرداں ہیں وہ جب تک توحید کی حقیقت نہ سمجھ لیں، وہ کوئی ایسی اساس نہیں قائم کر سکتے جس پر تمام عالمِ انسانی کی اخوت کی عمارت قائم ہو سکے۔ انسان کے لیے یہ بات تو بالکل فطری ہے کہ وہ خدا کی بندگی واطاعت کرے۔ یہ بات ایسی ہے جس کی دعوت تمام بنی آدم کو یکساں دی جا سکتی ہے اور ہر سلیم الفطرت انسان، خواہ وہ کسی

قوم و نسل سے تعلق رکھتا ہو بغیر کسی عصبیت کے اس دعوت کو قبول کر سکتا ہے، اس کے اندر فطرت انسانی کے لیے ایک قدرتی کشش ہے۔ آفاق و انفس دونوں میں اس کی ناقابلِ انکار شہادتیں موجود ہیں۔ باقی اس کے سوا جتنے بھی دعوے ہیں سب دعاوی جاہلیت کے حکم میں داخل ہیں۔ فطرت انسانی کے اندر ان کے لیے نہ تو کوئی اپیل ہے نہ کائنات کے نظام سے ان کو ہم آہنگی حاصل ہے۔ اگر ان میں سے کسی نظریے کو بھی بالجبر دنیا پر مسلط کرنے کی کوشش کی گئی تو لازماً دنیا کا مزاج اس کو اگلنے کی کوشش کرے گا اور اس کا نتیجہ یا تو یہ ہوگا کہ کوشش ناکام ہوگی یا کامیاب ہوگی تو اس کی حیثیت حلق کی پھانس کی ہوگی اور زمین کے ادیانِ باطلہ میں ایک دین باطل کا اور اضافہ ہو جائے گا۔

---

# توحید کی اہمیت دین میں

پچھلے مباحث کو جن لوگوں نے غور سے پڑھا ہے ان سے یہ حقیقت مخفی نہیں رہی کہ نظامِ دین میں توحید کو وہی جگہ حاصل ہے جو جسمِ انسانی میں دل کو حاصل ہے۔ اگر دل بیمار ہے تو سارا جسم بیمار ہے اور اگر دل تندرست ہے تو سارا جسم تندرست ہے۔ یہی راز کہ توحید کے بغیر آدمی کا کوئی عمل مقبول نہیں ہے اور توحید کے ساتھ ہر غلطی کے بخشے جانے کی توقع ہے چنانچہ فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ شرک کو معاف نہیں فرمائے گا اور اس کے سوا جو کچھ ہے جس کے لیے چاہے گا معاف فرمائے گا۔

توحید کی اس اہمیت کی وجہ یہ ہے کہ سارے دین کی عمارت تین چیزوں پر قائم ہے۔ توحید، رسالت، معاد۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ توحید سارے دین کا ایک ثلث ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سورۂ اخلاص کو جو خالص بد کی سورہ ہے ثلث قرآن کہا گیا ہے۔ لیکن اگر مزید غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ رسالت اور معاد بھی توحید کے تحت آتے ہیں۔ رسالت کا جزوِ توحید ہونا یوں ثابت ہے کہ خدا ہی کو شارع اور قانون ساز ماننا بھی توحید کے مقتضیات میں سے ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے احکام و قوانین اپنے رسول کے ذریعہ سے بھیجتا ہے۔ اس مسئلہ پر ہم مفصل بحث اپنی کتاب "حقیقت رسالت" میں کریں گے اور وضاحت کے ساتھ لَا اِلٰہَ کے ساتھ محمد رسول اللہ کے تعلق کی تشریح کریں گے۔ وہاں یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو جائے گی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول اور زندگی کے

ہر شعبہ میں واجب الاطاعت ماننا توحید کا جزء لاینفک ہے۔ جو شخص اللہ کو واحد کہتا ہے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کی پیروی سے منحرف ہے وہ قطعی مشرک ہے۔ اس کو توحید سے کوئی سروکار نہیں ہے۔

باقی رہا معاد کا مسئلہ تو وہ توحید کے تحت مختلف پہلوؤں سے داخل ہے ہم اپنے رسالہ حقیقت معادؔ میں تفصیل کے ساتھ بیان کریں گے کہ معاد خدا کے صفات کا لازمی اقتضاء ہے۔ یہاں صرف اس بات کو یاد رکھنا چاہیے کہ معاد کی ساری روح توحید ہے۔ جو لوگ معاد کے قائل ہیں لیکن ساتھ ہی شرکاء و شفعاء کو بھی مانتے ہیں، جو ان کے زعم کے مطابق ان کو بخشوالیں گے، ان کے لیے معاد کا عقیدہ بالکل بے جان ہے۔ وہ خدا کے سامنے جوابدہی کی ذمہ داری اور اس کے قانونِ عدل کے ظہور سے ویسے ہی بے خوف ہو جاتے ہیں جیسے معاد کے منکرین۔ چنانچہ اہل عرب اور یہود و نصاریٰ کا یہی حال تھا۔ انھوں نے معاد کی ساری اہمیت شفاعت و کفارہ کے عقیدہ سے باطل کر دی تھی اور یہی حال مسلمانوں کے مبتدع گروہوں کا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں توحید اور معاد کا بیان اکثر ساتھ ساتھ ہوتا ہے۔ کیونکہ معاد کی ساری حقیقت ہوا ہو جائے اگر توحید کے تصور میں ذرا بھی خلل واقع ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ دین کا سارا نظام توحید سے روشن ہے۔ اس جسم کی روح اور اس آنکھ کی پتلی توحید ہی ہے۔ اس کے بغیر نہ کوئی عقیدہ مؤثر ہے نہ کوئی عمل مثمر۔ یہیں سے دین کا پہلا قدم اٹھتا ہے اور پھر یہیں اس کا آخری قدم پڑتا ہے۔ یہ دین کا دائرہ ہے اور دین اسی وقت تک محفوظ ہے جب تک اس دائرہ کے اندر ہے۔ یہی نکتہ ہے کہ سورۂ بنی اسرائیل میں جہاں دینِ فطرت کے احکام و قوانین کی تعلیم

---

؎ افسوس ہے کہ یہ رسالہ بھی میں اب تک نہ لکھ سکا۔

دی ہے اس کا آغاز لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ (اللہ کے ساتھ کسی دوسرے کو شریک نہ کر) سے کیا اور پھر ساری باتیں بیان کرنے کے بعد فرمایا کہ ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ وَلَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ[1] (یہ باتیں اس حکمت میں سے ہیں جو تیرے رب نے تیری طرف وحی کی ہیں اور اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود کو شریک نہ کر) اس سے معلوم ہوا کہ دین کا آغاز اور دین کی انتہا دونوں توحید ہے اور شرائع و احکام در حقیقت توحید کامل تک پہنچنے کے وسائل و ذرائع ہیں۔

توحید کی اسی اہمیت کی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا میں جتنے انبیاء آئے سب نے اپنی دعوت کا آغاز توحید سے کیا۔ اور اس نقطہ پر اس طرح جمے کہ کسی حال میں اس سے بال برابر سرکنے پر راضی نہ ہوئے۔ مخالفین نے لاکھ چاہا کہ پیغمبر اس معاملہ میں تھوڑی سی مداہنت گوارا کرلے، ذرا اپنے رویہ میں نرم ہو جائے، کم از کم ان کے بتوں کی تحقیر ہی سے باز آجائے تو آگے بڑھ کر اس سے سمجھوتہ کرلیں (وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ) لیکن پیغمبر نے ایک لمحہ کے لیے اس میں کسی قسم کی نرمی گوارا نہیں کی۔ انھوں نے مخالفتوں سے اس کو ڈرانا چاہا اور وہ سب کچھ کر ڈالا جو ان کے بس میں تھا۔ لیکن اس کو اس کی جگہ سے ہلا نہ سکے۔ انھوں نے ترغیب کے پھندے ڈالے اور رشوت میں وہ سب کچھ پیش کیا جو کر سکتے تھے۔ لیکن اسے رام نہ کر سکے۔ معزز ترین گھرانے میں شادی، دولت کے ڈھیر، سرداری، سرداری، ساری ہی چیزیں پیش کی گئیں، لیکن ان ساری ترغیبوں کے جواب میں ان کے سامنے وہی توحید کی دعوت پیش کی گئی۔ جب ان تدبیروں میں ناکام رہے تو مخالفین نے آخری حربہ اٹھا لیا اور پیغمبر اور اس کے ساتھیوں کو مجبور کر دیا کہ وہ اپنے گھر کو، اپنے اعزہ کو، اپنے خاندان کو، اپنی املاک و جائداد کو اور اپنے

---

[1] دیکھو آیات ۲۲-۲۹ بنی اسرائیل۔

ملک و وطن کو چھوڑ دیں۔ خدا کے ہر نبی نے اس کو بھی گوارا کر لیا۔ قرآن ہمارے سامنے موجود ہے۔ اس میں تمام انبیاء کرام کی ہجرت کی سرگزشتیں بیان کی گئی ہیں۔ ان کو پڑھو۔ ہر نبی کی زبان پر اپنی قوم کو چھوڑتے وقت جو آخری کلمہ جاری ہوتا ہے وہ توحید کا کلمہ ہوتا ہے۔ یہی چیز ہے جس کے لیے وہ سب کچھ چھوڑتا ہے اور سب کو چھوڑ کر تنہا یہی چیز ہے جس کو اپنی معیت و رفاقت کے لیے منتخب کرتا ہے۔ غور کرو۔ ایسا کیوں ہے؟ کیا بات ہے کہ انسان سب کو چھوڑ دے مگر توحید پر حرف نہ آنے دے؟ بدر میں باپ نے بیٹے پر، چچا نے بھتیجے پر، ماموں نے بھانجے پر، بھائی نے بھائی پر توحید کی خاطر تلوار چلائی۔ اس کے لیے بیویوں نے شوہروں سے اور شوہروں نے بیویوں سے جدائی اختیار کر لی۔ عزیز سے عزیز قرابتوں اور محکم سے محکم روابط پر قینچی چل گئی اور ان لوگوں کے ہاتھوں سے چل گئی جو انسانیت کے گل سرسبد تھے، جو رحم و محبت اور اخلاص و وفا کے پیکر تھے، جن سے بڑھ کر اپنی قوم سے، اپنے قبیلہ سے، اپنے عزیزوں سے اور پھر عام انسانوں سے محبت کرنے والے لوگ اس زمین پر پیدا نہیں ہو سکتے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کے کچھ لوگ جب گوسالہ پرستی کے مرتکب ہوتے ہیں تو وہ حکم دیتے ہیں کہ جس قبیلہ کا مجرم ہے اسی قبیلہ کے لوگ اسے قتل کر دیں (اُقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ) اور بدر کے قیدیوں کے متعلق فاروق اعظم رضی اللہ عنہ یہ مشورہ دیتے ہیں کہ ہر شخص اپنے عزیز پر خود اپنے ہاتھ سے تلوار چلائے (اللہ اکبر!) توحید کا حق یہ ہے کہ آدمی کا ایک ہاتھ اگر اس کی حرمت کو بٹہ لگائے تو اس کا دوسرا ہاتھ اس سے انتقام لینے میں ذرہ برابر رحم و مروت کو دخل نہ دے۔

توحید کی اس عظمت کی وجہ وہی ہے جو اوپر کی مختلف فصلوں میں بیان ہو

چکی ہے۔ توحید سب سے بڑے حق یعنی خدا کے حق کا اقرار ہے۔ یہی عدل و قسط کی بنیاد ہے۔ جو شخص اس حق کو نہیں پہچانتا وہ کسی کے بھی حق کو نہیں پہچان سکتا۔ یہاں تک کہ وہ اپنے نفس کے حق کو بھی نہیں پہچانتا۔ اس سے اسی طرح کی ناانصافیاں اور تعدیاں ظہور میں آئیں گی جیسی کہ موجودہ زمانہ کے ظالم اور ناشکر گزار انسانوں سے ظہور میں آرہی ہیں، اور جس کی طرف ہم نے پچھلی فصل میں اجمالی اشارہ کیا ہے۔ پس انبیاء کرام جو یکسر حق اور انصاف کی دعوت ہوتے ہیں وہ توحید کے معاملہ میں کسی قسم کی مداہنت کیونکر گوارا کر سکتے ہیں. جب کہ توحید ہی تمام حقوق کی بنیاد ہے۔ وہ اس معاملہ میں نہ باپ کو معاف کر سکتے نہ چچا کو، نہ بیٹے کو، نہ بیوی کو۔ جو چیز بھی اس حق کی ادائیگی میں مانع ہو، وہ ایک پتھر ہے اور ضروری ہے کہ اس پتھر کو راہ سے ہٹا دیا جائے۔

پس انبیائے کرام کی ساری جد و جہد کا مقصود توحید خالص کا قیام ہے۔ وہ دنیا میں اسی لیے آتے ہیں کہ خدا کے بندوں کو دوسروں کی بندگی سے چھڑا کر خالص خدا کا بندہ بنا دیں۔ وہ اسی کو خالق مانیں، اسی کو بادشاہ کہیں، اسی کی بندگی کریں، اسی کی اطاعت کریں، اسی پر اعتماد و توکل کریں، اسی سے طالب مدد ہوں۔ نعمت ملے تو اسی کا شکر ادا کریں، مصیبت آئے تو اسی سے استغاثہ کریں۔ طمع ہو یا خوف، امید ہو یا بیم، ہر حال میں ان کی نظر اسی کی طرف ہو۔ وہ اپنے تئیں بالکلیہ اس کے حوالہ کر دیں۔ ان کی محبت اس کی محبت کے تابع، ان کی پسند اس کی پسند کے تحت ہو۔ اس کی ذات میں، اس کی صفات میں، اس کے حقوق میں اس کی یکتائی تسلیم کریں اور کسی پہلو سے ان چیزوں میں کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں۔ نہ کسی فرشتے کو، نہ کسی جن کو، نہ کسی نبی کو، نہ کسی ولی کو، نہ کسی اور کو، نہ اپنی ذات کو۔

توحید کی یہ حقیقت واضح ہو جانے کے بعد یہ بات بالکل صاف ہو گئی کہ اصل حقیقت کے اعتبار سے توحید دین کا صرف ایک جز نہیں ہے بلکہ یہ سارے دین کو محیط ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس کے معنی یہ ہیں کہ توحید سے باہر دین کا تصوّر نہیں کیا جا سکتا۔ خدا کے انبیاء یہیں سے اپنا کام شروع کرتے ہیں اور اسی پر ختم کرتے ہیں۔ یہی راز ہے کہ قرآن مجید توحید سے شروع ہوتا ہے اور توحید ہی پر ختم ہوتا ہے۔ قرآن کی پہلی سورہ فاتحہ ہے جس کی اصلی روح خدا کی خالص شکر گزاری اور کامل تفویض و تسلیم ہے اور آخر میں سورۂ نصر میں فتح مکہ کی بشارت اور سورۂ تبّت میں باطل کی شکست کی پیشین گوئی کے بعد سورۂ اخلاص رکھی گئی جو خالص توحید کی سورہ ہے۔ یہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ دین کا مرکزی نقطہ توحید ہے اور اب دین اپنے مرکز پر پہنچ گیا۔ اس کے بعد معوذتین قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ رکھ دی گئی ہیں جو شیطان کی آفتوں سے اس خزانۂ توحید کی حفاظت کر رہی ہیں کیونکہ یہ معلوم ہے کہ شیطان کو بنی آدم سے جو حسد ہے اس حسد کے جوش میں اس کی سب سے بڑی کوشش یہ ہے کہ انسان کو توحید کے نقطہ سے ہٹا دے چنانچہ اسی وجہ سے اس نے کہا۔ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ (میں ان کے لیے تیری سیدھی راہ پر گھات میں بیٹھوں گا) یعنی ان کو توحید کے رستہ پر قائم نہ رہنے دوں گا وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ۔ (اور تو ان میں سے اکثر کو اپنا شکر گزار نہ پائے گا) یعنی وہ شرک میں مبتلا ہو جائیں گے۔

---

# حقیقتِ تقویٰ

اس حقیقت کے واضح ہو جانے کے بعد یہ بات بالکل صاف ہو گئی کہ [illegible] کے اعتبار سے توحید دین کا صرف ایک جز نہیں ہے بلکہ یہ سارے دین کا خلاصہ ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس کے معنی یہ ہیں کہ توحید سے باہر دین کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ خدا کے انبیاء یہیں سے اپنا کام شروع کرتے ہیں اور یہیں ختم کرتے ہیں۔ یہی راز ہے کہ قرآن مجید توحید سے شروع ہوتا ہے اور توحید ہی پر ختم ہوتا ہے۔ قرآن کی پہلی سورہ فاتحہ ہے جس کی اصل روح خدا کی الوہیت کا اقرار اور اس کے آگے کامل تسلیم ہے اور آخر میں سورۂ نصر میں فتح کی خوشخبری ہے [illegible] سورۂ لہب میں باطل کی شکست کی پیشین گوئی کے بعد سورۂ اخلاص رکھی گئی ہے جو خالص توحید کی سورہ ہے۔ یہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ دین [illegible] توحید [illegible] ختم ہو گیا۔ اس کے بعد معوذتین [illegible] جو شیطان کی آفتوں سے اس توحید کی حفاظت کرتی ہیں [illegible] معلوم ہوتا ہے کہ شیطان [illegible] سب سے بڑی کوشش یہ ہے کہ انسان کو توحید کے نقطے سے ہٹا دے۔ چنانچہ اسی وجہ سے اس نے رب [illegible] لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ (میں ان کے لیے تیری سیدھی راہ پر گھات میں بیٹھوں گا) [illegible] وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ [illegible] (اور تو ان میں سے اکثر کو شکر گزار نہ پائے گا) یعنی وہ شرک میں مبتلا ہو جائیں گے۔

---

# فہرست مضامین

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

# تقویٰ کی حقیقت قرآن کی روشنی میں

**تقویٰ کے متعلق غلط تصورات** آج جن مواقع پر تقویٰ کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے یا جن لوگوں کو متقی سمجھا جاتا ہے اگر تجزیہ کر کے ان کا قدر مشترک نکالا جائے تو تقویٰ کے متعلق چند چیزیں لازماً سامنے آئیں گی۔ مثلاً یہ کہ تقویٰ ایک ایسا درجہ ہے جس کے لیے اتباع شریعت اور حفاظت حدودِ الٰہی کی عام جدوجہد کے سوا کچھ اور بھی مطلوب ہے اور یہ کچھ اور" اس قدر اہمیت رکھتا ہے کہ اس کے آگے خود شریعت کے فرائض و حدود اور اس کے قیام و حفاظت کی ذمہ داریاں بہت ہلکی ہو گئی ہیں۔ آپ کو بہت سے ایسے لوگ ملیں گے جن کی ساری ذہنی و عملی قوتیں ایسے کاموں پر صرف ہو رہی ہیں جو نہ صرف یہ کہ اللہ اور اس کے رسول کی شریعت کی نظر میں کوئی قیمت نہیں رکھتے بلکہ ان کاموں کی کامیابی اور ترقی اللہ اور اس کے رسول کے دین کی پستی اور بربادی کے ہم معنی ہے لیکن اس کے باوجود ان کے تقویٰ میں کوئی فتور واقع نہیں ہوتا اور وہ اپنے اس "کچھ اور" کی بدولت بدستور نہ صرف متقی بنے ہوئے ہیں بلکہ برابر تقویٰ کے مدارج و مقامات میں ترقی کرتے چلے جا رہے ہیں۔

اسی طرح تقویٰ کے لوازم میں سے یہ بات بھی سمجھی جاتی ہے کہ اس کا حصول کسی صاحب نسبت بزرگ سے بیعت و ارادت کے بغیر ممکن نہیں ہے

اور یہ چیز اس قدر ضروری خیال کی جاتی ہے کہ اگر کوئی شخص کسی خانقاہ کی سند حاصل کیے بغیر لوگوں کو اللہ اور اس کے رسول کی بتائی ہوئی باتیں سکھانا اور بتانا شروع کر دے تو لوگوں کی نظر میں یہ بات اسی طرح کھٹکنے لگتی ہے جس طرح کوئی شخص کسی طبیہ کالج کی سند حاصل کیے بغیر کسی شہر میں مریضوں کا علاج شروع کر دے۔ بلکہ ایک عطائی، اگر اس کے علاج سے لوگوں کو فائدہ پہنچ رہا ہو، آہستہ آہستہ گوارا کر لیا جاتا ہے لیکن اصلاح نفوس اور تزکیۂ اخلاق ارباب خانقاہ کا ایسا اجارہ ہے کہ بغیر ان کی سند کے کوئی شخص اس کام کا اہل ہو ہی نہیں ہو سکتا، اگرچہ اس کی تعلیم و دعوت سے دلوں میں کتنا ہی بڑا انقلاب برپا ہو جائے۔

اسی طرح یہ بات بھی تقویٰ کے لوازم میں سے سمجھی جاتی ہے کہ آدمی نہ صرف محرمات و مشتبہات کا تارک ہو بلکہ بہت سے مباحات کا بھی تارک ہو اور ستم ظریفی یہ ہے کہ منہیات میں اصلی اہتمام صرف ان چیزوں کا کیا جاتا ہے جن کی حیثیت اصل دین میں محض ضمنی ہے۔ لیکن ان پر اس شد و مد سے وعظ کہے جاتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے اصل دین یہی چیزیں ہیں اور بہت سی ایسی باتیں جو صریحاً خدا اور اس کے رسول سے بغاوت کے حکم میں داخل ہیں نہ صرف یہ کہ ان پر ان بزرگوں کی طبائع میں کوئی خلش تک پیدا نہیں ہوتی بلکہ ان چیزوں کو اسلام کی ترقی کے اجزا میں سے گنا جاتا ہے اور بسا اوقات ان کے حصول کے لیے ہماری خانقاہوں میں دعائیں کی جاتی ہیں۔ مثلاً ہم نے دیکھا ہے کہ جن لوگوں کو ازار کے ٹخنوں سے نیچے ہونے اور ڈاڑھی اور لب کے مسائل میں بڑا انہماک ہے وہ رات دن طاغوت کے تقرب کی طلب اور اس کے لیے دعائیں اور سفارشیں کرنے میں ذرہ برابر بھی قباحت نہیں محسوس کرتے لیکن یہ

محض اس جُرم پر ایک شخص کو تقویٰ کے معیار سے گرا دیتے ہیں کہ مباحات سے فائدہ اٹھانے میں ان کی طرح زاہد خشک یا بے قرینہ نہیں ہے۔ اگرچہ وہ نہ صرف محرمات ہی کا تارک ہو بلکہ مشتبہات میں بھی احتیاط کرتا ہو۔ اور کوئی بات اس کی زندگی میں ایسی نہ ہو جس کو خدا اور اس کے رسول کی شریعت سے انحراف یا بغاوت قرار دیا جا سکے۔

علیٰ ہذا القیاس تقویٰ کے شرائط میں سے یہ بات بھی سمجھی جاتی ہے کہ یہ تجرد اور ترک دُنیا سے مناسبت رکھتا ہے اور خلوت کے گوشوں اور تنہائی کے حجروں ہی میں پرورش پا سکتا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ آدمی زندگی کی تمام عملی سرگرمیوں سے الگ تھلگ اور خلائق سے منقطع ہو کر یادِ الٰہی میں مشغول رہے۔ یہاں تک کہ اگر ایک شخص کی زندگی دین کی حُجت واضح کرنے اور اس کی اقامت کے لیے کشمکش میں بسر ہو رہی ہو تو ہمارے تقویٰ کی موجودہ سائنس کے ماہرین کے نزدیک اس کا یہ مشغلہ بھی حصُول تقویٰ کی جدوجہد میں مخل ہے اور اس سے کچھ فائدہ حاصل ہونا تو الگ رہا بہت زیادہ اندیشہ اس بات کا ہے کہ اس کشمکش میں اس کی رہی سہی خُوبیاں بھی برباد ہو جائیں۔ ان حضرات کے نزدیک اعلیٰ طریقہ تو یہ ہے کہ آدمی پوری زندگی ریاضت و مراقبہ میں گزار دے ورنہ کم از کم ایک طویل مدت تو اس شغل تنہائی میں بسر کیے بغیر آدمی کے لیے عملی میدان میں اُترنا بہر صُورت خطرہ سے خالی نہیں ہے۔ یہ حضرات اس بات کے قائل نہیں ہیں کہ بچہ کی ترقی کے لیے اس کی فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ ماں کی گود سے اُترے، زمین میں رینگے، کھڑے ہونے کی کوشش کرے، کھڑا ہو، لڑکھڑائے، گرے پھر دوڑنے لگے، وہ اس کے برعکس اس بات کے قائل ہیں کہ بچہ ولادت سے لے کر سن رشد تک ماں باپ

کے کندھوں پر لدا لدا پھرے اور جب چالیس برس کی اس پختہ استعداد مادی و عقلی کو پہنچ جائے جس کو قرآن حکیم نے حتیٰ اذا بلغ اشدہ وبلغ اربعین سنۃ سے تعبیر کیا ہے تو اس کو دفعتہً کارزار حیات میں جھونک دیا جائے کہ اب تو جا اس کے نشیب و فراز اور سرد و گرم سے خود عہدہ برا ہو کیونکہ پورے چالیس سال مادر مشفقہ کی محفوظ آغوش میں اس کارزار میں اترنے کے لیے تربیت حاصل کر چکا ہے۔

اسی طرح اہل تقویٰ کی ایک خاص پہچان یہ بھی بتائی جاتی ہے کہ وہ نہ صرف صاحب تاثیر بلکہ صاحب تسخیر ہوتے ہیں۔ ان کی ایک نگاہ دلوں کو بدل دینے کے لیے کافی ہوتی ہے، ان کے ایک ادنیٰ اشارے سے وہ کام بن جاتے ہیں جو دوسروں کی برسوں کی جانکاہیوں سے بھی نہیں بنتے۔ شقی سے شقی انسان ان کی صحبت میں آتے ہی مومن کامل ہو جاتا ہے۔ وہ جدھر سے گزر جاتے ہیں ادھر کی دنیا نور ایمان سے جگمگا اٹھتی ہے۔ وہ نہ زبان سے بولتے، نہ قلم سے لکھتے اور نہ اس طرح کی کوئی اور ہی بات کرتے، محض ان کے فیض باطن کا یہ اثر ہوتا ہے کہ ان کے سایہ کے پرتو سے کفر و باطل بھاگتا ہے، اس طرح کے خیالات جن لوگوں کے دماغوں پر چھائے ہوئے ہیں بھلا ان کی نظر میں وہ لوگ کیا جگہ پا سکتے ہیں جو باطنی تصرفات کے بجائے اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے عام قانون کے مطابق کام کرتے ہیں اور اس کی راہ میں انھی ہتھیاروں سے لڑتے ہیں جو اس نے کوشش اور جد و جہد کے لیے عنایت فرمائے ہیں بلکہ شاید حضرات انبیائے کرام اور صحابۂ عظام کی بھی ان کی نظروں میں کوئی وقعت نہیں ہو سکتی کیونکہ ان حضرات کو بھی نہ درجہ نصیب نہ ہو سکا کہ ایک نگاہ سے دلوں کی کایا پلٹ دیتے۔ ان کا بھی یہ حال تھا کہ برسوں کی محنتوں، دعوتوں، مزاحمتوں، مخالفتوں

ناکامیوں اور پامالیوں کے بعد جب نوبت یہاں تک پہنچی کہ رسول اور اس کے تمام ساتھی پکار اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی تب اللہ تعالیٰ نے ان کی صدا میں تاثیر اور ان کی دعوت میں قوت عطا فرمائی۔

جو لوگ آج تقویٰ کا لفظ بولتے ہیں ان کے ذہنوں میں یہ سارے مفاہیم یا ان کا بڑا حصہ مضمر ہوتا ہے۔ تقویٰ کے یہ متعلقات نہ تو کل کے کل غلط ہی ہیں نہ ان سب کو درست ہی قرار دیا جا سکتا ہے بلکہ اس میں صحیح اور غلط دونوں ملے جلے ہیں۔ لہٰذا ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب کی روشنی میں اس لفظ کی حقیقت سمجھنے کی کوشش کی جائے اور اپنے ذاتی رجحانات کی جنبہ داری کے بغیر معلوم کیا جائے کہ تقویٰ کی حقیقت اور اس کے شرائط و خصوصیات کیا ہیں۔

**تقویٰ کا لغوی مفہوم** عربی زبان میں وقی یقی کے معنی ہیں کسی شے کی ضرر سے اپنے تئیں بچانا۔ اسی سے اتّقاء ہے جو قرآن مجید میں کئی معنوں کے لیے استعمال ہوا ہے۔

۱۔ جس چیز سے نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو اس سے محفوظ رہنا مثلاً اِلَّا اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً (مگر یہ کہ تم ان سے بچو جیسا کہ بچنا چاہیے)

۲۔ کسی آفت سے ڈرنا مثلاً وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَاۤصَّةً (اس فتنہ سے ڈرو جو تم میں سے خاص طور پر انہی لوگوں کو نہیں پکڑے گا جنھوں نے ظلم کیا ہوگا)

۳۔ خدائے پاک و منعم کے حضور اظہار خشیت، جو اپنے شکر گزار بندوں پر رحم فرماتا ہے، کفر و ناسپاسی کو ناپسند کرتا ہے اور تمام ڈھکے چھپے سے واقف ہے مثلاً اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا وَّيُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ (اگر تم اللہ سے ڈرو گے تو اللہ تم کو حق و باطل کا امتیاز بخشے گا اور تمھارے گناہوں کو دور کرے گا)

(۴) چوتھا مفہوم ان تینوں مفہوموں کا جامع ہے یعنی اس کے حدود کو توڑنے، اس کی امانتوں میں خیانت کرنے اور اس کے عہد کی بے حرمتی کرنے سے اس کے بُرے نتائج اور خدا کے غضب کے اندیشہ کی بنا پر بچنا۔ قرآن میں جہاں کہیں مفعول کے بغیر یہ لفظ آتا ہے بالعموم یہی جامع معنی مراد ہوتے ہیں اور اسی کی دوسری تعبیر تقویٰ ہے۔ اس مفہوم پر آگے چل کر ہم مفصل بحث کریں گے۔ یہاں صرف اس قدر یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ اس معنی کے لحاظ سے متقی وہ شخص ہے جس کے دل میں خدا کی تعظیم اور اس کے غضب کا اندیشہ ہو اور وہ خدا کے قائم کیے ہوئے حدود کو توڑنے، اس کے عہد و میثاق کی خلاف ورزی کرنے اور اس کی امانتوں میں خیانت کرنے سے ڈرتا ہو۔

**تقویٰ بحیثیت ایک عالمگیر حقیقت کے** اس کائنات میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جتنی چیزیں بنائی ہیں۔ ان میں دو طرح کی قوتیں ودیعت فرمائی ہیں۔ ایک اپنی مخفی قابلیتوں کو بروئے کار لانے کی قوت، دوسری اپنی حفاظت کی قوت۔ پہلی قوت کا تقاضا اقدام اور عمل ہے اور اس کا نتیجہ ہر شے کا اپنی اس غایت تک پہنچنا ہے جس کے لیے وہ خلق ہوئی ہے۔ دوسری قوت کا تقاضا احجام و احتراز ہے اور اس کا ثمرہ ہر شے کا ان خطرات سے محفوظ رہنا ہے جو اس کو اس کی غایت تک پہنچنے سے پہلے برباد کر سکتے ہیں۔ پہلی قوت ہر شے کی مخفی صلاحیتوں کو ابھارتی اور اس کو پروان چڑھاتی ہے۔ دوسری قوت خطرات و آفات سے اس کی حفاظت کرتی ہے۔ اس کو مثال سے یوں سمجھ سکتے ہیں کہ ایک اچھا موٹر ہو اور اس کے اندر نہایت سچا بریک لگا ہوا ہو۔ موٹر میں کچھ پرزے تو ہوتے ہیں جن کے باہمی تفاعل سے وہ قوت پیدا ہوتی ہے جو گاڑی کو ہوا کی رفتار سے چلاتی ہے اور یہ قوت ہی گاڑی کا اصلی جوہر ہے۔ لیکن اگر تنہا یہی

قوت کارفرما ہو تو نہیں معلوم گاڑی کس کھڈ میں گر کر اور کس درخت سے ٹکرا کر چکنا چور ہو جائے۔ اس وجہ سے اس میں ایک بریک لگایا جاتا ہے جو اس کی قوت کو اپنے ضبط و نظم میں رکھتا ہے اور گاڑی کو اپنی حفاظت میں لے کر اس کی منزلِ مقصود تک پہنچاتا ہے۔ یہ بریک اس کائنات کی ہر قوت اور ہر حرکت کے ساتھ لگا ہوا ہے اور اسی سے اس دنیا کی زندگی اور حفاظت ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو یہ دنیا اور اس دنیا کی ساری چیزیں آن کی آن میں پاش پاش ہو کر فنا ہو جائیں۔

اس قوت و صلاحیت کو اس کائنات کے مختلف گوشوں میں ہم مختلف ناموں سے تعبیر کرتے ہیں۔ کہیں یہ حفاظت ذات کے نام سے موسوم ہے، کہیں تقویٰ کے نام سے۔ لیکن یہ محض تعبیر کا اختلاف ہے نفس حقیقت کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔ ایک ہی حقیقت ہے جس کا مسمیٰ تھوڑے تھوڑے سے فرق کے ساتھ اس کائنات کی ہر چیز میں، اس زمین کے ہر جاندار میں، اس دنیا کے ہر انسان میں پایا جاتا ہے اور ہر جگہ اس کے افعال و اثرات تقریباً ایک ہی سے ہیں۔ اس وجہ سے تقویٰ کی اصلی اہمیت اس کا اصلی موقع و محل اور اس کے واقعی افعال و اثرات کی وضاحت کے لیے بہتر ہو گا کہ اس کائنات کے مختلف گوشوں میں اس کی مختلف صورتوں کا مشاہدہ کر لیا جائے۔ یعنی یہ دیکھ لیا جائے کہ آفاق میں جو تقویٰ پایا جاتا ہے اس کی شکل و صورت کیا ہے، حیوانات کے اندر اس کی نوعیت کیا ہے، انسانوں کی فطرت میں اس کی حقیقت کیا ہے؟ اس طرح جب ہم آفاقی، جبلی اور فطری تقویٰ کی مختلف صورتوں اور ان کے افعال و اثرات سے اچھی طرح آشنا ہو جائیں گے تو ہم کو یہ سمجھنے میں کچھ زیادہ دقت نہیں ہو گی کہ شریعت ہم سے جس تقویٰ کا مطالبہ کرتی ہے اس کی شکل و صورت اور اس کے افعال و اثرات کیا ہونے چاہئیں اور پھر جو کچھ ہونا چاہیے اگر اس کی تصدیق اللہ تعالیٰ کی

کتاب اور اس کے رسول کی زندگی اور اس کے ساتھیوں کے حالات سے بھی ہو جائے تو یقین کر لینا چاہیے کہ یہی حق ہے اور اس کے سوا اس کے جو لوازم و تضمنات بیان کیے جاتے ہیں ان کی اصل نہ تو عقل و فطرت کے اندر ہے، نہ اللہ کی کتاب میں ہے اور نہ رسول کی سنت میں۔ اب ہم بالترتیب تقویٰ کی ان مختلف قسموں کی وضاحت کرتے ہیں۔

**تقویٰ آفاق میں** | سب سے پہلے اس تقویٰ کا مشاہدہ کائنات کے ان گوشوں میں ہوتا ہے جہاں ہم کسی ارادہ اور زندگی کا شعور نہیں پاتے بلکہ قدرت کا ایک بندھا ٹکا نظام ہے جس کے ماتحت ہر چیز اپنی پوری قوت کے ساتھ اپنا فعل کر رہی ہے۔ یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ جہاں تک کسی شے کے طبعی وظیفہ کا تعلق ہے اس کی تکمیل کی راہ میں کوئی مزاحمت نہیں ہے بلکہ قدرت اس کو اس بات کی پوری اجازت دیتی ہے کہ جہاں تک وہ بڑھ سکتی ہے وہاں تک بڑھے اور جس منزل تک پہنچ سکتی ہے وہاں تک پہنچے لیکن ساتھ ہی ایک مخفی ہاتھ اس کی باگیں تھامے ہوئے پوری ہوشیاری کے ساتھ اس امر کی نگرانی بھی کر رہا ہے کہ یہ اپنی راہ سے بے راہ نہ ہونے پائے اور دوسروں کے حدود میں دراندازی کر کے نہ اپنا کام خراب کرے نہ دوسروں کے کام میں خلل ڈالے۔ یہ آفاق کا تقویٰ ہے۔ اور اسی کی طرف قرآن مجید کی ان آیات میں اشارہ ہے۔

| | |
|---|---|
| وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ | اور سورج اپنے خاص مدار پر حرکت کرتا |
| لَّهَا ذٰلِكَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ | ہے۔ یہ خدائے عزیز و علیم کا ٹھیرایا |
| الْعَلِیْمِ ۝ وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ | ہوا اندازہ ہے اور چاند تو ہم نے اس |
| مَنَازِلَ حَتّٰی عَادَ | کے لیے منزلیں ٹھہرا دی ہیں یہاں تک |
| كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِیْمِ ۝ لَا | کہ وہ کھجور کی پرانی شاخ کے مانند رہ |

| | |
|---|---|
| الشَّمْسُ يَنْبَغِيْ لَهَا اَنْ | جاتا ہے۔ نہ سورج کو یہ حق ہے کہ وہ |
| تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ | چاند کو جالے اور نہ رات ہی دن سے |
| سَابِقُ النَّهَارِ وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ | پہلے نمودار ہو سکتی ہے۔ ہر ایک ایک |
| يَّسْبَحُوْنَ ۔ (یٰسٓ ۳۸ - ۴۰) | خاص مدار میں تیر رہا ہے۔ |

یہی طبعی تقویٰ ہے جو کھاری اور میٹھے سمندروں کو اپنے اپنے حدود کی پاسداری پر مجبور کرتا ہے اور ان کو ایک دوسرے کے حدود میں مداخلت سے روک کر ان کے ان فوائد کی حفاظت کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے ان کے اندر ودلیعت فرمائے ہیں۔

| | |
|---|---|
| مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيَانِ | اس نے چھوڑے ہیں دونوں سمندر |
| بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا | جو ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں اور |
| يَبْغِيَانِ ۔ | ان کے درمیان ایک پردہ ہے جس سے |
| (رحمٰن ۱۹ - ۲۰) | تجاوز نہیں کرتے۔ |

کائنات کی یہ تمام اشیاء اللہ تعالیٰ کی قائم کی ہوئی حدوں کی پوری نگرانی کرتی ہیں اور کسی حال میں بھی ان سے تجاوز کی جرأت نہیں کرتیں۔ یہ ان کا وہ تقویٰ ہے جس کا وہ اپنے عملی نمونہ سے انسان کو درس دیتی ہیں کہ وہ اپنے ارادہ و اختیار کی دنیا میں انہی کی طرح خدا کے قائم کیے ہوئے حدود کا پابند رہے اور اس سے تجاوز کر کے اپنے آپ کو برباد نہ کرے۔ سورۂ رحمان کی آیت ذیل میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔

| | |
|---|---|
| اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ | سورج اور چاند ایک حساب کے ساتھ |
| بِحُسْبَانٍ وَّالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ | گردش کرتے ہیں، تارے اور درخت سجدہ |
| يَسْجُدَانِ ، وَالسَّمَآءَ | کرتے ہیں، اور آسمان کو بلند کیا اور اس |
| رَفَعَهَا وَوَضَعَ | میں ایک میزان رکھی (یہ زبانِ حال سے |

الْمِيْزَانَ اَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيْزَانِ۔ تعلیم دیتے ہیں کہ تم میزان میں عدل سے نہ ہٹو۔

تقویٰ حیوانات میں | بعینہٖ اسی طرح تقویٰ کی نمود ہم اس عالم میں پاتے ہیں جہاں زندگی تو موجود ہے لیکن انسانی اختیار و ارادہ موجود نہیں ہے یعنی حیوانات کے اندر۔ ان کی زندگی کی حفاظت اور ترقی بھی تقویٰ ہی کی بدولت ہے اگرچہ اختیار و ارادہ سے محروم ہونے کی وجہ سے ان کا تقویٰ اختیاری تقویٰ نہیں بلکہ جبلی تقویٰ ہے۔ قدرت نے ہر حیوان کی جبلت کے اندر وہ ساری قابلیتیں ودیعت کر دی ہیں جو ان کی نوعی صفات کے درجۂ کمال تک ترقی کرنے کے لیے ضروری ہیں۔ یہ ترقی جس طرح کی حرکت اور جد و جہد کی طالب ہے وہ بھی ان کے اندر ودیعت ہے اور جس قسم کے سکون کا مطالبہ کرتی ہے وہ بھی ان کو تعلیم کر دیا گیا ہے۔ علی ہذا القیاس جو چیزیں ان کے چرنے چگنے کی ہیں وہ بھی ان کو بتا دی گئی ہیں اور جن چیزوں سے ان کو ڈرنا اور بچنا چاہیے ان کو بھی یہ اچھی طرح جانتے ہیں اور جبلی طور پر ان سے بچتے ہیں اور ان کا یہی جبلی تقویٰ ہے جو ان کا اصلی پاسبان ہے۔ اگر یہ نہ ہوتا تو حیوانات کی کوئی نوع بھی وجود میں آ کر اپنے آپ کو باقی نہ رکھ سکتی۔ ایک مرغی کا ننھا سا بچہ پہلے روز سے جانتا ہے کہ اسے کس طرح اپنی ذات کو نشو و نما دینے کے لیے اپنی ماں کے ساتھ ساتھ پھرنا اور اس کے اشاروں پر دوڑ کر زمین سے غذا کے ذرہ کو چگنا چاہیے اور پھر کس طرح کوے، چیل، شکرے یا بلی کی آہٹ پاتے ہی اس کے پروں کے نیچے چھپ جانا چاہیے۔ گدھا ایک نہایت غبی جانور ہے لیکن اس غباوت کے باوجود وہ بھی اچھی طرح جانتا ہے کہ زمین کی بے شمار نباتات میں سے کون سی گھانسیں ہیں جو اس کے لیے غذائے صالح کا حکم رکھتی ہیں اور کون سی گھانس

ہیں جو اس کے لیے مضر یا مہلک ہیں اور اگر ایک گدھا گدھا ہونے کے باوجود اپنے جبلی تقویٰ میں ایسا کامل ہوتا ہے کہ بھوکا مر جاتا ہے لیکن یہ گوارا نہیں کرتا کہ جبلت نے اس کے لیے جو قاعدے ٹھہرا دیے ہیں اور جو حدود قائم کر دیے ہیں ان کو توڑ کر کوئی ایسی چیز کھالے جو اس کی جبلی شریعت میں حرام ہے۔ منافع کو اختیار کرنے اور نقصانات سے بچنے کی یہی وہ ہدایت ہے جو ہر جاندار کے اندر اللہ تعالیٰ نے ودیعت فرمائی ہے اور جس کی طرف قرآن حکیم کی یہ آیت اشارہ کر رہی ہے۔

| | |
|---|---|
| سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى | اپنے پروردگار برتر کی تسبیح کر جس نے |
| الَّذِي خَلَقَ فَسَوَّى وَ | خلق کیا پھر اس کا تسویہ کیا اور جس نے |
| الَّذِي قَدَّرَ فَهَدَى | اندازہ ٹھہرایا پھر اس کی طرف رہنمائی فرمائی |

**تقویٰ انسان میں** آفاقی اور جبلی تقویٰ کے یہی مخفی اشارات ہیں جو انسان کے اندر آ کر پوری طرح اجاگر ہو جاتے ہیں۔ چیز وہی ہے لیکن انسان کی حیثیت چونکہ مقہور و مسخر اجرام سماوی اور بے اختیار و اتبیاز حیوانات سے بالکل مختلف ہے اس وجہ سے اس کے تقویٰ کی نوعیت اور قدر و قیمت بدل جاتی ہے بلکہ تقویٰ کا نام ہی یہ چیز اس وقت پاتی ہے جب انسان کے اندر پائی جاتی ہے۔ یہ ذی ارادہ اور ذی اختیار مخلوق ہے اس وجہ سے وہ سورج اور چاند کی طرح اپنے تقویٰ کے ساتھ جکڑ کے باندھ نہیں دیا گیا ہے کہ جس ڈگر پر ہانک دیا گیا ہے اس سے منحرف ہی نہ ہو سکے بلکہ اس کی فطرت کے اندر مفید اور مضر کے پہچاننے کا ذوق دے کر اس کو آزاد چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ اپنے ذوق اور اپنی عقل کی رہنمائی سے نافع کو اختیار کرے اور مضر سے احتراز کرے۔ نیز وہ صرف ایک مادی وجود ہی نہیں ہے بلکہ اپنے اندر اخلاقی ہستی بھی رکھتا ہے اس وجہ سے اس کے اندر

صرف مادی مضرتوں ہی سے بچنے کا ذوق نہیں ودیعت کیا گیا ہے بلکہ اخلاقی و روحانی مضرتوں سے احتراز کرنے کا ذوق بھی بخشا گیا ہے۔ چنانچہ ایک طرف تو اس کو اس بات کی طرف ذوق دیا گیا کہ خوب صورت کو پسند کرے اور بدصورت سے احتراز کرے، خوشبو سے محبت اور بدبو سے نفرت کرے، طیب کو حلال اور خبیث کو حرام سمجھے۔ دوسری طرف اس کو اس بات کا بھی ذوق بخشا گیا ہے کہ وہ جھوٹ سے نفرت اور سچ سے محبت کرے، ظلم کو برا سمجھے اور عدل کا احترام کرے۔ یہ انسان کا فطری تقویٰ ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کی فطرت کے اندر ودیعت فرمایا ہے اور قرآن مجید کی متعدد آیات میں اس کی طرف اشارات ہیں۔ مثلاً (ھَدَیْنٰہُ السَّبِیْلَ اِمَّا شَاکِرًا وَّاِمَّا کَفُوْرًا)[1]، (وَھَدَیْنٰہُ النَّجْدَیْنِ)[2]، (فَاَلْھَمَھَا فُجُوْرَھَا وَتَقْوٰھَا)[3] یہی تقویٰ ہے جو انسان کی مادی اور روحانی زندگی کا محافظ ہے۔ اگر انسان اپنی مادی زندگی میں مضرتوں سے احتراز نہ کرے بلکہ گندم کی جگہ کنکریاں پھانکنا شروع کر دے تو اس کا لازمی نتیجہ اس کی مادی زندگی کا خاتمہ ہے اور اگر وہ اپنی اخلاقی زندگی میں مہلکات سے نہ بچے، شکر کی جگہ ناشکری کی راہ چل پڑے تو اس کی روحانی زندگی کی ہلاکت یقینی ہے اگرچہ اس ہلاکت سے اسے اس زندگی کے خاتمہ پر ہی دوچار ہونا پڑے۔

**اوپر کی بحثوں کا خلاصہ** | اس تفصیل سے چند باتیں معلوم ہوئیں۔

۱۔ پہلی یہ کہ تقویٰ ہی ہر شے کی زندگی اور اس کی ترقی کا محافظ ہے۔

۲۔ دوسری یہ کہ تقویٰ زندگی کی اصلی شاہراہ ہے کوئی الگ چیز نہیں ہے بلکہ یہ ہر مرحلہ میں زندگی کے ہم رکاب ہے۔ اس کی حیثیت بدرقہ کی ہے جو انسان

---

[1] ہم نے اس کو راستہ کی ہدایت دی، خواہ وہ شکر گزار بنے یا ناشکر گزار۔ [2] اور ہم نے اس کو دونوں راستوں کی ہدایت دی [3] پس اس کو اس کی نیکی اور بدی الہام کی۔

کو غلط روی اور خطراتِ راہ سے بچاکر منزلِ مقصود تک پہنچاتا ہے۔

۳۔ تیسری یہ کہ کسی مرحلہ میں بھی یہ زندگی کی جد وجہد اور اس کے ارتقائے مادی و اخلاقی میں مزاحم نہیں ہے بلکہ ان مزاحمتوں سے یہ زندگی کی حفاظت کرتا ہے جو اس کی مادی یا روحانی ترقی کو درہم برہم کر سکتی ہیں۔

۴۔ چوتھی یہ کہ اس کی کوئی خاص ہیئت و صورت نہیں ہے بجز اس کے کہ جبلت اور فطرت کے اندر جو حدود بڑھنے اور رکنے کے لیے قائم کر دیے گئے ہیں ان کی پوری پاسداری کی جائے۔

**شرعی تقویٰ کی حقیقت**

اب آئیے شرعی تقویٰ کی حقیقت پر غور کیجیے۔ ظاہر ہے کہ شریعت فطرت کے خلاف نہیں ہے بلکہ عین فطرت ہے فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا[1] اس وجہ سے شریعت کی نسبت یہ گمان کرنا تو کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا کہ وہ ہم سے کسی ایسے تقویٰ کا مطالبہ کرے گی جو انسان کی زندگی میں کسی طرح کا تعطل پیدا کرے، یا اس کی جائز رغبتوں کی نفی کرے (خواہ ان کا تعلق ابتدائی ضروریات سے ہو یا کمالیات سے) یا اس کا حصول زندگی کی شاہراہ سے الگ ہو کر کسی ایسے بعید گوشے اور دور دراز جزیرہ ہی میں ممکن ہو جہاں حرکت کے بجائے صرف سکون اور زندگی کی جگہ صرف موت ہو۔ یا اس کی شناخت کے لیے وہ کوئی ایسی علامت ٹھہرائے جو رد و قبول، ترک و اختیار اور ہدایت و ضلالت کے اس قانون ہی کو یکسر باطل کر دے جو اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں جاری فرمایا ہے اور جو انسان کی فطرت اور خدا کی حکمت کا عین مقتضیٰ ہے۔ ان باتوں میں سے کوئی بات بھی اگر تسلیم کر لی جائے تو اس سے لازم آتا ہے کہ شریعت اور فطرت میں کامل توافق کی جگہ ایک مستقل نزاع اور جنگ کی حالت قائم ہے حالانکہ ایسا

---

[1] اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی فطرت جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے۔

سمجھنا خود شریعت کی تکذیب ہے۔ شریعت کا اعلان تو یہ ہے کہ اس نے فطرت پر نہ سر مو اضافہ کیا ہے نہ اس میں کوئی کمی کی ہے۔ البتہ انسان کی فطرت جو کچھ مطالبہ کرتی ہے اس کو اس نے بالکل واضح اور آشکارا کر دیا ہے۔ فطرت کے اشارات مخفی تھے۔ شریعت نے ان کو بالکل روز روشن کی طرح نمایاں کر دیا تاکہ ان کے اخفا کی وجہ سے انسان کے لیے کوئی عذر باقی نہ رہے۔ فطرت کے مقتضیات کے تعین میں انسان کی بعض کمزوریوں کی وجہ سے اختلاف پیدا ہو سکتا تھا، شریعت نے ان مقتضیات کو معین کر کے اس اختلاف کا خدشہ دور کر دیا۔ اس سے زیادہ شریعت کسی بات کی مدعی نہیں ہے۔ اس وجہ سے جبلی اور فطری تقویٰ اور شرعی تقویٰ میں جو کچھ فرق ہو سکتا ہے وہ نفس تقویٰ کی حقیقت اور اس کے مقصد میں نہیں ہو سکتا البتہ اس کے محرک میں ہو سکتا ہے۔ جبلت میں صرف ذات کی حفاظت کا جذبہ مخفی ہوتا ہے۔ فطرت میں حفاظت نفس کے ساتھ مذاق سلیم اور انجام بینی کا پہلو بھی نمایاں ہو جاتا ہے لیکن شریعت میں اگر صاف صاف ایک خدائے منعم و دیان کا خوف اور عدل الٰہی کا ڈر ہے جو انسان کو اس بات پر آمادہ کرتا ہے کہ اس کی زندگی کے لیے جو سیدھی راہ متعین کر دی گئی ہے اسی پر چلے اور بے راہ روی اور گمراہی سے بچے۔ پس شرعی تقویٰ کی حقیقت یہ ہونی چاہیے کہ آدمی اپنی زندگی کو خدا کے مقرر کیے ہوئے حدود کے اندر رکھے اور دل کی گہرائیوں میں اس بات سے ڈرتا رہے کہ جہاں اس نے خدا کی قائم کی ہوئی کسی حد کو توڑا اس کو خدا کی سزا سے بچانے والا خدا کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا۔

**تقویٰ کا مفہوم قرآن میں** یہاں تک ہم نے یہ بات معلوم کرنے کی کوشش کی ہے کہ شرعی تقویٰ کی حقیقت کیا ہونی چاہیے۔ اب ہم قرآن مجید کی روشنی میں

یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ درحقیقت تقویٰ ہے کیا چیز۔ سب سے پہلے لفظ تقویٰ کو لیجیے کہ قرآن نے اس لفظ کو کس مفہوم میں استعمال کیا ہے۔ فرمایا ہے۔

| | |
|---|---|
| اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ۚ | حج کے چند متعین مہینے ہیں، جو شخص |
| فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ | ان مہینوں میں اپنے اوپر حج لازم کر |
| الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا | لے تو حج میں نہ عورتوں سے تعلق جائز |
| فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ | ہے، نہ گالی گلوچ، نہ جھگڑا بلکہ اس |
| فِي الْحَجِّ ۗ وَمَا تَفْعَلُوْا | کو بھلائیاں کرنی چاہییں) اور جو بھلائی کا |
| مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ ۗ | کام تم کرو گے تو اللہ اس کو علم میں رکھے گا |
| وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ | اور تقویٰ کا زادِ راہ لے کر حج کے لیے |
| التَّقْوٰى (بقرہ-۱۹۷) | نکلو کیونکہ بہترین زادِ راہ تقویٰ ہی ہے۔ |

اس آیت سے معلوم ہوا کہ ہر عبادت کے لیے قیود و شرائط ہیں اور اس کا نتیجہ بخش ہونا اس بات پر منحصر ہے کہ ان قیود و شرائط کے ساتھ ہی اس کو پورا کیا جائے۔ مثلاً حج کے سفر کے لیے جو لوگ نکلیں ان کے لیے ضروری ہے کہ اپنے نفس کو شہوات سے، زبان کو گالی گلوچ اور بدگوئی سے، ہاتھ پاؤں کو جنگ و جدال سے محفوظ رکھیں اور جہاں تک ممکن ہو بھلائیاں کریں۔ پھر ان تمام باتوں سے محفوظ رہنے کو تقویٰ قرار دیا اور اس تقویٰ کو بہترین زادِ راہ سے تعبیر فرمایا جس کے معنی یہ ہیں کہ جس طرح وہ شخص، جو بغیر زادِ راہ کے سفر کے لیے اٹھ کھڑا ہوا ہے، ہر قدم پر اس کی زندگی خطرات سے دوچار ہے، نہیں معلوم کس مرحلہ میں بھوک اور پیاس اور بے سروسامانی اس کا خاتمہ کر دے، اسی طرح جو شخص تقویٰ کے زادِ راہ اور حدودِ الٰہی کی پاسداری کے عزم کے بغیر حج کے لیے چل پڑا ہے نہیں معلوم کس جگہ اس کے نفس کی شہوت اور اس کی

زبان کی بے قیدیاں اس کے سارے حج کو غارت کر دیں۔

دوسری جگہ فرمایا:

| | |
|---|---|
| وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ | کسی قوم کا بغض تمہیں اس بات پر نہ اکسائے |
| قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا اعْدِلُوا | کہ تم اس کے باب میں عدل سے |
| هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ | ہٹ جاؤ۔ عدل پر قائم رہو۔ یہی بات |
| (مائدہ ۵ - ۸) | تقویٰ سے اوفق ہے۔ |

اس آیت میں مخالفین اور دشمنوں کے بارہ میں حدودِ الٰہی پر قائم رہنے کو تقویٰ سے اوفق قرار دیا۔

ایک اور مقام میں ہے۔

| | |
|---|---|
| تَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ | ادائے حق اور تقویٰ کے کاموں میں تعاون |
| وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ | کرو اور حق تلفی اور تعدی کے کاموں |
| وَالْعُدْوَانِ | میں تعاون نہ کرو۔ |

اس آیت میں بر، اثم، تقوی اور عدوان کا تقابل ہے اور کسی لفظ کا مقابل اپنے مقابل کے صحیح مفہوم تعیین میں سب سے زیادہ مدد کرتا ہے۔ عُدْوَان کے معنی تجاوز عن الحد یعنی اپنی متعینہ حد سے آگے بڑھ جانے کے ہیں۔ اس وجہ سے تقویٰ کے معنی اللہ کی حدود کی حفاظت کے ہوں گے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے جو حقوق واجب کر دیے ہیں، جو حدود متعین کر دیے ہیں، جو حلال و حرام ٹھہرا دیے ہیں۔ پورے خوفِ خدا کے ساتھ ان کی نگہداشت کی جائے۔

سورۂ توبہ میں ہے۔

| | |
|---|---|
| لَمَسْجِدٌ أُسِّسَ عَلَى التَّقْوَىٰ | جس مسجد کی بنا روزِ اول سے تقویٰ |
| مِنْ أَوَّلِ يَوْمٍ أَحَقُّ أَنْ | پر رکھی گئی ہے وہ اس بات کی زیادہ |

نَقُوْمَ فِیْہِ (یونس - ۱۰۸)          حقدار ہے کہ تم اس میں نماز پڑھو۔

اس آیت سے اوپر والی آیت میں مسجد ضرار کا ذکر ہے جس کا مقصد ضِرَارًا وَّكُفْرًا وَّتَفْرِيْقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَاِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ بیان کیا گیا ہے۔ یعنی مسلمانوں کو نقصان پہنچانا، خدا کی ناشکری کرنا، مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنا اور اللہ اور رسول کے مخالفوں کے لیے ایک اڈا مہیا کرنا۔ اس کے بعد اس مسجد کا ذکر کیا گیا ہے جس کی بنیاد تقویٰ پر رکھی گئی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو باتیں ان باتوں کی ضد ہیں، یعنی مسلمانوں کی خیر خواہی، اللہ کی شکرگزاری، مسلمانوں میں اتحاد و تالیف قلب پیدا کرنے کی کوشش اور اللہ اور اس کے رسول کے مخالفین سے بیزاری، یہ سب تقویٰ کی باتیں ہیں۔

ایک اور مقام میں فرمایا:۔

| | |
|---|---|
| اِذْ جَعَلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا | یاد کرو جبکہ کافروں نے اپنے دلوں |
| فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْحَمِيَّةَ حَمِيَّةَ | میں حمیت پیدا کرلی، جاہلیت کی حمیت |
| الْجَاهِلِيَّةِ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ | تو اللہ نے اپنی طرف سے اپنے رسول |
| سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى | اور اہل ایمان پر تسکین اتاری اور ان |
| الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى | کو کلمہ تقویٰ کا پابند رکھا اور وہ اس |
| وَكَانُوْٓا اَحَقَّ بِهَا وَاَهْلَهَا (الفتح - ۲۶) | کے حقدار اور اہل تھے۔ |

کفار مکہ نے حدیبیہ کے دن حمیت جاہلیت کے جنون میں مسلمانوں کو بیت اللہ میں داخل ہونے سے روک دیا اور باوجودیکہ مسلمان ایک طاقت ور عصبیت و حمیت کے ساتھ وہاں موجود تھے اور ان کے جذبات کفار کے اہانت انگیز سلوک کی وجہ سے نہایت مشتعل ہو رہے تھے لیکن وہ اللہ اور رسول کے فیصلہ پر راضی رہے اور جذبات کے ہیجان میں اس حد سے متجاوز نہیں ہوئے

جس پر اللہ کے رسول نے ان کو روک دیا تھا۔ اللہ اور رسول کے فیصلے پر اسی طمانیت کو جو انھوں نے رَضِیْتُ بِاللّٰہِ رَبًّا وَّبِالْاِسْلَامِ دِیْنًا وَبِمُحَمَّدٍ رَسُوْلًا کے الفاظ سے ظاہر کی، آیت مذکورہ بالا میں کلمۂ تقویٰ سے تعبیر کیا گیا ہے اور مسلمانوں کی نہایت تعریف کی گئی ہے کہ انتہائی صبر آزما حالات میں بھی وہ اس کلمہ کے اہل قرار پائے۔

ایک سرسری نظر ان کاموں پر بھی ڈالیے جن کو قرآن نے اتقاء کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ مثلاً فرمایا ہے۔

| | |
|---|---|
| وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَ | اگر وہ ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار |
| اتَّقَوْا لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ | کرتے تو اللہ کے پاس ان کے لیے |
| اللّٰهِ خَيْرٌ | بہتر اجر تھا۔ |

یہاں وَاتَّقَوْا کا لفظ بالکل وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کی جگہ پر ہے اور سیاق کلام کو پیش نظر رکھ کر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہود، اللہ کی کتاب کو چھوڑ کر جن علوم سفلیہ میں مبتلا ہو گئے تھے۔ ان سے بچنے کے لیے یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔

دوسری جگہ فرمایا ہے:۔

| | |
|---|---|
| وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰاُولِي | اور تمھارے لیے قصاص میں زندگی |
| الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ | ہے اے اہل عقل تاکہ تم تقویٰ اختیار کرو |

یعنی اگر قصاص لینے میں کوتاہی کی گئی تو کسی کی جان بھی دوسروں کی تعدی سے محفوظ نہ رہے گی۔ پس حدود پر قائم رہنے اور قائم رکھنے کے لیے قصاص لینا ضروری ہے۔ یہاں حدود الٰہی کی نگرانی کے لیے تقویٰ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

روزہ کے متعلق ارشاد ہے:۔

| | |
|---|---|
| يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ | اے ایمان والو تم پر روزہ فرض کیا |
| عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ | گیا ہے جس طرح ان لوگوں پر فرض کیا |
| عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ | گیا تھا جو تم سے پہلے تھے تاکہ تم تقویٰ |
| لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ۔ | اختیار کرو۔ |

روزہ کا مقصد یہ ہے کہ آدمی کو اپنے جذبات وشہوات پر قابو حاصل ہو جائے تاکہ وہ زندگی کے مختلف مرحلوں میں اللہ کے حدود کی حفاظت کر سکے۔ اسی مفہوم کو یہاں 'لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ' کے الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے۔

ایک جگہ ہے:۔

| | |
|---|---|
| فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ | پس جو تم پر زیادتی کرے تو اس |
| فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا | پر اتنی ہی زیادتی کرو جتنی اس نے |
| اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ | تم پر کی ہے اور اللہ سے ڈرو |
| وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ | اور جان لو کہ اللہ متقیوں کے |
| الْمُتَّقِيْنَ۔ | ساتھ ہے۔ |

یہاں 'وَاتَّقُوا اللّٰهَ' سے مطلب یہ ہے کہ بدلہ لینے میں اپنے حق سے تجاوز نہ کرو بلکہ اللہ تعالیٰ کے قائم کیے ہوئے حدود کے پابند رہو۔

| | |
|---|---|
| يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا | اے ایمان والو اللہ نے جو چیزیں |
| تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ | تمہارے لیے حلال ٹھہرائی ہیں نہ ان |
| اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ | کی پاکیزہ چیزوں کو حرام قرار دو اور |
| اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ○ | نہ حد سے آگے بڑھو، اللہ حد |
| وَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ | سے بڑھنے والوں کو دوست نہیں |
| اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا | رکھتا اور اللہ نے جو تم کو حلال وطیب |

| | |
|---|---|
| وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِیْ اَنْتُمْ | چیزیں بخشی ہیں ان کو کھاؤ اور اللہ سے |
| بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ (مائدہ - ۸۷-۸۸) | ڈرو جس پر تم ایمان لائے ہو۔ |

یہاں 'وَاتَّقُوا اللّٰهَ' (اللہ سے ڈرو) سے مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حرام و حلال کے جو حدود ٹھہرا دیے ہیں ان کی پوری پابندی کرو۔ نہ اس کی حلال کی ہوئی چیزوں کو حرام ٹھہراؤ، نہ حرام کی ہوئی چیزوں کو جائز قرار دو۔ جو شخص ایسا کرتا ہے وہ اللہ کی نظروں میں مبغوض ہے اور اس کے لیے سخت سزا ہے۔

| | |
|---|---|
| اَلَّذِیْنَ عَاهَدْتَّ مِنْهُمْ ثُمَّ | وہ لوگ جن سے تم نے معاہدہ کیا ہے |
| یَنْقُضُوْنَ عَهْدَهُمْ فِیْ كُلِّ مَرَّةٍ | پھر وہ اپنا عہد ہر مرتبہ توڑ دیتے ہیں |
| وَّهُمْ لَا یَتَّقُوْنَ | اور وہ نہیں بچتے۔ |

اس آیت میں 'لَا یَتَّقُوْنَ' سے مراد عہد شکنی اور خیانت سے نہ بچنا ہے۔

| | |
|---|---|
| وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ | اور حاملہ عورتوں کی مدت وضع حمل |
| اَنْ یَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ وَمَنْ یَّتَّقِ | ہے اور جو اللہ سے ڈرے گا اللہ |
| اللّٰهَ یَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ اَمْرِهٖ یُسْرًا | اس کے معاملہ میں آسانی پیدا کردے گا |

اس آیت میں اس بات کو تقویٰ کا کام قرار دیا گیا ہے کہ حاملہ عورت کو اگر طلاق دی جائے تو وضع حمل سے پہلے اس کو گھر سے نہ نکالا جائے اور اس دوران میں ان کے نان نفقہ کی ذمہ داری اٹھائی جائے اور ہر طرح کے حسن سلوک کا اس کو حق دار سمجھا جائے۔

| | |
|---|---|
| وَاَحْصُوا الْعِدَّةَ وَاتَّقُوا | اور عدت کو شمار کرو اور اللہ سے |
| اللّٰهَ رَبَّكُمْ لَا تُخْرِجُوْهُنَّ مِنْ | ڈرو جو تمہارا رب ہے، ان کو نہ نکالو |
| بُیُوْتِهِنَّ ........ وَمَنْ | ان کے گھروں سے ........ اور جو |
| یَّتَّقِ اللّٰهَ یَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا | اللہ سے ڈرے گا اللہ اس کے لیے راہ پیدا |

| | |
|---|---|
| وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا | کرے گا اور اس کو وہاں سے روزی |
| يَحْتَسِبُ ۔ | دے گا جہاں سے اس کو گمان بھی نہ ہوگا۔ |

**متقین کی صفات** اب ہمیں ایک سرسری نظر ان آیات پر بھی ڈالنی چاہیے جن میں متقین کی خصوصیات وصفات بیان کی گئی ہیں تاکہ اچھی طرح واضح ہو جائے کہ قرآن کی اصطلاح میں متقی کون لوگ ہیں۔ فرمایا

| | |
|---|---|
| لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ | یہ وفاداری نہیں ہے کہ تم اپنا منہ |
| قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ | مشرق اور مغرب کی طرف کرو بلکہ |
| وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ | وفاداری تو ان کی وفاداری ہے جو |
| وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ | اللہ پر، روز آخرت پر، فرشتوں |
| وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ وَاٰتَى | پر، کتاب پر اور نبیوں پر ایمان |
| الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِی الْقُرْبٰى | لائیں اور اس کی محبت میں رشتہ دارو |
| وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ | یتیموں، مسکینوں، مسافروں، سائلوں |
| السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي | کو مال دیں اور گردنوں کو آزاد کرائیں |
| الرِّقَابِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ | نماز قائم کریں، زکوٰۃ دیں۔ اللہ |
| وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَالْمُوْفُوْنَ | اپنے عہدوں کے پورا کرنے والے |
| بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا | ہوں جب کہ عہد کریں اور خاص کر |
| وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ | ثابت قدم رہنے والے مصیبت |
| وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ اُولٰٓئِكَ | اور تکلیف میں اور لڑائی کے وقت |
| الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِكَ | یہی لوگ ہیں جو سچے ہیں اور یہی |
| هُمُ الْمُتَّقُوْنَ (بقرہ - ۱۷۷) | لوگ ہیں جو متقی ہیں۔ |

یہ آیت کسی شرح کی محتاج نہیں ہے۔ دین داری اور تقویٰ کے اصلی مقتضیات

اس میں پورے بیان ہو گئے ہیں اور ساتھ ہی اس میں ان لوگوں کی پوری تردید بھی ہو گئی ہے جو دین کے مطالبات میں سے کچھ رسوم یا بعض احکام کی پابندی میں مبالغہ کر کے یہ چاہتے ہیں کہ اس زیادتی سے اس کی تلافی کر دیں جو وہ دین کے اصلی مطالبات پورے کرنے میں کر رہے ہیں۔ قرآن نے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ یہ وفاداری اور تقویٰ نہیں ہے، تقویٰ کے کاموں میں فلاں فلاں کام اصل واساس کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان میں خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر کام یہ ہے کہ مصائب وشدائد اور جنگوں میں حق کے لیے استقامت وعزیمت کا جوہر نمایاں ہو۔

دوسری جگہ فرمایا:۔

| | |
|---|---|
| بَلٰی مَنْ اَوْفٰی بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰی فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ | ہاں جو اپنے عہد کو پورا کریں اور ڈریں تو اللہ تعالیٰ ڈرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ |

اس آیت میں ان لوگوں کو جو اللہ تعالیٰ کے عہد پر قائم رہیں اور بدعہدی سے بچیں متقی اور محبوب خدا قرار دیا گیا ہے۔

| | |
|---|---|
| يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَاُولٰٓئِكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ وَمَا يَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُّكْفَرُوْهُ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِالْمُتَّقِيْنَ (اٰل عمران۔ ۱۴-۱۱۵) | اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان لاتے ہیں معروف کا حکم دیتے ہیں، منکر سے روکتے ہیں۔ بھلائی کے کاموں میں سبقت کرتے ہیں اور وہی لوگ نیکو کاروں میں سے ہیں اور جو بھلائی کے کام کریں گے اس کا انکار نہیں کیا جائے گا اور اللہ متقیوں سے باخبر ہے۔ |

اس آیت میں ایمان باللہ، ایمان بالآخرت، نہی عن المنکر، مسابقت فی الخیرات کو متقین اور صالحین کی صفات میں گنایا گیا ہے۔

| | |
|---|---|
| وَسَارِعُوْا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ | اور سبقت کرو اپنے رب کی مغفرت کی |
| رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا | طرف اور اس جنت کی طرف جس کا |
| السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ | عرض آسمانوں اور زمین کے عرض کی |
| اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ الَّذِيْنَ | طرح ہے اور ان متقیوں کے لیے تیار |
| يُنْفِقُوْنَ فِى السَّرَّآءِ | کی گئی ہے جو فراخی اور تنگی ہر حال |
| وَالضَّرَّآءِ وَالْكٰظِمِيْنَ | میں راہ خدا میں خرچ کرتے ہیں، غصہ |
| الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ | کو پی جانے والے اور لوگوں سے درگزر |
| النَّاسِ وَاللّٰهُ يُحِبُّ | کرنے والے ہیں اور اللہ محسنوں کو |
| الْمُحْسِنِيْنَ ۔ (آل عمران ۱۳۳-۱۳۴) | دوست رکھتا ہے۔ |

اس آیت میں متقیوں کی خاص صفات یہ بیان کی گئی ہیں کہ وہ تنگی اور فراخی ہر حال میں لوگوں کے حقوق ادا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور دشمنوں کے لیے بھی ان کے اندر رحم و شفقت اور عفو و درگزر ہے۔

| | |
|---|---|
| اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ | مگر وہ لوگ جن سے تم نے معاہدہ |
| الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ | کیا ہے مشرکین میں سے، پھر انھوں |
| شَيْـًٔا وَّلَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ | نے کوئی کمی نہیں کی اور تمھارے خلاف |
| اَحَدًا فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ | کسی کی مدد نہیں کی تو ان کے عہد کو |
| اِلٰى مُدَّتِهِمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ | ان کی مدت تک پورا کرو، اللہ متقیوں |
| الْمُتَّقِيْنَ ۔ (توبہ-۴) | کو دوست رکھتا ہے۔ |

اس آیت میں عہد کی پابندی کرنے والے کو متقی اور محبوب خدا کہا گیا ہے۔

| | |
|---|---|
| تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا | یہ دارِ آخرت ہم ان لوگوں کے لیے |
| لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا | خاص کریں گے جو زمین میں تکبر نہیں کرتے |
| فِی الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا وَالْعَاقِبَةُ | اور فساد نہیں مچاتے اور انجام کار |
| لِلْمُتَّقِيْنَ۔ (القصص ۸۳) | کی کامیابی متقیوں کے لیے ہے۔ |

اس آیت میں ان لوگوں کو متقی کہا گیا ہے جو خدا کی زمین میں خدا کے قانون کی پیروی کرتے ہیں اور اس میں فساد نہیں مچاتے یعنی خدا کے قانون کو درہم برہم نہیں کرتے۔

| | |
|---|---|
| اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِیْ جَنّٰتٍ وَّ | متقی لوگ باغوں اور چشموں کے بیچ |
| عُيُوْنٍ اٰخِذِيْنَ مَآ اٰتٰهُمْ | میں ہوں گے سرفراز ان نعمتوں سے |
| رَبُّهُمْ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ | جو ان کے رب نے بخشی ہوں گی۔ |
| ذٰلِكَ مُحْسِنِيْنَ كَانُوْا | بے شک وہ لوگ اس سے پہلے سے |
| قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا | خوب کار تھے، راتوں میں کم سوتے |
| يَهْجَعُوْنَ وَبِالْاَسْحَارِ | تھے اور صبح کو استغفار کرتے تھے اور |
| هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ وَفِیْٓ اَمْوَالِهِمْ | ان کے مالوں میں سائل اور محروم کا |
| حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ۔ | حق تھا۔ |

اس آیت میں متقیوں کی صفات یہ گنائی گئی ہیں کہ وہ تہجد پڑھتے ہیں، صبح کو استغفار کرتے ہیں، اپنے مالوں میں سے سائلوں اور محروموں کا حق نکالتے ہیں۔

تقویٰ، اتقا، متقی کی جو صفات قرآن مجید نے بیان کی ہیں ایک موزوں ترکیب کے ساتھ وہ ہم نے پیش کر دی ہیں۔ اس پر ایک نظر ڈال کر ہر شخص بآسانی اندازہ کر سکتا ہے کہ تقویٰ کے جو لوازم آج سمجھ لیے گئے ہیں ان کو اس

تقویٰ سے کوئی نسبت نہیں ہے جس کا مطالبہ قرآن مجید نے کیا ہے۔ قرآن مجید جس چیز کو تقویٰ قرار دیتا ہے اس کی حقیقت اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ کے مقرر کیے ہوئے حدود کی پابندی کرے اور اس ڈر سے کرے کہ آج کی ادنیٰ سے ادنیٰ کوتاہی کا بھی ایک روز اللہ کو حساب دینا ہے اور اس دن نہ کسی کی دوستی کام آئے گی نہ کسی کی سعی و سفارش کچھ نفع پہنچائے گی۔ صرف آدمی کے نیک اعمال کام آئیں گے اور خدا کی رحمت و عنایت۔

---

# تقویٰ کی حقیقت احادیث کی روشنی میں

**احادیث کے متعلق ایک اصولی حقیقت** پچھلی فصل میں ہم نے تقویٰ کی حقیقت پر قرآن مجید سے بحث کی ہے۔ اب ہم چاہتے ہیں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی روشنی میں بھی یہ دیکھ لیا جائے کہ تقویٰ کی حقیقت کیا ہے؟ لیکن احادیث پر غور کرنے سے پہلے احادیث کے متعلق ایک اصولی حقیقت پیش نظر رکھ لینی چاہیے۔ وہ یہ کہ جس طرح اللہ کے رسولوں کے درمیان تفریق ناجائز ہے، ہم یہ نہیں کر سکتے کہ کسی پر ایمان لائیں اور کسی کا انکار کر دیں جس طرح قرآن کی آیتوں میں فرق کرنا حرام ہے، ہم کو یہ حق نہیں ہے کہ اس کے کچھ حصہ کو حجت و استدلال کے لیے اختیار کریں اور کچھ کو چھوڑ دیں، اسی طرح یہ بات بھی بالکل ناجائز ہے کہ رسول کے اقوال و ارشادات میں سے کچھ کو ہم اپنے عمل یا استدلال کے لیے اختیار کرلیں اور کچھ کو نظر انداز کر دیں۔ ان تمام صورتوں میں بعض کو چھوڑنا سب کو چھوڑنے کے ہم معنی ہے اور نہایت بیوقوف ہے وہ مسلمان جو اللہ اور اس کے رسول کی تعلیمات میں اس طرح کی تقسیم کرتا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ اس کی تفریق و تقسیم کا فتنہ آج عام ہے۔ کتنے مسلمان ہیں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات میں اسی طرح کی تفریق کر کے اپنے زعم میں نہایت متقی بنے پھر رہے ہیں حالانکہ اگر وہ آپ کی تعلیمات پر بحیثیت مجموعی نظر ڈالیں تو انھیں معلوم ہو کہ تقویٰ تو درکنار ان کا ایمان و اسلام بھی معرض خطر میں ہے۔ اسی طرح کی تقسیم و تفریق کا یہ کرشمہ ہے کہ بعض دعاؤں اور بعض نوافل

پر جو کسی بڑے اجر و ثواب کا ذکر احادیث میں آیا ہے تو بعض لوگ اس کے معنی یہ سمجھتے ہیں کہ جو شخص بھی اس دعا یا نفل کا التزام کرے گا اس کے لیے یہ اجر و ثواب اور یہ درجہ اور مقام ہے خواہ زندگی کے دُوسرے شعبوں میں اس کا رویہ رسول کی ہدایت کے موافق ہو یا نہ ہو۔ حالانکہ یہ بات بالکل غلط ہے۔ بعض نوافل اور بعض اوراد پر جو بڑی بڑی برکتوں کا احادیث میں ذکر آیا ہے یہ ان لوگوں کے لیے ہے جو اپنی ساری زندگی کو حدود شریعت کے اندر رکھتے ہُوئے، ان اوراد و نوافل کا التزام کرتے ہیں۔ ورنہ ہو سکتا ہے کہ ایک طرف کوئی شخص کسی وظیفہ اور نفل کا پابند ہو اور دوسری طرف اس کی کمائی حرام کی ہو۔ ایک طرف تو وہ رات رات بھر نفلیں پڑھتا ہو اور تسبیحیں گردانتا ہو لیکن دوسری طرف وہ سارا دن کسی نظامِ باطل کی خدمت و اطاعت میں بسر کرتا ہو۔ ایک طرف تو نمازوں میں اس کی پنڈلیاں سوج جاتی ہوں لیکن دوسری طرف اس کے پڑوسیوں اور اس کے اقربا کو اس کے فتنوں سے کسی وقت بھی امان نہ حاصل ہو۔ ایسے شخص کے لیے اپنے اوراد و وظائف سے تقویٰ کا درجہ حاصل کرنا تو الگ رہا، احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا ایمان بھی معتبر نہیں ہے، کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اگر ایک طرف یہ فرمایا ہے کہ فلاں فلاں دعاؤں سے آدمی کے اتنے گناہ معاف ہو جاتے ہیں یا اس کے مدارج اتنے بلند ہو جاتے ہیں تو دوسری طرف یہ بھی فرمایا ہے کہ حرام خور کی کوئی دعا بھی قبول نہیں ہوتی، اگر ایک طرف یہ ارشاد فرمایا ہے کہ راتوں کو جاگ کر نفلیں پڑھنے کا یہ اجر و ثواب ہے تو دوسری طرف یہ بھی فرمایا ہے کہ یتیم کا حق ہڑپ کرنے والا اپنا ایمان بھی ضائع کر بیٹھتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جن لوگوں نے رسول کے احکام و ہدایات میں سے کچھ باتیں منتخب کر لی ہیں اور ان پر عمل

کر کے مطمئن ہو بیٹھے ہیں کہ وہ متقی بن گئے ہیں۔ وہ سخت مغالطہ اور فتنہ میں مبتلا ہیں۔ اللہ کا رسول کوئی دکاندار بن کر نہیں آتا کہ آپ کو اس کی دکان کا جو مال پسند آئے وہ خرید لیں۔ وہ تو آپ کی ساری زندگی کے لیے واجب الاطاعت ہادی بن کر آتا ہے کہ نقد دل اور نقد جان دونوں اس کی نذر کیجیے اور زندگی کے ہر گوشہ میں اسی کے نمونہ کی پیروی کیجیے۔

اور غور کیجیے تو یہ بات بالکل عقل و فطرت کے مطابق ہے۔ اگر کہا جائے کہ جو کسان ایک دانہ زمین میں ڈالتا ہے وہ دس پاتا ہے تو اس کے معنی ہرگز یہ نہیں ہیں کہ یہی نتیجہ اس صورت میں بھی برآمد ہوگا جب کہ بیج سڑا ہوا ہو اور کسی زرخیز زمین کے بجائے کسی بنجر زمین میں ہی ڈال دیا گیا ہو، یا تخم ریزی کے موسم کے بجائے بالکل بے وقت اور بالکل خلاف موسم ہی پھینک دیا گیا ہو، یا بیج ڈالنے کے بعد ارضی و سماوی آفتوں سے اس کے بچانے کی کوئی کوشش بھی نہ کی گئی ہو بلکہ اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ جو کسان کاشتکاری کی ساری شرطیں پوری کرتا ہے اس کے لیے قانون قدرت نے یہ برکت رکھی ہے کہ وہ ایک دانہ بو کر اس کے صلہ میں دس پاتا ہے۔ باقی رہا وہ احمق دہقان جو صبح کو تخم ریزی کرتا ہے اور شام کو جا کر اس میں ہل چلا دیتا ہے تو کھتے بھرنا تو الگ رہا وہ اپنی محنت اور اپنا سرمایہ بھی برباد کرتا ہے اور پڑوسیوں کے طعنے بھی سنتا ہے۔ یہی حال ان مسلمانوں کا ہے جو کسی نیکی کے کلمہ یا تقویٰ کے کام کو برِّ و تقویٰ کا اصل مقام سمجھے بیٹھے ہیں اور اس امر کی انھیں بالکل خبر نہیں ہے کہ اپنی بعض نیکیوں سے اپنے تقویٰ کی عمارت شب میں وہ جتنی اونچی کرتے ہیں دن میں اپنے اعمال کے ہاتھوں اس سے زیادہ اس کو ڈھا دیتے ہیں۔ یہ سادہ لوح یہ تو جانتے ہیں کہ فلاں کلمہ کو اتنی بار پڑھ لینے سے

یہ درجہ حاصل ہو جاتا ہے اور فلاں وقت اتنی رکعتیں نفل کی ادا کر لینے سے یہ ثواب ملتا ہے لیکن یہ بالکل نہیں جانتے کہ جس رسول نے یہ باتیں بتائی ہیں اسی نے یہ بھی بتایا ہے کہ فلاں فلاں باتیں کرنے سے آدمی کی یہ ساری سعی اکارت ہو جاتی ہے۔

احادیث کے متعلق یہ اصولی حقیقت پیش نظر رکھ کر، اگر آپ حدیثوں پر غور کریں گے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ تقویٰ کی جو حقیقت ہم نے قرآن مجید سے متعین کی ہے اسی کی تائید نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے بھی ہوتی ہے یعنی یہ کہ تقویٰ اللہ تعالیٰ کے مقرر کیے ہوئے حدود کی کامل نگہداشت کا نام ہے۔ یہ زندگی کی عام شاہراہ سے کوئی الگ چیز نہیں ہے بلکہ زندگی کو خدا کے قائم کیے ہوئے حدود کے اندر بسر کرنے ہی کا نام تقویٰ ہے۔ یہ کسی درجہ میں بھی زندگی کے مطالبات و مقتضیات کی نہ تو نفی کرتا نہ ان میں مزاحم ہوتا، البتہ یہ زندگی کے کسی مطالبہ کو یہ اجازت نہیں دیتا کہ وہ اپنی فطری یا اخلاقی حدود سے متجاوز ہو کر فرد یا معاشرے کو کسی مادی یا اخلاقی مہلکہ میں ڈال دے۔ یہ نہ تو فطری قابلیتوں کی راہ میں کوئی عائق ہے نہ نفس کی خواہشوں کی راہ میں کوئی خواہ مخواہ کی رکاوٹ، اور نہ دل و دماغ اور سمع و بصر کی جولانیوں اور بلند پروازیوں کی یہ راہ مارتا ہے۔ اس کا کام صرف یہ ہے کہ ان کی کارفرمائی کے لیے ایک صراط مستقیم سامنے کر دیتا ہے اور اس کے ہر طرف نشانِ راہ قائم کر دیتا ہے تاکہ کسی منزل میں انسان بے راہ روی میں پڑ کر اپنے نفس پر یا دوسروں پر کوئی ظلم نہ کر سکے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے احادیث میں جس قوت و شدت کے ساتھ لوگوں کو تقویٰ کی تلقین فرمائی ہے اسی قوت کے ساتھ تقویٰ کے ان غلط رجحانات کو روکا ہے جو کسی نوعیت سے فطرتِ انسانی

کی ترقیوں کی راہ میں مزاحم ہو سکتے تھے۔ حضور نے اس بات کو کبھی پسند نہیں فرمایا کہ حدود الٰہی کی حفاظت و نگہداشت کے سوا اس کی کوئی خاص صورت و ہیئت قرار پائے۔ اور لوگ باسم تقویٰ اس کو بت بنا کر پوجیں۔ نیز اس بات کو بھی نہایت واضح الفاظ میں تصریح فرمائی کہ تقویٰ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کو زہد او رترک دنیا سے کوئی خاص لگاؤ ہو بلکہ اللہ کے دین پر چلنے اور چلانے کی ہر جد و جہد اور خدا کی شریعت کو سمجھنے اور سمجھانے کی ہر کوشش تقویٰ ہی کی راہ میں جہاد ہے۔

تقویٰ کی حد احادیث کی روشنی میں تقویٰ کی حقیقت سمجھنے کے لیے سب سے پہلے یہ دیکھیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تقویٰ کی حد کیا بیان فرمائی ہے۔ نعمان بن بشیر سے روایت ہے۔

| | |
|---|---|
| قال قال رسول اللہ صلی | کہا فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم |
| اللہ علیہ وسلم الحلال | نے کہ حلال واضح ہے اور حرام |
| بین والحرام بین و | واضح ہے اور ان کے درمیان کچھ |
| بینھما متشابھات لا | چیزیں مشتبہ ہیں جن کو اکثر لوگ نہیں |
| یعلمھن کثیر من الناس | جانتے۔ پس جو ان مشتبہ چیزوں سے |
| فمن اتقی الشبھات استبراء | بچا وہ اپنے دین اور اپنی آبرو کو |
| لدینہ وعرضہ ومن | بچا لے گیا اور جو شبہات میں پڑا وہ |
| وقع فی الشبھات وقع فی | حرام میں مبتلا ہوا جس طرح وہ چرواہا |
| الحرام کالراعی یرعی | جو چراگاہ کے پاس اپنا گلہ چراتا ہے |
| حول الحمی یوشك ان | اغلب ہے کہ اس کا گلہ چراگاہ |
| یقع فیہ الا وان لکل ملك | میں پڑ جائے۔ آگاہ ہو ہر بادشاہ کے |

| | |
|---|---|
| حمی الا وان حمی اللہ | پاس محفوظ علاقہ ہوتا ہے اور اللہ کا |
| محارمہ (متفق علیہ) | محفوظ علاقہ اس کے محارم ہیں۔ |

اس حدیث میں حضورؐ نے یہ حقیقت سمجھائی ہے کہ جو چیزیں حلال ہیں وہ واضح طور پر معلوم ہیں اور جو چیزیں حرام ہیں ان کی بھی اللہ کی کتاب، اور سنت میں تصریح کر دی گئی ہے۔ پس یہ مطالبہ تو ہر مسلمان سے ہے کہ اللہ کی حلال کی ہوئی چیز کو حلال اور اس کی حرام کی ہوئی چیز کو حرام قرار دے۔ اس کے بغیر کوئی شخص مسلمان ہو ہی نہیں سکتا۔ لیکن حلال ظاہر اور حرام ظاہر کے درمیان کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں جن کی نسبت قطعیت کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ حرام ہیں یا حلال۔ ایسی صورتوں میں جو شخص احتیاط کے پہلو کو اختیار کرے اور مشتبہ میں نہ پڑے وہ متقی مسلمان ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ جو لوگ اونٹ کو نگلنے کے بعد مچھر کو چھان کر تقویٰ کی نمائش کرتے ہیں۔ ان کا تقویٰ محض فریب ہے۔ تقویٰ یہ ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ کے احکام و حدود کا پورا پورا پابند ہو اور جب اس کے سامنے کوئی ایسی چیز آئے جس میں جانب حق اس پر پوری طرح واضح نہ ہو تو وہ اشتباہ کے پہلو کو چھوڑ کر طمانیت کے پہلو کو اختیار کرے۔ جو شخص ایسا کرتا ہے وہ متقی ہے اور اس کا دین اور اس کی آبرو ہر تہمت اور اشتباہ سے محفوظ ہے۔ اس حقیقت کو حضورؐ نے مختلف طریقوں سے بیان فرمایا ہے اور چونکہ تقویٰ کی اصل حد متعین کرنے میں ان احادیث سے خاص مدد مل سکتی ہے اس وجہ سے ہم ان میں سے بعض یہاں نقل کیے دیتے ہیں۔

| | |
|---|---|
| عن وابصۃ بن معبد ان | وابصہ بن معبد سے روایت ہے کہ |
| رسول اللہ صلعم قال | رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ اے |
| یا وابصۃ جئت تسأل عن | وابصہ تم بر و اثم کی حقیقت پوچھنے |

| | |
|---|---|
| البر والاثم قلت نعم قال | آئے ہو؟ میں نے عرض کیا ہاں یا رسول اللہ |
| فجمع اصابعه فضرب بها | آپ نے اپنا پنجہ برابر کیا اور اس |
| صدره وقال استفت نفسك | کو اپنے سینے پر مارا اور فرمایا اپنے |
| استفت قلبك ثلاثا البر | نفس سے پوچھو، اپنے دل سے |
| ما اطمأنت اليه النفس | سوال کرو (تین مرتبہ فرمایا) تقویٰ |
| واطمأن اليه القلب والاثم | وہ ہے جس پر تمہارا دل مطمئن ہو |
| ما حاك في النفس وتردد | جائے اور اثم وہ ہے جو دل میں |
| في الصدر وان افتاك | کھٹکے اگرچہ لوگوں نے اس کے جواز |
| الناس (رواه احمد والدارمی) | کا فتویٰ دے دیا ہو۔ |

وابصہ بن معبد کا یہ سوال بھی اس حالت سے متعلق ہے جب کہ آدمی کے سامنے حق کا پہلو پوری طرح واضح نہ ہو جائے، ایسی صورت میں تقویٰ یہ ہے کہ آدمی اس پہلو کو اختیار کرے جس میں دل طمانیت محسوس کرے اور اس پہلو سے احتراز کرے جس میں طبیعت کو خلش محسوس ہو۔

ایک دوسری روایت میں اسی مضمون کی مزید شرح ہے کہ ایک متقی کے لیے بسا اوقات اندیشۂ معصیت سے بچنے کے لیے ان چیزوں سے بھی احتیاط کرنی پڑتی ہے جن میں بظاہر کوئی حرج نہیں ہوتا۔

| | |
|---|---|
| لا يبلغ العبد ان يكون | کوئی بندہ متقیوں میں سے نہیں ہو سکتا |
| من المتقين حتى يدع | جب تک وہ اس چیز کی وجہ سے جس |
| ما لا باس به حذرا | میں اس کو اندیشہ ہے بعض ان |
| لما به باس (رواه الترمذی | چیزوں سے احتراز نہ کرے جس میں |
| وابن ماجه) | بظاہر اندیشہ نہیں ہے۔ |

عن الحسن بن علی قال حفظت من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دع ما یریبك الی ما لا یریبك فان الصدق طمانینة وان الکذب ریبة (رواہ احمد والترمذی)

حسن بن علی سے روایت ہے۔ فرمایا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات محفوظ رکھی ہے کہ اس پہلو کو چھوڑ دو جو خلجان میں ڈالتا ہے اور اس کو اختیار کرو جو خلجان میں نہیں ڈالتا۔ صحیح چیز طمانیت بخشتی ہے اور غلط چیز خلجان میں ڈالتی ہے۔

ان ساری حدیثوں میں ایک ہی حقیقت بیان کی گئی ہے۔ وہ یہ کہ تقویٰ یہ ہے کہ آدمی ہر گوشۂ زندگی میں اللہ تعالیٰ کے احکام و حدود کی پوری پابندی کرے اور جہاں کہیں اس کے سامنے کوئی ایسی بات آئے جس کے جائز یا ناجائز ہونے کے بارہ میں کوئی قطعی بات وہ نہ کہہ سکے تو اپنے دل سے استفتاء کرے اور اس پہلو کو اختیار کرے جس میں اس کا دل طمانیت محسوس کرے اس پہلو کو نہ اختیار کرے جو اس کے دل میں کھٹکے۔ جو شخص اس احتیاط کے ساتھ اپنی زندگی میں حدودِ الٰہی کی نگرانی کر رہا ہے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق متقی ہے۔

لیکن گناہ سے بچنے کے لیے جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے احتیاط کے پہلو پر اس حد تک زور دیا ہے وہیں تقویٰ کا صحیح توازن قائم رکھنے کے لیے اس امر کی بھی تصحیح فرما دی ہے کہ یہ احتیاط کہیں وسوسہ کی شکل نہ اختیار کرنے پائے ورنہ اس کے ڈانڈے نصاریٰ کی رہبانیت سے مل جائیں گے۔ چنانچہ قبیصہ بن ہلب سے روایت ہے۔

عن قبیصة بن ھلب عن

قبیصہ بن ہلب اپنے باپ سے

| | |
|---|---|
| ابیہ قال سألت النبی | روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ |
| صلی اللہ علیہ وسلم عن | صلی اللہ علیہ وسلم سے نصاریٰ کے |
| طعام النصاری وفی روایۃ | کھانوں کے متعلق دریافت کیا اور |
| سألہ رجل فقال ان | ایک دوسری روایت میں ہے کہ آپ |
| من الطعام طعاما | سے کسی اور شخص نے پوچھا کہ کھانوں |
| اتحرج منہ فقال لا | میں سے بعض ایسے ہیں جن سے میرے |
| یتخلجن فی صدرک | دل میں کھٹک پیدا ہوتی ہے۔ آپ |
| شیئٌ ضارعت فیہ | نے فرمایا تمہارے دل میں کوئی ایسی |
| النصرانیۃ (رواہ الترمذی | کھٹک نہ پیدا ہو جو نصاریٰ کی رہبانیت |
| وابوداؤد) | سے مشابہ ہو۔ |

اس حدیث کو اوپر کی احادیث سے ملا کر دیکھیے تو وہ صحیح اور متوازن تقویٰ بالکل ممیز ہو کر سامنے آجاتا ہے جس میں نہ تو اشتباہ کی صورت میں میلان الی المعصیۃ کا شائبہ ہے اور نہ اس میں احتیاط کی بے اعتدالی اور متقشفانہ وہمی پن کی کوئی آمیزش ہے بلکہ تقویٰ کی جو اصل حقیقت ہے بالکل تول کر سامنے رکھ دی گئی ہے۔ احتیاط میں جب وسوسہ کو دخل ہو جاتا ہے تو اس سے وہ راہبانہ تقویٰ وجود میں آتا ہے جو اللہ و رسول کو اسی طرح ناپسند ہے جس طرح حدود الٰہی کے احترام میں رخصت پسندی اور سہل انگاری ناپسند ہے۔

**تقویٰ اور زندگی کے مطالبات** اب ان احادیث پر غور فرمائیے جن میں اس بات کی نہایت واضح تردید ہوتی ہے کہ تقویٰ کسی نوعیت سے بھی زندگی کے مطالبات و مقتضیات کی نفی کرتا ہے۔

| | |
|---|---|
| عن عثمان بن مظعون قال | عثمان بن مظعون سے روایت ہے |

يا رسول الله ائذن لنا
في الاختصاء فقال رسول الله
صلى الله عليه وسلم
ليس منا من خصى ولا اختصى
ان خصاء امتي الصيام
فقال ائذن لنا في السياحة
فقال ان سياحة امتي
الجهاد في سبيل الله
فقال ائذن لنا في الترهب
فقال ان ترهب امتي الجلوس
في المساجد انتظار الصلوٰة
(رواه في شرح السنة)

انھوں نے کہا یا رسول اللہ ہم کو
خصی ہو جانے کی اجازت دیجیے۔
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا
جس شخص نے خصی کیا اور جو خصی
ہوا وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ میری
امت کا خصی ہونا روزہ رکھنا ہے۔
کہا اچھا تو بن باس ہونے کی اجازت
دیجیے، فرمایا میری امت کا بن باس
ہونا یہ ہے کہ وہ راہِ خدا میں جہاد کرے۔
کہا اچھا تو ترک دنیا کی اجازت دیجیے
فرمایا میری امت کے لیے نماز کے
انتظار میں مسجد میں بیٹھنا ترک دنیا ہے۔

بعض لوگوں کو، جنھوں نے تقویٰ کے غلط تصور میں مبتلا ہو کر، زندگی کے مطالبات و ضروریات میں عدم توازن پیدا کر دیا تھا اور زہد و عبادت کی طرف جھک پڑے تھے، حضور نے نہایت سختی کے ساتھ ٹوکا اور ان کو متوازن زندگی بسر کرنے کی ہدایت فرمائی۔

عن عبد الله بن عمرو
العاص قال قال لي
رسول الله صلى الله عليه
وسلم يا عبد الله الم
اخبر انك تصوم النهار

عبد اللہ بن عمرو العاص سے روایت
ہے کہ مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
نے پوچھا کہ کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ تم
دن کو روزے رکھتے ہو اور رات
بھر نمازیں پڑھا کرتے ہو۔ میں نے

| | |
|---|---|
| وتقوم الليل فقلت بلى | عرض کیا کہ صحیح ہے یا رسول اللہ آپ |
| یا رسول الله قال فلا | نے فرمایا ایسا نہ کرو۔ کبھی روزہ رکھو |
| تفعل صم وافطر وقم | کبھی افطار کرو، نماز بھی پڑھو اور |
| ونم فان لجسدك عليك | سوؤ بھی۔ کیونکہ تمھارے جسم کا بھی تم |
| حقا وان لعينك عليك | پر حق ہے، تمھاری آنکھوں کا بھی |
| حقا وان لزوجك | تم پر حق ہے، تمھاری جورو کا بھی تم |
| عليك حقا وان لزورك | پر حق ہے اور تمھارے ملاقاتی کا بھی |
| عليك حقا۔ | تم پر حق ہے۔ |

**مباحات سے انتفاع تقویٰ کے منافی نہیں ہے** | بعض لوگ مباحات اور رخصتوں سے مستفید ہونا شان تقویٰ کے منافی سمجھتے ہیں اور ہر منزل پر اپنا ڈیرہ سنگلاخ زمین ہی میں ڈالنا کمال دینداری سمجھتے ہیں۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس غلط فہمی کا بھی ازالہ فرمایا ہے۔

| | |
|---|---|
| عن عائشة قالت صنع | حضرت عائشہ سے روایت ہے، فرمایا |
| رسول الله صلعم شيئا | رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی |

---

ؔ اوپر ایک روایت ہم نے نقل کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تقویٰ کے لیے اندیشۂ معصیت سے بعض ایسی چیزیں بھی چھوڑنی پڑتی ہیں جن میں بظاہر کوئی ہرج نہیں ہوتا ہے لیکن یہ اس صورت میں ہے جب امر حق مشتبہ ہو۔ ایسی صورت میں بلاشبہ تقویٰ یہی ہے کہ آدمی احتیاط کا پہلو اختیار کرے اور مباح مشتبہ سے فائدہ نہ اٹھائے لیکن جس مباح یا جس رخصت پر قلب مطمئن ہے محض اس خیال سے اس کو چھوڑنا کہ اصلی دین داری سخت راہ اختیار کرنے میں ہے۔ یہ تقویٰ نہیں ہے بلکہ تقویٰ سے دھینگا مشتی ہے۔

| | |
|---|---|
| فرخص فیہ فتنزہ | کام کیا پھر اس میں رخصت دے دی |
| عنہ قوم فبلغ ذلک | تو بعض لوگ اس رخصت سے فائدہ |
| رسول اللہ صلی اللہ | اٹھانے سے احتراز کرنے لگے۔ جب |
| علیہ وسلم فخطب | رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بات |
| فحمد اللہ ثم قال | معلوم ہوئی تو آپ نے خطبہ دیا، اللہ |
| ما بال اقوام یتنزھون | تعالی کی حمد کی، پھر فرمایا بعض لوگوں |
| عن الشئ اصنعہ فو | کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ ان کاموں کو |
| اللہ انی لا علمھم | کرنے سے احتراز کرتے ہیں جن کو میں |
| باللہ واشدھم لہ | خود کرتا ہوں، خدا کی قسم میں ان سے |
| خشیۃ۔ | زیادہ اللہ کو جاننے والا ہوں اور ان |
| (متفق علیہ) | سے زیادہ خدا سے ڈرتا ہوں۔ |

**ابوداؤد میں ایک روایت اس سے بھی زیادہ واضح ہے۔**

| | |
|---|---|
| عن انس ان رسول اللہ | حضرت انس سے روایت ہے کہ |
| صلی اللہ علیہ وسلم کان | رسول اللہ صلی اللہ علیہ [illegible] فرمایا کرتے |
| یقول لا تشددوا علی | تھے کہ اپنے اوپر سختی مت [illegible] اللہ |
| انفسکم فیشدد اللہ | بھی تم پر سختی کرنے لگے۔ ایک قوم نے |
| علیکم فان قوما شددوا | اپنے اوپر سختی کی تو اللہ نے بھی ان |
| علی انفسھم فشدد اللہ علیھم | پر سختی کی۔ انہی کی یادگاریں کلیساؤں |
| فتلک بقایاھم فی الصوامع و | اور گرجوں میں دیکھ رہے ہو۔ یہ ان کی |
| الدیار رھبانیۃ ابتدعوھا | گڑھی ہوئی رہبانیت ہے جس کو اللہ |
| ما کتبناھا علیھم | نے ان کے اوپر فرض نہیں کیا۔ |

یہ حدیثیں اس بات کا صاف ثبوت ہیں کہ جس طرح رخصتوں کی تلاش اور مباحات سے فائدہ اٹھانے میں جانب حق کی رعایت سے بے پروائی تقویٰ کے خلاف ہے۔ اسی طرح دین میں خواہ مخواہ سختی اور تشدد کے پہلو کا التزام بھی تقویٰ کے منافی ہے۔ تقویٰ کی راہ اس سہل انگاری اور اس تشدد پسندی کے بیچ سے ہو کے نکلی ہے۔

**تقویٰ اور کثرت نوافل** لعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ تقویٰ کا اصلی کام زہد و عبادت ہے۔ آدمی کسی گوشے میں بیٹھ کر اللہ اللہ کرے، نمازیں پڑھے، روزے رکھے اوراد و نوافل میں مشغول رہے، بس یہ کام اصلی تقویٰ کے کام ہیں۔ ان کے علاوہ جو کام ہیں، اگرچہ وہ دین کے کام ہوں، لیکن موجودہ زمانہ کے ارباب تقویٰ ان کو تقویٰ کے کام نہیں سمجھتے۔ تقویٰ کا جزو اعظم ان کے ہاں عبادت ہے جو شخص اس چیز میں جتنا ہی اضافہ کرتا جائے گا، تقویٰ میں اسی قدر اس کے مدارج بلند ہوتے جائیں گے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت واضح الفاظ میں اس غلط رجحان کی بھی تردید فرمائی ہے۔

| | |
|---|---|
| عن انس قال جاء | حضرت انس سے روایت ہے کہ |
| ثلثة رهط الی ازواج | نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج کے |
| النبی صلی اللہ علیہ وسلم | پاس تین جماعتیں آپ کی عبادت |
| یسئلون عن عبادته فلما | کا حال پوچھنے آئیں۔ جب ان کو |
| اخبروا بها کانهم تقالوها | آپ کی عبادت کا پورا پورا حال |
| فقالوا این نحن من | بتایا گیا تو کچھ ایسا ظاہر ہوا کہ ان |
| من النبی صلی اللہ | کی نظر میں بہت کم ہے۔ پھر وہ |
| علیه وسلم وقد | بولے ہمارا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم |

| | |
|---|---|
| غفر اللہ لہ ما تقدم | کا کیا مقابلہ! آپ کے تمام اگلے |
| من ذنبہ وما تاخر | اور پچھلے گناہ بخش دیے جا چکے ہیں۔ |
| فقال احدھم اما انا | پھر ان لوگوں میں سے ایک شخص |
| فاصلی اللیل ابدا | بولا میں ہمیشہ رات بھر عبادت کروں گا |
| وقال الاخر انا اصوم | ایک دوسرا بولا میں ہمیشہ روزے |
| النھار ولا افطر و | رکھوں گا، ایک تیسرے نے کہا میں |
| قال الاخر انا اعتزل | عورتوں سے بالکل قطع تعلق کر لوں گا |
| النساء فلا اتزوج ابداً۔ | اور کبھی نکاح نہ کروں گا۔ اتنے میں |
| فجاء النبی صلی اللہ | نبی صلی اللہ علیہ وسلم آ گئے، آپ نے |
| علیہ وسلم الیھم فقال | فرمایا تمہیں لوگ یہ یہ کہہ رہے تھے۔ |
| انتم الذین قلتم کذا | خدا کی قسم میں تم سے کہیں زیادہ اللہ |
| وکذا اما واللہ انی | سے ڈرنے والا اور اس سے تقویٰ |
| لاخشاکم للہ واتقاکم | اختیار کرنے والا ہوں لیکن اس کے |
| لہ ولکنی اصوم و | باوجود روزے بھی رکھتا ہوں، ناغہ |
| افطر واصلی وارقد وا | بھی کرتا ہوں، نمازیں بھی پڑھتا ہوں، |
| اتزوج النساء فمن | آرام بھی کرتا ہوں اور عورتوں سے |
| رغب عن سنتی فلیس | نکاح بھی کرتا ہوں جس نے میرے |
| منی۔ | طریقہ سے انحراف کیا وہ میری امت |
| (متفق علیہ) | میں سے نہیں ہے۔ |

ایک دوسری حدیث ملاحظہ ہو:۔

| | |
|---|---|
| عن الحسن قال سئل | حضرت حسن سے روایت ہے، فرمایا |

| | |
|---|---|
| رسول الله صلى الله عليه و | رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے |
| سلم ان رجلين كانا في | بنی اسرائیل کے دو شخصوں کی بابت |
| بني اسرائيل احدهما كان | دریافت کیا گیا، ایک عالم تھا جو |
| عالما يصلي المكتوبة | فرض نمازیں پڑھ کر بیٹھ جاتا اور لوگوں |
| ثم يجلس فيعلم الناس | کو بھلائی کی تعلیم دیتا دوسرا دن |
| الخير والاخر يصوم النهار | میں روزے رکھتا اور شب میں نمازیں |
| ويقوم الليل ايهما افضل | پڑھا کرتا۔ ان میں سے کون افضل ہے؟ |
| قال رسول الله صلى الله عليه | حضور نے فرمایا یہ عالم جو فرض پڑھ |
| وسلم فضل هذا العالم الذي | کر لوگوں کی تعلیم میں مشغول ہو جاتا ہے |
| يصلي المكتوبة ثم يجلس فيعلم | اس عابد پر جو دن میں روزے رکھتا |
| الناس الخير على العابد الذي | اور شب میں عبادت کرتا ہے وہی |
| يصوم النهار ويقوم الليل | فضیلت رکھتا ہے جو میں تم میں |
| كفضلي على ادناكم | سے ایک ادنیٰ ترین فرد پر رکھتا ہوں۔ |
| عن ابن عباس قال تدارس | ابن عباس سے مروی ہے کہ |
| العلم ساعة من الليل | شب میں ایک گھنٹہ علم کا مذاکرہ |
| خير من احيائها۔ | تمام رات عبادت کرنے سے |
| (رواه الدارمي) | بہتر ہے۔ |
| عن عبد الله بن عمرو | عبداللہ بن عمرو سے روایت ہے |
| ان رسول الله صلى الله | کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم |
| عليه وسلم مر بمجلسين | نے اپنی مسجد میں دو جماعتیں دیکھیں |
| في مسجده فقال | اور فرمایا دونوں اچھے کام کر رہی |

| | |
|---|---|
| كلاهما على خير واحدهما | ہیں لیکن ایک دوسری سے افضل |
| افضل من صاحبه | ہے۔ یہ لوگ اللہ کو یاد کر رہے ہیں |
| اما هؤلاء فيدعون | اور اس کی طلب میں لگے ہیں۔ اگر |
| الله ويرغبون اليه | اللہ چاہے گا انھیں بامراد کرے گا |
| فان شاء اعطاهم | اور اگر چاہے گا محروم کر دے گا |
| وان شاء منعهم و | یہ دوسرے لوگ تو یہ علم دین کے سمجھنے |
| اما هؤلاء فيتعلمون | میں لگے ہیں (یا علم دین حاصل کر |
| الفقه والعلم و | رہے ہیں) اور جاہلوں کو تعلیم دے رہے |
| يعلمون الجاهل فهم | ہیں۔ یہ لوگ ان سے افضل ہیں اور |
| افضل وانما بعثت معلما | میں تو معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ اور |
| فجلس فيهم | یہ کہہ کر انہی کے ساتھ بیٹھ گئے۔ |

ان تمام روایات سے ثابت ہے کہ زندگی کو ایک توازن کے ساتھ اللہ کے حدود کے اندر بسر کرنے کا نام تقویٰ ہے۔ ایک شخص اگر فرائض ادا کر کے اپنا بقیہ سارا وقت دین کے سیکھنے سکھانے اور اس کی اقامت کی جدوجہد میں صرف کر رہا ہے تو وہ ان لوگوں سے کہیں زیادہ متقی ہے جو رات بھر نمازیں پڑھتے ہیں اور اوراد و وظائف میں مشغول رہتے ہیں لیکن تعلیم دین یا اقامت دین کی جدوجہد میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہے۔

**محرمات و مشتبہات سے اجتناب** ایک نہایت غلط رجحان تقویٰ کے متعلق یہ بھی لوگوں میں پیدا ہو گیا ہے کہ محرمات سے اجتناب کو لوگ تقویٰ کے لیے اتنا ضروری نہیں سمجھتے جتنا نوافل کی زیادتی کو سمجھتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ تقویٰ میں اصل شے جس کا اہتمام مطلوب ہے محرمات اور مشتبہات

سے اجتناب ہے۔ اس کے بغیر کوئی شخص کتنی ہی عبادتیں کرے، تقویٰ کے مقام کو نہیں حاصل کر سکتا۔ اس زمانہ میں ہم عام طور پر دیکھ رہے ہیں کہ نظامِ باطل کی خدمت کرنے والے، دنیا پرست امراء کی خوشامدیں کرنے والے، حرام کے اندوختوں پر زندگیاں بسر کرنے والے، اپنی نسلوں کو خدمتِ طاغوت کے لیے تیار کرنے والے محض اس بنیاد پر تقویٰ کے مدعی بنے بیٹھے ہیں کہ اُنھوں نے کچھ اوراد و نوافل کا اہتمام کر رکھا ہے اور ہر وقت ہاتھوں میں تسبیحیں لٹکائے پھرتے ہیں۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس غلط فہمی کی بھی اصلاح فرمائی ہے۔

عن ابی هریرة قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم من یاخذ عنی هذه الکلمٰت فیعمل بهن او یعلم من یعمل بهن قلت انا یا رسول الله فاخذ بیدی وعد خمسا فقال اتق المحارم تکن اعبد الناس الحدیث۔

حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ کون مجھ سے یہ باتیں لے کر ان پر عمل کرے گا یا عمل کرنے والوں کو سکھائے گا؟ میں نے عرض کیا میں یا رسول اللہ۔ آپ نے میرا ہاتھ پکڑا اور پانچ چیزیں گنائیں ان میں سے پہلی بات یہ تھی کہ حرام چیزوں سے پرہیز کرو سب سے بڑا عابد بن جائے گا۔

---

عن جابر قال ذکر رجل عند رسول الله صلی الله علیه وسلم بعبادة واجتهاد وذکر اٰخر

جابر سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک شخص کی عبادت اور ذکرِ الٰہی میں سرگرمی کا ذکر کیا گیا اور ایک دوسرے

بورعة فقال النبی صلعم لا تعدل بالرعة یعنی الورع (رواہ الترمذی)

شخص کے محرمات و مشتبہات سے اجتناب کا، آپ نے فرمایا عبادت کو پرہیزگاری کے برابر نہ کرو۔

عن ابی هریرة قال قال رجل یا رسول اللہ ان فلانة تذکر من کثرة صلواتها وصیامها وصدقتها غیر انها تؤذی جیرانها بلسانها قال هی فی النار قال یا رسول اللہ فان فلانة تذکر قلة صیامها وصدقتها وصلوتها وانها تصدق بالاثوار من الاقط ولا تؤذی بلسانها جیرانها قال هی فی الجنة (رواہ احمد والبیہقی)

ابوہریرہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے کہا فلاں بی بی کے نماز اور روزے اور صدقہ کی بڑی دھوم ہے لیکن وہ اپنے پڑوسیوں کے ساتھ بدزبانی کرتی ہیں۔ حضور نے فرمایا وہ جہنم میں پڑے گی۔ اس نے کہا یا رسول اللہ فلاں عورت کے روزے، صدقہ اور نماز کی کمی کی شکایت ہے، کچھ پنیر کے ٹکڑے وغیرہ صدقہ کر دیتی ہے لیکن پڑوسیوں کے ساتھ بدزبانی نہیں کرتی۔ حضور نے فرمایا وہ جنت میں داخل ہوگی۔

**تقویٰ اور مظاہر تقویٰ**

بعض لوگ بعض مظاہر تقویٰ کو عین تقویٰ سمجھ بیٹھے ہیں اور اپنا سارا زور انہی چیزوں پر صرف کرتے ہیں، مثلاً ازار کا ٹخنوں سے اونچا ہونا، داڑھی کا لمبا ہونا، لبوں کا ترشا ہوا ہونا۔ پھر اس فہرست میں اپنے جی سے کچھ اس کے اور مناسبات بھی جمع کر لیتے ہیں، مثلاً صورت کی خستہ حالی، لباس کی بدوضعی، لب ولہجہ کی مصنوعی مسکینی، ملنے جلنے میں اظہار تذلل، اٹھنے بیٹھنے میں نمائش تقویٰ اور قیام وقعود میں اظہار خشیت۔ ان کا تقویٰ بس انہی چیزوں سے عبارت ہوتا ہے اور انہی چیزوں کو تقویٰ کا پیمانہ بنا کر اسی سے وہ

دوسروں کو ناپتے ہیں اور جن کے اندر یہ باتیں اپنے معیار کے مطابق نہیں پاتے ان کو حقیر خیال کرنے لگتے ہیں، حالانکہ بسا اوقات ان لوگوں کی زندگیاں جن کو یہ حقیر سمجھتے ہیں حدود الٰہی کے احترام میں ان سے زیادہ متوازن ہوتی ہیں لیکن چونکہ تقویٰ کی بعض اشکال میں یہ ان کے معیار پر پورے نہیں اترتے اس وجہ سے یہ لوگ ان کو خاطر میں نہیں لاتے۔

ان لوگوں کی مثال بالکل ایسی ہے کہ ایک شخص اپنے گھر کے چراغ کو اس کی مرکزی جگہ سے اتار کر کسی ایک گوشہ میں رکھ دے۔ اس کا نتیجہ یہ تو ضرور ہوگا کہ گھر کا وہ گوشہ زیادہ روشن ہو جائے گا لیکن دوسرا نتیجہ یہ بھی ہوگا کہ بقیہ گھر بالکل تاریک ہو جائے گا۔ اس کے برعکس دوسرا شخص جو اپنے گھر کے چراغ کو اس کی مرکزی جگہ ہی پر رکھتا ہے اگر اس کے گھر کا کوئی گوشہ زیادہ منور تو نہیں ہوگا لیکن اس کے تمام اطراف میں روشنی ایک موزوں مقدار میں پھیلے گی۔ پس جو لوگ بعض مظاہر تقویٰ کو عین تقویٰ سمجھ بیٹھتے ہیں وہ اپنے تقویٰ کے چراغ کو اپنے دل کے طاق سے، جو مرکز ہے، اتار کر اپنے جسم کے اطراف میں سے کسی گوشہ میں رکھ دیتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کا وہ طرف تو روشن ہو جاتا ہے لیکن بقیہ سارے اطراف میں وہی تاریکی ہوتی ہے جو ایک بے چراغ گھر میں ہوا کرتی ہے۔ جو لوگ اس طرح کی غلط فہمی میں مبتلا تھے ان کو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے متنبہ فرمایا کہ وہ تقویٰ کا مرکز اطراف و اعضاء کو نہیں بلکہ دل کو بنائیں تاکہ ان کے تمام اطراف روشن ہوں اور ان لوگوں کو حقیر نہ خیال کریں جن کا کوئی ایک گوشہ ہر چند ان کی طرح روشن نہیں ہے لیکن ان کے کسی گوشۂ زندگی میں بھی ظلمت اور فساد کا شائبہ نہیں ہے۔ اس حقیقت کو سامنے رکھ کر ذیل کی حدیث پر غور فرمائیے۔

| | |
|---|---|
| عن ابی ہریرۃ قال رسول | حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے |
| اللہ صلی اللہ علیہ وسلم | کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا |
| المسلم اخوا المسلم | کہ مسلمان، مسلمان کا بھائی ہے، |
| لا یظلمہ ولا یخذلہ | نہ اس پر ظلم کرے، نہ اسے چھوڑے |
| ولا یحقرہ، التقوی | نہ حقیر جانے، تقویٰ یہاں ہے |
| ھٰھنا ردیشیر الی | (حضور نے دل کی طرف اشارہ فرمایا اور |
| صدرہ ثلث مرات) | تین بار فرمایا) کسی شخص کے لیے یہ برائی |
| بحسب امرئ من الشر | کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو |
| ان یحقر اخاہ المسلم کل المسلم | حقیر جانتا ہے۔ مسلمان کی ہر چیز مسلمان |
| علی المسلم حرام دمہ ومالہ | پر حرام ہے۔ اس کا خون بھی، اس |
| وعرضہ (رواہ مسلم) | کا مال بھی، اس کا ناموس بھی۔ |

یہ تقویٰ جس کا مرکز دِل ہو، جو انسان کی زندگی کے تمام اطراف کو روشن کرے، جو ہر شعبۂ زندگی میں اس کو اللہ کے حدود کا پابند بنائے، جس میں کامل توافق ہو، کامل اعتدال ہو، جو نہ ایک قدم اللہ کی حد سے آگے بڑھنے دے، نہ ایک قدم اس سے پیچھے ہٹنے پر راضی ہو، جو دل کو مجبور کرے کہ وہی سوچے جو سوچنا چاہیے۔ آنکھوں کو مجبور کرے کہ وہی دیکھیں جو دیکھنا چاہیے، کانوں کی نگرانی کرے کہ وہی سنیں جو سننا چاہیے، زبان کی حفاظت کرے کہ وہی بولے جو حق ہے، اور ہاتھ پاؤں کی دیکھ بھال کرے کہ اسی راہ میں اُٹھیں جو اللہ نے انسان کے لیے کھولی ہیں، بطن و فروج پر پہرہ بٹھا دے۔ یہ کسی حرام کو حلال یا کسی حلال کو حرام نہ کر لیں۔ جو خدا کی صحیح معرفت، آخرت کے سچے خوف، احکامِ الٰہی کے سچے جذبۂ احترام کے ساتھ، جو انسان کے ظاہر میں بھی، اور

اس کے باطن میں بھی ہو، خلوت میں بھی ہو اور جلوت میں بھی ہو۔ یہ تقویٰ ہے جس کی تعلیم نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے۔ یہی تقویٰ ہے جو انسانی زندگی کے ہر شعبہ کو رونق و جمال بخشتا ہے (اوصیک بتقوی اللہ فانہ ازین لامرک کلہ) یہی تقویٰ ہے جس کو قرآن میں لباس سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ جس طرح لباس زندگی کو سردی اور گرمی سے اور میدانِ جنگ میں خطرات سے بچاتا ہے اسی طرح یہ بھی انسان کو مادی وروحانی مہالک سے بچاتا ہے، جس طرح لباس انسان کی ستر پوشی کرتا ہے اسی طرح یہ بھی انسان کو معاصی سے بچا کر اس کی پردہ پوشی کرتا ہے اور پھر جس طرح لباس انسان کو زینت و جمال بخشتا ہے اسی طرح تقویٰ بھی انسان کی ساری زندگی کو سنوار دیتا ہے۔ یہی وہ تقویٰ ہے جس کی تعلیم دینے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابو ذرؓ کو برابر چھ روز تک متنبہ کرتے رہے کہ غور سے سننا کچھ باتیں کہنی ہیں اور چھ روز کے بعد زبان حق ترجمان جو گویا ہوئی تو پہلی بات یہ ارشاد ہوئی کہ اوصیک بتقوی اللہ فی سر امرک وعلانیتہ۔

# تقویٰ کی تعلیم کا طریقہ

اوپر کی دو فصلوں سے یہ بات تو واضح ہوگئی کہ تقوی درا صل حدود الٰہی کی نگرانی و حفاظت کا نام ہے۔ جو شخص زندگی کے سفر میں، ہر مرحلہ پر، یہ جاننے کی کوشش کرے کہ خدا نے اس کے بڑھنے اور رکنے کے لیے کیا حدود قائم کیے ہیں اور پھر خدا اور روز آخرت کے ڈر سے، جلوت و خلوت میں، ان حدود کی نگرانی کرے اور دیدہ و دانستہ کسی حد کو توڑنے کی جرأت نہ کرے وہ متقی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ بات کس طرح حاصل ہو کہ آدمی اپنی زندگی کے ہر شعبہ میں — خواہ اس کا تعلق پرائیویٹ زندگی سے ہو یا پبلک سے، مسجد سے ہو یا بازار سے، اخلاق سے ہو یا سیاسیات سے، اسی طرح اپنے سارے معاملات میں، خواہ ان کا تعلق غریب سے ہو یا امیر سے، دوست سے ہو یا دشمن سے، عزیز سے ہو یا بیگانہ سے، علیٰ ہذا القیاس ہر حال میں خواہ غصہ میں ہو یا محبت میں، تنگی میں ہو یا فراخی میں — خدا کے قائم کیے ہوئے حُدود کا اس طرح پابند ہو جائے کہ اگر کبھی جہالت سے بال برابر بھی اس کی پابندی میں فرق آجائے تو ہوش آتے ہی اس وقت تک کے لیے اس پر کھانے اور سونے کی لذت حرام ہو جائے جب تک وہ اپنے غلط سمت میں اٹھائے ہوئے قدم کو واپس نہ لے اور استغفار و توبہ کے ذریعے سے اصلاح مافات نہ کرلے؟

یہ سوال نہایت اہم ہے۔ اسی سوال کا صحیح جواب دین کے خزانہ کی اصلی کلید

ہے اور اسی سوال کے جواب سے یہ بات واضح ہو گی کہ ہماری خانقاہیں، جو تقویٰ پیدا کرنے کا واحد ذریعہ خیال کی جاتی ہیں، اس مقصد کے لیے کس حد تک مفید ہیں۔

انبیاء علیہم السلام کا خاص کام | دنیا میں انبیاء علیہم السلام کا گروہ وہ گروہ ہے جس کا مخصوص کام ہی تقویٰ کی دعوت اور اس کی تعلیم ہے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ابتدائے وحی میں حکم ہوا کہ یَاۤ اَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَاَنْذِرْ (اے چادر لپیٹنے والے کھڑا ہو اور لوگوں کو ڈرا) حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذمہ پہلے ہی روز جو کام سپرد کیا گیا یہی تھا کہ وہ فرعون کی قوم کو تقویٰ کی دعوت دیں۔ اِذْ نَادٰی ربک موسیٰ ان ائت القوم الظلمین، قوم فرعون الا یتقون (جب کہ تیرے رب نے پکارا موسیٰ کو کہ ظالم قوم کے پاس جاؤ، فرعون کی قوم کے پاس، کیا وہ تقویٰ نہیں اختیار کریں گے) حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت کا ذکر ان الفاظ کے ساتھ ہوا ہے۔ کَذَّبَتْ قَوْمُ نُوْحِ نِ الْمُرْسَلِیْنَ۔ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ نُوْحٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ، اِنِّیْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوْنِ (نوح کی قوم نے رسولوں کو جھٹلایا، جب کہا ان کے بھائی نوح نے کہ تم تقویٰ نہیں اختیار کرتے، میں تمھارے لیے ایک رسول امین ہوں، پس اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو) بعینہ یہی بات ہود کی دعوت میں دو مرتبہ صالح کی دعوت میں دو مرتبہ اور لوط و شعیب علیہم السلام کی دعوت میں دو دو مرتبہ بیان ہوئی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ تقویٰ تمام انبیائے کرام کی دعوت کا بالکل ابتدائی نقطہ ہے۔ ہر نبی جو آتا ہے وہ اپنی قوم کو جس بات کی سب سے پہلے دعوت دیتا ہے وہ یہی بات ہے کہ اے لوگو تقویٰ اختیار کرو۔ پس تقویٰ کی تعلیم کا صحیح طریقہ معلوم کرنے کے لیے یہ دیکھنا چاہیے

کہ حضرات انبیائے کرام لوگوں میں کس طرح تقویٰ پیدا کرتے ہیں۔

**انبیا کا طریقۂ تعلیم تقویٰ** | ہم نے جہاں تک حضرات انبیاء کے طریقۂ تعلیم تقویٰ کو قرآن مجید سے سمجھا ہے وہ یہ ہے کہ یہ حضرات اپنے زمانہ کی فسق و فجور سے بھری ہوئی دنیا پر جب نظر ڈالتے ہیں اور انسان کی خدا سے بغاوت و سرکشی اور شہواتِ نفس کی پیروی میں آزادی و بے قیدی کے اسباب پر غور کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان پر یہ حقیقت واضح فرماتا ہے کہ انسان کی ان تمام سرکشیوں اور تعدیوں کی تہ میں تین چیزیں کام کر رہی ہیں۔ پہلی یہ کہ لوگوں میں خدا اور اس کی صفات کا تصوّر بالکل غلط ہو کے رہ گیا ہے۔ دوسری یہ کہ لوگوں میں اس زندگی کے بعد کسی اور زندگی کا یا تو سرے سے تصوّر ہی نہیں ہے اور اگر ہے تو اس تصور میں ایسی خرابیاں پیدا ہو چکی ہیں کہ انسان کی عملی زندگی پر اس کی گرفت بالکل باقی نہیں رہی ہے۔ تیسری یہ کہ لوگوں میں اللہ تعالیٰ کے حدود و محارم کا علم ہی سرے سے مٹ گیا ہے، لوگ جانتے ہی نہیں کہ ان کے نفس کی خواہشوں اور دل کی چاہتوں پر کوئی روک بھی ہے۔ اس وجہ سے حضرات انبیائے کرام اپنی ساری قوت ان تینوں چیزوں کی اصلاح پر صرف کرتے ہیں اور جس رفتار سے وہ خدا اور اس کی صفات، آخرت اور اس کے نتائج، احکام الٰہی اور اس کے مصالح لوگوں پر واضح کرتے جاتے ہیں اسی رفتار سے لوگوں میں تقویٰ پیدا ہونے لگتا ہے یہاں تک کہ جب یہ اپنے کام سے فارغ ہو کر دنیا سے رخصت ہوتے ہیں تو اپنے پیچھے متقیوں کا ایک ایسا گروہ چھوڑ جاتے ہیں جو مدتوں تک اس تقویٰ کی حرارت لوگوں میں باقی رکھتا ہے۔

یہاں ہم ان تینوں چیزوں کی کسی قدر تفصیل کر دینا چاہتے ہیں تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ خدا، آخرت اور حدودِ الٰہی کے علم میں کس طرح کی غلطیاں ہیں

جن کی حضرات انبیائے کرام کو اصلاح کرنی پڑتی ہے اور جن کی اصلاح کے بغیر تقویٰ کا پیدا ہونا ناممکن ہے۔

خدا کے تصوّر کی تصحیح | پہلی چیز یعنی خدا کے تصوّر کا جب یہ حضرات اپنے گرد و پیش کی دنیا پر نظر ڈال کر جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یا تو لوگ سرے سے خدا کو مان ہی نہیں رہے ہیں یا مان رہے ہیں تو اس طرح مان رہے ہیں کہ اس طرح ماننے اور نہ ماننے میں نتیجہ کے لحاظ سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ مثلاً جو لوگ خدا کو مانتے ہیں وہ صرف اس حد تک مانتے ہیں کہ وہ زمین و آسمان کا خالق ہے یہ نہیں مانتے کہ وہی تنہا سب کا مالک اور حاکم بھی ہے۔ یا یہ تو مانتے ہیں کہ ہر چیز کو وجود اسی نے بخشا ہے لیکن یہ نہیں مانتے کہ وہی سب کا محافظ و نگران بھی ہے۔ ان کے نزدیک اس بات میں کوئی قباحت نہیں ہے کہ آسمان کے عرش حکومت پر تو وہ خود متمکن ہو اور زمین کا انتظام اپنے دوسرے مقربین کے حوالہ کر کے اس سے بالکل غیر متعلق ہو جائے۔ اسی طرح وہ خدا کو بھی مانتے ہیں اور اس کے ساتھ اس کے دوسرے سینکڑوں شریکوں کو بھی مانتے ہیں جن کو اس کے دربار میں ایسی رسائی اور تقرب حاصل ہے کہ جس کو چاہیں معاف کرا دیں اور جس کو چاہیں سزا دلا دیں۔ اس کی عبادت کا حق ان کے نزدیک مجرد اس بات سے ادا ہو جاتا ہے کہ مخصوص اوقات میں ان کی پوجا کر لی جائے یا اس کو خوش کرنے کے لیے اس کے حضور میں کوئی نذر گزران دی جائے یا کوئی قربانی پیش کر دی جائے، اس عبادت کے مقتضیات میں سے نہ تو یہ بات ہے کہ تنہا اسی کی اطاعت اور غلامی کی جائے اور نہ ان کے نزدیک خدا کی صفات کا یہ کوئی لازمی تقاضا ہے کہ وہ خلق کی ہدایت کے لیے کوئی قانون و کتاب اور کوئی نبی و رسول بھیجے اور انسانوں پر اس کی اطاعت واجب ہو

علی ہذا القیاس وہ خدا کو خالق تو مان لیتے ہیں لیکن یہ نہیں مانتے کہ وہ مارنے کے بعد دوبارہ پیدا بھی کر سکتا ہے، یا انسان کے تمام کھلے اور چھپے سے واقف بھی ہے، یا اس کے ہر کام میں حکمت ہے یا وہ عادل اور قسط کو قائم کرنے والا ہے یا دوسروں کے خوف و لحاظ اور ان کی مدد و اعانت سے بالکل مستغنی ہے۔ ظاہر ہے کہ خدا کو نہ ماننے والے اور اس طرح ماننے والے نتیجہ کے لحاظ سے — یعنی خدا سے بے خوفی میں — دونوں برابر ہیں۔ پہلا گروہ اس وجہ سے بے پروا ہے کہ وہ خدا کو مان ہی نہیں رہا ہے اور دوسرا اس وجہ سے مستغنی ہے کہ اس نے خدا سے بچنے کے لیے صدہا چور دروازے پیدا کر لیے ہیں اس وجہ سے انبیائے کرام پہلے گروہ میں تو خدا کا اعتقاد پیدا کرتے ہیں اور دوسرے گروہ کے عقیدہ کی اصلاح کی کوشش کرتے ہیں کیونکہ جب تک خدا پر سچا اور پکا ایمان نہ ہو اور وہ ایمان شرک کی تمام آلائشوں سے بالکل پاک نہ ہو اس وقت تک خدا سے تقویٰ ایک بالکل بے معنی لفظ ہے۔ جو شخص خدا کو تنہا مالک اور حاکم مان ہی نہیں رہا ہے آخر وہ اس کی اطاعت و بندگی کیوں کرے؟ جو شخص اس کو علیم و خبیر یقین ہی نہیں کر رہا ہے وہ خلوت و جلوت میں اس سے اس طرح ڈرتا کیوں رہے کہ اس کے کسی حکم کی ادنیٰ خلاف ورزی بھی نہ ہونے پائے؟ اور بالفرض وہ پبلک میں کسی مصلحت سے کوئی کھلی ہوئی نافرمانی نہ کرے لیکن آخر تنہائی میں اس کا خوف اپنے اوپر کیوں مسلط رہنے دے؟ جو شخص اس بات پر عقیدہ رکھتا ہی نہیں کہ خدا عادل اور قسط کو قائم کرنے والا ہے وہ ظلم و ناانصافی سے کیوں ڈرے؟ جو شخص اس بات کا قائل ہی نہیں کہ خدا کو ہماری روزمرہ زندگی سے کوئی تعلق ہے اور اس نے ہماری اس زندگی کو حدود کے اندر پابند رکھنے کے لیے کچھ قوانین اتارے

ہیں، آخر وہ خدا سے ہر قدم پر کانپتا کیوں رہے گا؟ جس شخص کا اس بات پر ایمان ہی نہیں کہ خدا ہی حاکم علی الاطلاق، بادشاہ اور قانون ساز ہے، آخر وہ اپنی یا دوسروں کی حکومت اور قانون سازی کو بغاوت کیوں سمجھے گا؟ اس وجہ سے تقویٰ پیدا کرنے کے لیے سب سے مقدم چیز یہ ہے کہ خدا کی ذات، اس کی صفات اور اس کے حقوق کا صحیح صحیح علم پیدا کیا جائے۔ اس کے بغیر تقویٰ پیدا کرنے کی ساری تدبیریں بالکل اُپری ہوں گی جن سے ممکن ہے خانقاہی قسم کا ایک بالکل غیر متوازن تقشف تو پیدا ہو جائے لیکن وہ تقویٰ ہرگز پیدا نہیں ہو سکتا جو حدود الٰہی کی کامل محافظت سے عبارت ہے اور جس کو پیدا کرنے کے لیے حضرات انبیائے کرام تشریف لائے تھے۔

عقیدۂ آخرت کی تصحیح (۲) دوسری چیز یعنی عقیدۂ آخرت کا، جب انبیاء کرام جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ لوگ یا تو سرے سے موت کے بعد کسی زندگی اور روز حساب کے قائل ہی نہیں رہے ہیں اور اگر قائل ہیں تو صرف ایک مفروضہ کے درجہ میں قائل ہیں اور یہ مفروضہ بھی ان کے اندر خدا اور اس کے حدود کا احترام اور خوف پیدا کرنے میں بالکل بے اثر ہے کیونکہ اگر ایک طرف وہ یہ مانتے ہیں کہ اس زندگی کے بعد کوئی اور زندگی ہے جس میں اپنے اعمال کی جواب دہی کرنی پڑے گی تو دوسری طرف شرکاء و شفعاء کی شفاعت کے بھی قائل ہیں جن کی نسبت ان کا اعتقاد ہے کہ وہ خدا کے ہاں اس قدر زور و اثر رکھتے ہیں کہ وہ اپنے پرستاروں کو بہرحال خدا سے بخشوا لیں گے۔ کچھ لوگ ایسے ہیں جو اپنے نسب ہی کو اپنی نجات کے لیے بالکل کافی سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ان کے آباء و اجداد خدا کے محبوب تھے اس وجہ سے وہ بھی اللہ کے محبوب اور چہیتے بن گئے ہیں، وہ اولاً تو خدا کی جہنم کے

سزاوار نہیں اور اگر سزاوار ٹھہرے بھی تو زیادہ سے زیادہ چند دنوں کے لیے بعض دوسرے اس غلط فہمی میں پڑے ہوئے ہیں کہ انسان تو ازلی گنہگار ہے، اس کے پاک اور متقی ہونے کا کوئی امکان ہی باقی نہیں رہا ہے، اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انسان کے ساتھ عدل کا معاملہ نہیں کیا بلکہ رحم کا معاملہ کیا ہے اور اس کی نجات کے لیے اس نے اپنے محبوب بیٹے کو بھیجا جو سولی پر چڑھ کر تمام انسانوں کے لیے کفارہ بن گیا، اب انسانوں کی نجات کے لیے کسی پرہیزگاری اور تقویٰ، کسی بندگی و اطاعت کی ضرورت نہیں ہے۔ صرف اس بات کی ضرورت ہے کہ لوگ خدا کے بیٹے پر ایمان لائیں، جو اس پر ایمان لائے گا وہ نجات پائے گا اگرچہ اس سے ایک نیکی بھی صادر نہ ہوئی ہو اور جو شخص اس پر ایمان نہیں لائے گا وہ نجات سے محروم رہے گا اگرچہ اس سے ایک برائی بھی سرزد نہ ہوئی ہو۔ بعض دوسرے ایسے ہیں جو اگرچہ آخرت کے قائل ہیں لیکن اس کو اس قدر دور سمجھتے ہیں کہ اس کے لیے کسی تقویٰ اور پرہیزگاری کا اہتمام بالکل فضول سمجھتے ہیں۔ بعض ایسے ہیں جو نجات اپنے گروہ کا حق سمجھتے ہیں، جو ان کے اندر شامل ہے اس کی نجات ہو گی خواہ اس کے اعمال کچھ ہوں، جو ان سے باہر ہے وہ نجات سے محروم ہے اگرچہ وہ کتنا ہی نیک ہو۔ ظاہر ہے کہ جو شخص آخرت کا سرے سے قائل ہی نہیں ہے اور اپنے آپ کو بالکل غیر مسئول اور مطلق العنان سمجھ رہا ہے اس سے تقویٰ کا مطالبہ بالکل بے معنی ہے اور اگر آخرت کا تو قائل ہے لیکن غلط شفاعت کے چکر میں پڑا ہوا ہے یا نسب کے غرور اور گروہ کی عصبیت میں مبتلا ہے یا خدا کے رحم اور عدل کا تصور اس کے دماغ میں غلط ہو کے رہ گیا ہے تو اس کو بھی تقویٰ کی دعوت دینا بالکل بے معنی ہے۔ ان میں سے ہر دا ہمہ تقویٰ کی جڑ اکھاڑ دینے کے

لیے کافی ہے۔ جو شخص ایک ایسی شفاعت کا یقین لیے بیٹھا ہوگا جو باطل کو حق اور حق کو باطل بنا دے گی اس کو خدا سے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے؟ جو شخص اس خبط میں مبتلا ہے کہ اسے جو کچھ حاصل ہے اس کے نسب اور اس کے استحقاق ذاتی کا کرشمہ ہے، دنیا میں بھی حاصل ہے اور آخرت میں بھی حاصل رہے گا اسے خدا کی پرستش کی کیا پروا ہو سکتی ہے؟ اسی طرح اگر کسی کے دماغ میں خدا کے رحم کا ایک غلط تصور پیدا ہو گیا ہے اور وہ خدا کے عدل کو اس کے رحم ہی کا مظہر نہیں سمجھ رہا ہے تو وہ خدا سے ڈرے گا کیوں؟ ایسے لوگوں کے اندر تقویٰ پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ان کے اندر اول تو عقیدۂ آخرت کو راسخ کیا جائے، ثانیاً ان تمام رخنوں کو بند کیا جائے جو اس عقیدے کے تمام اثر کو بالکل باطل کر دینے والے ہیں۔ چنانچہ حضرات انبیائے کرام ان لوگوں کو پہلے ایمان بالآخرت کی دعوت دیتے ہیں اور آخرت کے قطعی ہونے پر آفاق و انفس سے ایسے دلائل پیش کرتے ہیں جن کا انکار صرف ایک ہٹ دھرم ہی کر سکتا ہے اور ساتھ ہی ان تمام غلط توہمات کی ایک ایک کر کے بیخ کنی کرتے ہیں جو انسان میں غلط قسم کی بے پروائی اور جسارت پیدا کرتے ہیں۔ مثلاً شفاعت کے غلط تصور کی پوری وضاحت کے ساتھ تردید کرتے ہیں کہ خدا کے ہاں کوئی آدمی یا فرشتہ بغیر اس کی اجازت کے کسی کی شفاعت نہیں کر سکے گا اور جس کو شفاعت کی اجازت دی جائے گی وہ صرف سچی بات کہہ سکے گا، کوئی بات خلاف حقیقت نہ کہے گا۔ اور کوئی شفاعت نہ حق کو باطل کر سکے گی نہ باطل کو حق، علیٰ ہذا القیاس نسب و حسب خدا کے ہاں کچھ کام نہ آئے گا وہاں صرف عمل و اطاعت کی پوچھ ہو گی، جو لوگ عمل کے لحاظ سے بھرپور ہوں گے وہ خدا کے یہاں اسی لحاظ سے اونچے سے اونچا درجہ پائیں گے اگرچہ نسب و

خاندان کے اعتبار سے وہ نیچے درجے میں گنے جاتے ہوں اور جو لوگ عمل سے خالی ہوں گے وہ خدا کے ہاں محروم و نامراد ہوں گے اگرچہ انھیں حضرت ابراہیم علیہ السلام جیسے جلیل القدر پیغمبر ہی کی اولاد میں سے ہونے کا شرف حاصل ہو نیز وہ یہ حقیقت بھی اچھی طرح واضح کر دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہی کا یہ تقاضا ہے کہ وہ ایک انصاف کا دن لائے جس میں مظلوموں کی دادرسی کرے اور ظالموں کو ان کے کیے کا بدلہ دے۔ اس کی رحمت کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ ظالموں اور سرکشوں کو معاف کر دے۔ اگر وہ ایسا کرے تو نہ وہ عادل ہے نہ رحیم ہے۔

**شریعت کی تجدید** (۳) ان دونوں کاموں سے فارغ ہونے کے بعد حضرات انبیائے کرام جب اللہ تعالیٰ کے حدود کا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ حدود و قوانین شریعت کا بڑا حصہ بالکل مٹ چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا حرام کیا ہوا حلال ہے۔ اس کا حلال کیا ہوا حرام ہے۔ جو بات اس کی نظروں میں مبغوض تھی وہ محبوب بن گئی ہے، جو محبوب تھی مبغوض بن چکی ہے۔ زندگی کے ہر گوشہ میں معروف منکر بن چکا ہے اور منکر نے معروف کی جگہ لے رکھی ہے۔ معاش میں معیشت میں، عدل میں، سیاست میں، تہذیب میں، معاشرت میں، تعلیم میں، تربیت میں، عادات و اخلاق میں، اٹھنے بیٹھنے میں، چلنے پھرنے میں، ہنسنے بولنے میں ہر جگہ شیطان نے انڈے بچے دے دیے ہیں اور سارا نظام زندگی فاطر اور فطرت کے منشا کے بالکل خلاف ہو کے رہ گیا ہے۔ چنانچہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے زندگی کے ایک ایک گوشہ کی چھان بین کرتے ہیں اور ہر گوشہ کو غیر فطری اور غیر الٰہی عادات و رسوم سے بالکل پاک کر کے اس کو فطرت اور شریعت کے بالکل مطابق کرتے ہیں۔

حضرات انبیائے کرام علیہم السلام کے یہاں تقویٰ پیدا کرنے کا طریقہ یہی ہے۔

آنحضرت صلعم کی بعثت کی زندگی پر ایک سرسری نظر ڈال کر ہر آدمی اس بات کی تصدیق کر سکتا ہے۔ مکہ کی زندگی میں آپ نے جس طرح لوگوں کو تقویٰ کی تعلیم دی ہے۔ مکی سورتوں میں اس کی پوری تفصیل موجود ہے، ہر شخص ان سورتوں کو سرسری طور پر پڑھ کر معلوم کر سکتا ہے کہ یہ سرتاسر خدا، اس کی توحید، اس کی صفات حسنیٰ اور آخرت کے دلائل واحوال سے لبریز ہیں اور اتنی قوت و شدت اور اتنی گوناگون شکلوں میں ان سورتوں کے اندر یہ مطالب بیان ہوئے ہیں کہ جن لوگوں کو اول اول یہ سورتیں سنائی گئیں ان کے لیے اس دعوت سے بے پروا رہنا اور اپنی طفل تسلیوں کے فریب میں بدستور غافل پڑے رہنا ناممکن ہو گیا۔ ان کے لیے صرف دو ہی صورتیں ممکن رہ گئی تھیں یا تو داعی کی دعوت پر لبیک کہیں اور غفلت کے بستروں کو چھوڑ کر خدا کی طرف بھاگیں یا پھر پوری قوت سے اس پراثر دعوت کو دبانے کی کوشش کریں جس نے ان کے لیے چین کی نیند حرام کر دی ہے۔ چنانچہ ان سورتوں کے نزول کے بعد پورے عرب میں ایک شخص بھی اسلامی دعوت کے بارہ میں غیر جانبدار نہیں رہ گیا تھا۔ یا تو اس کا جان و دل سے مخالف بن کر اٹھ کھڑا ہوا تھا اور اس کو مٹائے بغیر گویا اس کے لیے خواب و خور حرام تھا یا اتنا شدید حامی بن گیا تھا کہ سب کچھ گوارا تھا لیکن اگر نہیں گوارا تھی تو یہ بات کہ کوئی قدم بھی تقویٰ کے خلاف اٹھے۔ تقویٰ کا اس درجہ شدید احساس کہ خدا کے حکم کی تعمیل کی راہ میں ہر جوکھم آسان ہو جائے، صرف اس چیز کا نتیجہ تھا کہ خدا اور آخرت کے بارے میں ان کا علم صاف ہو گیا تھا۔ اتنا صاف کہ اس کے بعد ان کے لیے خدا کی طرف بھاگ کھڑے ہونے کے سوا کوئی صورت ہی باقی نہیں رہ گئی تھی۔ وہ جس جمعیت الحمقاء میں اب تک پڑے سو رہے تھے انھیں دفعتہً نظر آیا کہ اس کے

گوشہ گوشہ میں آگ لگ چکی ہے اور اب اگر جان بچانے کی کوئی شکل ہے تو صرف یہی کہ جس دروازہ پر پیغمبر کھڑا بلا رہا ہے اس کا رُخ کیا جائے۔ جو لوگ بظاہر دعوت کی مخالفت پر کمر بستہ تھے ان کی مخالفت بھی ان گھبرائے ہوئے اور بدحواس لوگوں کی دوڑ دھوپ کے مانند تھی جو آگ کے خطرہ سے بچنا چاہتے ہوں لیکن نجات کے جس راستہ کی طرف نبی دعوت دے رہا ہو اس کی طرف جانے سے اس وجہ سے گھبراتے ہوں کہ اس راہ پر چل کر اپنی انانیت اور اپنی باطل خواہشوں کو باقی رکھنا ناممکن تھا اور اس قربانی کے لیے وہ تیار نہیں تھے۔

**مذکورہ دعاوی پر قرآن سے دلائل** اس ساری تفصیل سے دو باتیں واضح ہوئیں۔ پہلی یہ کہ اللہ تعالیٰ کی صحیح معرفت اور آخرت کا صحیح علم ہی آدمی کے اندر وہ بے چینی پیدا کرتا ہے جس سے وہ خدا کی طرف بھاگتا ہے جو تقویٰ کی اصل حقیقت ہے اور دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ اللہ تعالیٰ کی صفات اور آخرت کا صحیح علم ہی وہ پاسبان ہے جو آدمی کے دل کے اندر بیٹھ کر اس کو اس بات پر مجبور کرتا ہے کہ وہ خدا کے احکام و قوانین کی پوری پابندی کرے اور کسی جگہ بھی سرِ مو اس کے حدود سے تجاوز نہ کرے۔ اگرچہ یہ باتیں بالکل واضح ہیں لیکن قرآن مجید سے یہاں ہم بعض آیتیں نقل کیے دیتے ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ تقویٰ کے پیدا ہونے اور باقی رہنے کا انحصار سرتاسر اللہ تعالیٰ کی صفات اور آخرت کے صحیح علم و یقین پر ہے۔

پہلے ہم بعض وہ آیتیں نقل کرتے ہیں جن سے معلوم ہوگا کہ تقویٰ کا پیدا ہونا اللہ تعالیٰ کی صحیح صفات کے علم پر منحصر ہے۔ سورۂ بقرہ میں طلاق کے احکام و قوانین کے بیان کے بعد فرمایا ہے۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوا اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (۲۳۱- بقرہ)

اللہ سے ڈرو اور یقین رکھو کہ اللہ ہر بات کو جاننے والا ہے۔

اس آیت میں تقویٰ کا حکم دینے کے بعد اللہ تعالیٰ کی صفت علم کی یاددہانی کی گئی ہے۔ کیونکہ خدا کے حدود کی پوری حفاظت وہی کر سکتا ہے جو یہ مانتا ہو کہ اللہ تعالیٰ ہر بات سے باخبر ہے۔ یہ چیز دو مختلف پہلوؤں سے آدمی کے اندر تقویٰ پیدا کرتی ہے۔ جہاں کہیں انسان کا نفس کسی خیانت یا جسارت پر اکساتا ہے وہاں اللہ تعالیٰ کی صفت علم کا تذکرہ آدمی میں خدا کا خوف پیدا کرتا ہے اور جہاں کہیں آدمی اللہ تعالیٰ کے حدود کی پابندی کے لیے بازیاں کھیلتا ہے، مصائب جھیلتا ہے، نقصانات گوارا کرتا ہے وہاں یہ یقین کہ اللہ تعالیٰ اس کی ان ساری جانبازیوں کو دیکھ رہا ہے اس میں اعتماد و قوت پیدا کرتا ہے۔

پھر احکام رضاعت کے ذکر کے بعد فرمایا

اِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْا اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّا اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (بقرہ - ۲۳۳)

اگر تم چاہو کہ اپنے بچوں کو دودھ پلواؤ تو تم پر کوئی حرج نہیں ہے بشرطیکہ ادا کر دو جو تم نے وعدہ کیا ہے دستور کے مطابق اور اللہ سے ڈرتے رہو اور یاد رکھو کہ اللہ جو کچھ تم کرتے ہو اس کو دیکھنے والا ہے۔

اس آیت میں تقویٰ پیدا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کے بصیر ہونے کی یاددہانی کی گئی ہے۔ اس صفت کا علم بھی آدمی میں ان ہی دو پہلوؤں سے

تقویٰ پیدا کرتا ہے۔ جن کا ذکر اوپر ہوا۔

| | |
|---|---|
| وَلْيُمْلِلِ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ | اور چاہیے کہ وہ شخص لکھوائے جس پر حق عائد ہوتا ہے اور اللہ سے ڈرے جو اس کا رب ہے۔ |

اس آیت میں تقویٰ پیدا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی صفت ربوبیت یعنی اس کے مالک و حاکم ہونے کو یاد دلایا گیا ہے۔

| | |
|---|---|
| فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ (البقرہ - ۲۸۳) | پس چاہیے کہ جس شخص کے پاس امانت رکھی گئی ہے وہ امانت ادا کر دے اور اللہ سے ڈرے جو اس کا رب ہے۔ |
| بَلٰى مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰى فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ۔ | ہاں جس نے اپنے عہد کو پورا کیا اور تقویٰ اختیار کیا تو اللہ تعالیٰ متقیوں کو دوست رکھتا ہے۔ |

اس آیت میں اہلِ تقویٰ کی حوصلہ افزائی کے لیے اللہ تعالیٰ کی اس صفت کو یاد دلایا گیا ہے کہ وہ متقین سے محبت کرتا ہے۔

| | |
|---|---|
| يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَاُولٰٓئِكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ وَمَا يَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُّكْفَرُوْهُ وَاللّٰهُ | اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، معروف کا حکم دیتے ہیں۔ منکر سے روکتے ہیں، بھلائی کے کاموں میں مسابقت کرتے ہیں۔ وہی لوگ نیکو کاروں میں سے ہیں اور جو بھلائی کے کام وہ کریں گے اس کا انکار نہ کیا جائے گا |

عَلِیْمٌ بِالْمُتَّقِیْنَ (آل عمران ۱۱۴-۱۱۵) — اور اللہ متقیوں سے باخبر ہے۔

یہاں تقویٰ کے اصلی کام بھی بتا دیے ہیں اور ان کاموں میں جو جو کھم ہے اس کو برداشت کرنے کے لیے جس اعتماد اور قوت کی ضرورت ہے وہ بھی دو لفظوں میں بخش دی ہے کہ اللہ متقین سے باخبر ہے، یعنی جو لوگ تقویٰ کی خاطر قربانیاں کریں گے اللہ تعالیٰ ان سے اچھی طرح باخبر ہے، ان کی محنتوں کا پورا صلہ دے گا۔

| | |
|---|---|
| یٰاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ | اے لوگو اپنے اس رب سے ڈرو جس |
| الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ | نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا۔ |
| نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا | اور بنایا اسی سے اس کا جوڑا اور |
| زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا | پھیلائے ان دونوں سے بہت سے |
| كَثِیْرًا وَّنِسَآءً وَاتَّقُوا | مرد اور بہت سی عورتیں اور اس اللہ |
| اللّٰهَ الَّذِیْ تَسَآءَلُوْنَ | سے ڈرو جس کے واسطے سے تم ایک |
| بِهٖ وَالْاَرْحَامَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ | دوسرے سے طالب مدد ہوتے ہو اور |
| عَلَیْكُمْ رَقِیْبًا۔ | رحم سے، بے شک اللہ تم پر نگران ہے۔ |

یہاں تقویٰ پیدا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت 'رقیب' کو یاد دلایا ہے یعنی وہ ہر شخص کی اور اس کے ہر قول و فعل کی نہایت کڑی نگرانی کر رہا ہے۔

| | |
|---|---|
| وَاِنْ تُحْسِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ | اور اگر تم احسان کرو گے اور تقویٰ |
| اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ | اختیار کرو گے تو اللہ تمہارے اعمال |
| خَبِیْرًا (نساء - ۱۲۸) | کی خبر رکھنے والا ہے |
| وَلَقَدْ وَصَّیْنَا الَّذِیْنَ | اور ہم نے وصیت کی ان لوگوں کو |

| | |
|---|---|
| اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ | جن کو کتاب دی گئی تم سے پہلے |
| وَاِيَّاكُمْ اَنِ اتَّقُوا اللّٰهَ | اور تم کو کہ اللہ سے ڈرو اور اگر |
| وَاِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ لِلّٰهِ | تم کفر کرو گے تو یاد رکھو کہ اللہ ہی |
| مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي | کے لیے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے |
| الْاَرْضِ ۔ | اور جو کچھ زمین میں ہے۔ |

اس آیت میں تقویٰ پیدا کرنے کے لیے اس بات کی یاددہانی کی گئی ہے کہ آسمان وزمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب کا مالک اللہ تعالیٰ ہے۔

| | |
|---|---|
| وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ | اور جو اللہ سے ڈرے گا اس کے لیے |
| لَّهٗ مَخْرَجًا وَّيَرْزُقْهُ | راہ پیدا کرے گا اور اس کو وہاں |
| مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ۔ | سے روزی دے گا۔ جہاں سے اس |
| (الطلاق) | کو گمان بھی نہ ہوگا۔ |

تقویٰ پر قائم رہنے کے لیے، بالخصوص ایسے مواقع میں جہاں آدمی کو مالی ومعاشی مشکلات کا سامنا ہو، اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی اس صفت کو یاد دلایا گیا ہے کہ وہ وہاں سے روزی کا سامان کرتا ہے جہاں سے آدمی کو گمان بھی نہیں ہوتا۔

اب ان آیات پر غور فرمائیے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ تقویٰ پیدا کرنے اور تقویٰ پر قائم رکھنے کے لیے آخرت کا صحیح علم ویقین اور اس کا تذکر ضروری ہے۔

| | |
|---|---|
| وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْا | اللہ سے ڈرو اور یاد رکھو کہ تمھیں |
| اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ وَبَشِّرِ | اس سے ملنا ہے اور مومنین کو |
| الْمُؤْمِنِيْنَ (البقرہ۔ ٢٢٣) | خوش خبری دو۔ |
| وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ | اور اللہ کو یاد کرو گنتی کے چند |

| | |
|---|---|
| مَعْدُوْدَاتٍ فَمَنْ تَعَجَّلَ | دنوں میں تو جس نے جلدی کی دو دنوں |
| فِیْ یَوْمَیْنِ فَلَا اِثْمَ | میں تو اس پر کوئی گناہ نہیں اور |
| عَلَیْہِ وَمَنْ تَاَخَّرَ | جس نے تاخیر کی تو اس پر کوئی گناہ |
| فَلَا اِثْمَ عَلَیْہِ لِمَنِ | نہیں ۔ یہ اس کے لیے جو تقویٰ پر |
| اتَّقٰی وَاتَّقُوا اللّٰہَ | قائم رہے اور تقویٰ اختیار کرو اور |
| وَاعْلَمُوْا اَنَّکُمْ اِلَیْہِ | یاد رکھو کہ تم خدا کے پاس اکٹھے |
| تُحْشَرُوْنَ (۲۰۳ ۔ بقرہ) | کیے جاؤ گے ۔ |
| وَتَعَاوَنُوْا عَلَی الْبِرِّ | ادائے حق اور تقویٰ کے کاموں میں |
| وَالتَّقْوٰی وَلَا تَعَاوَنُوْا | تعاون کرو اور حق تلفی اور زیادتی کے |
| عَلَی الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ | کی باتوں میں تعاون نہ کرو اور اللہ |
| وَاتَّقُوا اللّٰہَ اِنَّ اللّٰہَ شَدِیْدُ | سے ڈرو، بے شک اللہ شدید پاداش |
| الْعِقَابِ (مائدہ ۔ ۲) | والا ہے ۔ |
| فَکُلُوْا مِمَّا اَمْسَکْنَ عَلَیْکُمْ | پس کھاؤ اس میں سے جو تمہارے |
| وَاذْکُرُوا اسْمَ اللّٰہِ | لیے روک رکھیں اور اس پر اللہ کا |
| عَلَیْہِ وَاتَّقُوا اللّٰہَ اِنَّ | نام لو اور اللہ سے ڈرو، بے شک |
| اللّٰہَ سَرِیْعُ الْحِسَابِ ۔ | اللہ جلد حساب چکانے والا ہے ۔ |

ان تمام آیات میں تقویٰ کا مطالبہ کیا ہے اور ساتھ ہی یاد دہانی کی ہے کہ خدا سے ملنا ہے، "اُس کے پاس اکٹھے ہونا ہے،" "وہ سخت پاداش والا ہے،" "جلد حساب چکانے والا ہے ۔" کیونکہ انہی صفات کے یقین اور ان کی یاد داشت سے تقویٰ پیدا ہوتا ہے ۔

**خلاصۂ مباحث** | اس ساری تفصیل سے یہ بات واضح کرنی مقصود ہے کہ

حضرات انبیائے کرام، جن کا اصلی کام ہی لوگوں میں تقویٰ پیدا کرنا تھا، انھوں نے اپنے اپنے زمانوں میں لوگوں کو جس تقویٰ کی دعوت دی ہے۔ وہ تقویٰ یہی تھا کہ لوگ اللہ کے حدود و احکام کے پابند ہو جائیں۔ اس کی نافرمانی و بغاوت سے توبہ کریں، نہ اپنی خواہشوں کی پیروی کریں نہ ان لوگوں کے پیچھے چلیں جو اپنی خواہشوں کے پیچھے چلتے ہیں، زندگی کے تمام گوشوں میں اس قانون کی پیروی کریں جو اللہ نے اتارا ہے اور اس بات سے ڈرتے رہیں کہ اس زندگی کے بعد ایک اور زندگی بھی ہے جس میں ہر شخص کو خدا کے سامنے اپنے اعمال کی جواب دہی کرنی پڑے گی اور ہر شخص کی نیکی یا بدی اس کے سامنے آئے گی۔

اس تقویٰ کو پیدا کرنے کے لیے انھوں نے لوگوں میں اللہ اور روزِ آخرت کا سچا یقین پیدا کیا، خدا اور اس کے اسماء و صفات کی تعلیم دی، جو منکر تھے ان کے انکار کو توڑا، جو متردد تھے ان کے تردد کو دور کیا، جو مشرک تھے ان کے شرک کا ابطال کیا، یہاں تک کہ جو خدا صرف عرش آسمان پر براجمان تھا، نہ زمین کے معاملات کی العیاذ باللہ اسے کوئی خبر تھی، نہ ان سے اس کو کوئی دلچسپی تھی، وہ ایک علیم و خبیر، سمیع و بصیر، حفیظ و رقیب اور عزیز و حکیم خدا بن کر آسمان و زمین کے سارے معاملات کی نگرانی کرنے لگا۔ جس خدا کی نسبت لوگ صرف یہ سمجھتے تھے کہ اس نے پیدا کیا اور پیدا کر کے اس دنیا کے نیک و بد سے بے تعلق ہو گیا ہے اس کو اس حیثیت سے ماننے لگے کہ وہی تنہا اس کائنات پر ہر آن متصرف ہے، اس نے جس طرح لوگوں کو پیدا کیا ہے اور ان کی زندگی کے وسائل مہیا کئے ہیں، اسی طرح ان کی ہدایت کے لیے انبیاء بھی بھیجے ہیں، اور ان کی رہنمائی کے لیے قانون بھی نازل کیا ہے اور جس طرح وہ سب کا

معبود ہے اسی طرح وہ سب کا رب، مالک اور بادشاہ بھی ہے۔ اور جس طرح اس نے یہ زندگی بخشی ہے اسی طرح مرنے کے بعد دوبارہ زندہ بھی کرے گا۔ اور اس زندگی کا حساب بھی لے گا اور وہ دن ایسا ہوگا کہ خدا کے عدل سے کوئی چیز نہ بچا سکے گی، نہ کسی کی دوستی، نہ کسی کی سفارش، نہ کسی کا فدیہ اور نہ کسی کا معاوضہ۔ وہ تنہا مالک ہوگا اور سب مملوک و محکوم ہوں گے، وہ تنہا بادشاہ ہوگا اور سب تابعدار اور رعیت ہوں گے۔

ان باتوں کو دلوں میں راسخ کرنے کے لیے انھوں نے جو طریقہ اختیار کیا وہ ایک طرف تو کمال درجہ علمی و استدلالی تھا، یعنی ہر دعوے کا ثبوت، ہر شبہ کا جواب، ہر اعتراض کی تردید، عقل کی رو سے، تاریخ کے پہلو سے، آفاق کی جہت سے، انفس کی طرف سے۔ اور دوسری طرف کمال درجہ عملی تھا، یعنی توحید، معاد، رسالت کے جو حقائق سامنے آئے اور ان کو جن لوگوں نے قبول کر لیا ان کی ساری زندگیاں انہی اصولوں پر ڈھل گئیں۔ اس کے بعد ان کی زندگی کا کوئی قول و فعل ان اصولوں سے متناقض نہیں رہ گیا۔ وہ اپنی زندگی کے بڑے بڑے مسائل سے لے کر حقیر سے حقیر جزئیات تک میں مومن باللہ، مومن بالآخرت اور مومن بالرسول تھے۔ اگر کوئی چھوٹی سے چھوٹی بات بھی ان کی زندگی کے اندر ان حقائق سے متناقض ہوتی تو وہ کانٹے کی طرح ان کے دلوں میں کھٹکتی اور جب تک وہ نکل نہ جائے اس وقت تک وہ چین نہ لیتے۔ اور کوئی معمولی سے معمولی بات بھی اگر ان کے سامنے پیش کی جاتی، جو ان اصولوں کے مطابق ہوتی، تو وہ اس کو اس طرح لپک کے قبول کرتے گویا وہ اسی متاع گم شدہ کی تلاش میں مدتوں سرگرداں تھے۔

**موجودہ حالات کا جائزہ** ہمارے سامنے بھی ایک دنیا ہے جو فسق و فجور سے

بھری ہوئی ہے جس کے سامنے افکار و نظریات یکسر باطل اور اعمال و افعال یکسر نفس پرستانہ ہیں۔ خدا پر ایمان یا تو سرے سے موجود ہی نہیں ہے یا موجود ہے تو اس میں صد ہا رخنے ہیں۔ آخرت کو لوگ یا تو سرے سے مان ہی نہیں رہے ہیں یا مان رہے ہیں تو اس طرح کہ اس کا ماننا نہ ماننا دونوں برابر ہے۔ اللہ، رسول اور آخرت کا اقرار نہیں بلکہ انکار دین بن چکا ہے اور یہ دینِ انکار والحاد اپنی پشت پر نہایت زبردست فلسفے رکھتا ہے۔ اس کی ترویج و اشاعت کے لیے بڑے بڑے کالج اور بڑی بڑی یونیورسٹیاں قائم ہیں۔ نہایت وسیع الاثر پریس ہے، اور پھر سب سے بڑھ کر نہایت ہی طاقتور سیاسی اقتدار ہے جو تمام امر و نہی کا مالک، تمام وسائل و ذرائع پر متصرف، تمام نفع و ضرر کا خداوند بنا ہوا ہے۔ اس دنیا کے اندر کچھ تھوڑے سے مسلمان بھی جی رہے ہیں جو اس میں شبہ نہیں کہ اللہ کا نام بھی لے لیتے ہیں، رسول کا دم بھی بھرتے ہیں اور آخرت کا ذکر بھی کر دیتے ہیں لیکن اس اعتبار سے دونوں برابر ہیں کہ عملی زندگی سے خدا اور رسول کو دونوں نے الگ کر رکھا ہے۔ مسلمان نام تو خدا اور رسول کا ضرور لیتا ہے لیکن کام انہی کے کرتا ہے جو اللہ اور رسول کے باغی ہیں، علم انہی کے پڑھتا ہے، فلسفہ انھیں کا سیکھتا ہے، تہذیب میں، آداب میں، معاشرت میں تقلید انہی کی کرتا ہے، اپنا مال، اپنا وقت، اپنی قابلیت سب کچھ انہی پر نثار کرتا ہے اور جبراً نہیں بلکہ طوعاً کرتا ہے، صرف کرتا ہی نہیں ہے بلکہ بلکہ اس پر فخر بھی کرتا ہے اور تنہا خود ہی اس فخر کو سمیٹنے نہیں رکھنا چاہتا بلکہ یہ بھی چاہتا ہے کہ اس کی آئندہ نسلیں بھی اس فخر میں سے حصہ پائیں۔ یہ خدا کو ماننے کا حق صرف اس طرح ادا کر دیتا ہے کہ مسجد میں اس کی نماز پڑھ دیتا ہے، اس کے نام پر کچھ زکوٰۃ دے دیتا ہے، مہینہ بھر کے روزے رکھ دیتا ہے باقی

اس کے سوا سارے معاملات زندگی میں وہ جس خدا کی بھی اطاعت کرے اس سے اس کے آسمانی خدا کو کوئی واسطہ نہیں۔ رسول کے ماننے کا حق یہ صرف اس طرح ادا کرتا ہے کہ نمازوں میں ان کی ذات پر درود بھیج دیتا ہے، سال میں عید میلاد کے ایک آدھ جلسے کر دیتا ہے۔ اگر ان کی شان میں کوئی ادنیٰ گستاخی کسی سے صادر ہو جائے تو اخباروں میں اور جلسوں میں ہنگامے برپا کر دیتا ہے۔ باقی رہی یہ بات کہ زندگی کے تمام شعبوں میں وہی واجب الاطاعت اور انہی کا بتایا ہوا طریقہ واجب الاتباع ہے اور ان کے طریقے کے سوا سارے طریقے گمراہی، فسق اور کفر ہیں، یہ اس کے ایمان بالرسول میں داخل نہیں ہے۔ یہ آخرت کو مانتا ہے لیکن اس اطمینان قلب کے ساتھ مانتا ہے کہ لَن تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّا اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً جہنم کی آگ اسے چند دنوں سے زیادہ نہیں چھوئے گی۔ یہ جتنی نافرمانیاں چاہے کرے اور کتنی ہی ٹھنڈے دل سے چاہے کرے، یہاں تک کہ اگر ان نافرمانیوں ہی کو وہ اپنا اور اپنی آل اولاد کا دین بنالے اور اسی دین پر وہ اور اس کی نسلیں جییں اور مریں جب بھی وہ نجات کا حق دار ہے۔ یہ نجات اس کا پیدائشی اور قومی حق ہے یہاں تک کہ کتنے مسلمان ہیں جو شاید اسلام کا نام بھی نہیں جانتے اور دین کے واجبات و فرائض میں سے شاید ایک فرض کو بھی کبھی ادا کرنے کی انھیں توفیق نہیں ہوئی ہوگی تاہم وہ مسلمان ہیں۔

ایک ایسی دنیا میں اگر آپ تقویٰ پیدا کرنا چاہیں تو اس کا صحیح طریقہ کیا ہے؟ اس سوال کے تفصیلی جواب کا یہاں موقع نہیں ہے۔ اس سوال کے جواب کے لیے آپ ہماری کتاب "تزکیہ نفس" کا مطالعہ فرمائیں۔

# حقیقتِ نماز

# فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حضرت مسیح علیہ السلام نے فرمایا ہے: "درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے۔" اس اصول کی سچائی پر تمام دنیا کا اتفاق ہے۔ چنانچہ جب ہم کسی شے کے حُسن و قبح کا فیصلہ کرنا چاہتے ہیں، ہماری نظر فوراً اس کے نتائج و اثرات پر پڑتی ہے۔ اگر وہ موجود ہوتے ہیں اور اچھے ہوتے ہیں، ہم بے تامل اس شے کے اچھے ہونے کا فیصلہ کر دیتے ہیں۔ اگر وہ مفقود ہوتے ہیں یا موجود تو ہوتے ہیں مگر بُرے ہوتے ہیں تو چاہے اُس کے اچھے ہونے پر کتنی ہی دلیلیں قائم کی جائیں ہم اس شے کی اچھائی تسلیم نہیں کرتے۔ زخم میں ٹیس اور ٹپک ہے اس لیے وہ برا ہے کوئی اس کو پیار نہیں کرتا۔ مرہم میں ٹھنڈک اور شفا ہے اس لیے سب اس کو ڈھونڈھتے ہیں۔ کوئی اس کے اچھے ہونے پر ہم سے جھگڑا نہیں کرتا۔

موجودہ زمانے کے لوگ، اسی ترازو سے دینی تعلیمات اور مذہبی احکام کو بھی تولتے ہیں اور جب وہ ان کے وہ اثرات و نتائج موجود نہیں پاتے جو ان کے ساتھ وابستہ بتائے جاتے ہیں تو وہ سرے سے ان احکام کی قدر قیمت ہی سے انکار کر بیٹھتے ہیں۔ چنانچہ نماز کی دینی و دنیاوی برکتوں سے متعلق جو کچھ کہا جاتا ہے اس کو وہ تسلیم نہیں کرتے۔ ان کے سامنے مسلمانوں کا موجودہ اخلاقی و عملی زوال ہے۔ وہ کہتے ہیں، اگر نماز کوئی مفید اور موثر عمل ہے تو مسلمانوں کی

اس حالت کو بدلنا چاہیے، اور اگر یہ حالت نمازیں پڑھنے کے باوجود بھی نہیں بدلتی، مسلمان فساد اخلاق و فساد عمل کی تمام آلودگیوں میں لتھڑے ہوئے ہیں تو نماز ایک فعل عبث ہے، جس کا انسانی زندگی پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

اس کے برعکس مذہبی گروہ کا دعویٰ یہ ہے کہ نماز شخصی اور اجتماعی دونوں زندگیوں پر نہایت قوی اثر ڈالتی ہے۔ شخصی زندگی پر اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ ایک انسان خدا کا محبوب بندہ اور معاشرے کا ایک بہترین فرد بن جاتا ہے اور اجتماعی زندگی پر اس کا اثر یہ مترتب ہوتا ہے کہ نماز قائم کرنے والی جماعت زمین کی حکومت اور فردوس کی وراثت کی مستحق ٹھہرتی ہے۔ یہ اس کے لازمی نتائج ہیں جو اس سے علیحدہ نہیں ہوتے۔ آگ کی حرارت اور پانی کی برودت کی طرح ہمیشہ اس کے ساتھ رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ انہی اثرات سے وہ پہچانی جاتی ہے۔ ہو نہیں سکتا کہ نماز پائی جائے اور اس کے یہ اثرات نہ پائے جائیں۔ اگر کبھی ایسا نظر آئے کہ نماز تو موجود ہے لیکن اس کے جلو میں بہترین جذبات، بہترین عمل اور بہترین سیرت کی جلوہ گری نہیں ہے تو سمجھ جاؤ کہ یہ نماز نہیں ہے، نماز کی چادر میں نفاق وریا ہے۔ اسی طرح اگر جماعتی زندگی کی شرائط کے ساتھ نماز موجود ہو لیکن اس کے ساتھ دینی دنیاوی زندگی کی تمام رفعتیں موجود نہ ہوں، یا کم از کم ان کی راہ نہ کھل رہی تو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ نماز حقیقت کی روح سے بالکل خالی ہے۔

| | |
|---|---|
| فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّينَ الَّذِينَ هُمْ | پس ان نمازیوں کے لیے ہلاکی ہے |
| عَن صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ | جو اپنی نمازوں کی حقیقت سے غافل ہیں |
| الَّذِينَ هُمْ يُرَاءُونَ وَ | جو محض دکھاوے کی نماز پڑھتے ہیں |
| يَمْنَعُونَ الْمَاعُونَ۔ | اور ادنیٰ سے ادنیٰ چیز بھی مانگے نہیں دیتے |

یہ دو مختلف نقطہ ہائے نظر ہیں اور دونوں ایک دوسرے کے بالکل ضد ہیں

اور اس زمانے میں مسلمانوں کی خراب حالت نے بظاہر پہلے دعوے کو قوی تر بنا دیا ہے۔ اس وجہ سے ضرورت ہے کہ نماز کی حقیقت پر تفصیل کے ساتھ گفتگو کی جائے۔

**ایک اصولی حقیقت** حقیقت یہ ہے کہ ہر کام کے کرنے کے کچھ شرائط و آداب ہیں جب تک وہ شرائط و آداب پوری طرح ملحوظ نہ رکھے جائیں وہ عمل نتیجہ خیز نہیں ہوتا۔ کسی تخم کے بار آور ہونے کے لیے صرف اتنا ہی کافی نہیں ہے کہ اس کو زمین میں پھینک دیا جائے بلکہ ضروری ہی ہے کہ تخم صالح ہو، زمین زرخیز اور اچھی طرح تیار کی ہوئی ہو، موسم موافق ہو، ہوا مناسب چلے، پانی وقت کے ساتھ ملے، سورج اپنی تمازت اور شبنم اپنی رطوبت سے اس کی پرورش کرے اور کسان کی نگران آنکھیں ایک پل کے لیے بھی اس کی حفاظت و نگہداشت سے غافل نہ ہوں۔ جب یہ تمام باتیں ضبط و اعتدال کی تمام خوبیوں کے ساتھ پائی جاتی ہیں، تب ایک بیج بار آور ہوتا ہے۔ اور اس کا حاصل کھیت سے خرمن تک پہنچتا ہے۔ اگر ان میں سے کوئی ایک بات بھی رہ گئی، تخم ضائع ہو جائے گا اور تمام سعی اکارت ہو گی۔

بالکل یہی حال نماز کا ہے۔ بلاشبہ اس کی برکتیں بے پایاں ہیں۔ یہ ایک ہی چیز آسمان و زمین کی تمام سعادتیں بخش سکتی ہے۔ لیکن اسی وقت جب یہ اپنے تمام لوازم و شرائط کے ساتھ وجود میں آئے۔ یہ نہیں ہے کہ اسے جس طرح جی چاہے پھینک ماریں اور پھر ماتم کریں کہ بیج کی جھولی خالی ہو گئی لیکن خرمن دانوں سے معمور نہ ہوا۔

**نماز دین کا ستون ہے** نظام دین میں نماز کو جو جگہ حاصل ہے اس کی عظمت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس نامہ سے واضح ہوتی ہے جو انھوں نے اپنے عمال کو لکھا تھا۔ انھوں نے نماز کی اہمیت مندرجہ ذیل الفاظ میں واضح کی تھی۔

| | |
|---|---|
| ان اھم امورکم عندی | تمھارے معاملات دینی میں میرے |
| الصلوٰۃ من حفظھا و | نزدیک سب سے زیادہ اہم نماز ہے، |

حافظ علیھا حفظ — جو اس کی حفاظت و نگہداشت کرے گا
دینہ ومن ضیعھا — وہ اپنے پورے دین کی نگہداشت کرے گا
فھو لما سواھا — اور جو اس کو ضائع کردے گا وہ یقیناً دینی
اضیع۔ — امور کو بدرجہ اولیٰ ضائع کردے گا۔

اس سے معلوم ہوا کہ نماز کے قائم کرنے ہی پر تمام دین کے قیام و بقا کا انحصار ہے۔ اگر کسی نے یہ ایک ہی چیز ڈھا دی تو اس نے پورے دین کی نیو اکھاڑ دی۔ اسی وجہ سے حدیثوں میں آیا ہے بین الکفر والایمان ترک الصلوٰۃ کفر و ایمان کے درمیان حدِ فاصل صرف نماز ہے۔ یعنی اگر ایک شخص نے عمداً نماز ترک کر دی تو وہ کفر کے سرحد میں داخل ہو گیا، ایمان سے اس کا رشتہ باقی نہیں رہا۔ یہ ایک چیز چھوڑ کر وہ پورے دین سے دست بردار ہو گیا۔

**دین کا نقطۂ آغاز اور نماز** بعض لوگوں نے ان تمام حدیثوں کی تاویل کرنی چاہی ہے جن میں نماز کو کفر و اسلام کے درمیان حد فاصل قرار دیا گیا ہے۔ حالانکہ فلسفہ دین کے اعتبار سے جو کچھ ان الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے وہی حقیقت ہے۔ جن لوگوں نے اسلام پر حکیمانہ غور کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ دین کا نقطۂ آغاز ایمان و معرفت ہے جس سے قلب میں شکر و محبت کی کیفیت پیدا ہوتی ہے، اور نماز اس شکر و محبت کا اولین مظہر اور پھر پورے دین کا سرچشمہ ہے۔ اس وجہ سے اگر کسی شخص نے نماز ترک کر دی تو ایک طرف تو ایمان و معرفت سے اس کی محرومی واضح ہو گئی کیونکہ اس کے اولین فیضان ہی سے وہ محروم رہا۔ دوسری طرف اس نے اس سرچشمہ ہی کو بند کر دیا جس سے شریعت کی وہ تمام سوتیں نکلتی ہیں جو انسان کے تمام اخلاق و اعمال کو سیراب کرتی ہیں۔

اس اجمال کو کسی قدر تفصیل سے سمجھنا چاہیے۔

ایک انسان جب عقل و رشد کی روشنی میں ہر چیز کو دیکھنے لگتا ہے تو وہ اپنے اندر اور اپنے باہر خدا کی رحمت و پروردگاری کے بے شمار آثار پاتا ہے۔ ان آثار سے وہ خدا کی معرفت حاصل کرتا ہے۔ اس معرفت کا نام ایمان ہے۔ اس ایمان سے اس پر خدا کی محبت اور شکر گزاری کا جذبہ طاری ہوتا ہے۔ یہ جذبہ بندہ کو خدا کی طرف بڑھاتا ہے جس سے نماز وجود میں آتی ہے۔ اسی وجہ سے عربی زبان میں نماز کے لیے صلوٰۃ کا لفظ ہے۔ جس کے معنی اصل لغت میں، اقبال الی الشئی "کسی چیز کی طرف بڑھنے کے ہیں"، یعنی بندہ شکر و محبت کے جذبات سے معمور ہو کر اپنے معبود کی طرف لپکتا ہے۔

استاذ امام مولانا حمید الدین فراہیؒ سورۂ کوثر کی تفسیر میں فرماتے ہیں۔

> دین کی بنیاد علم و عمل کی صحت پر ہے۔ علم یہ ہے کہ ہم اپنے رب کو پہچانیں، اس کے ساتھ اپنے تعلق کو جانیں اور پھر اس معرفت سے کبھی غافل نہ ہوں۔ اس علم سے لازماً محبت و شکر کی ایک قلبی کیفیت و حالت پیدا ہوتی ہے جس سے اعمال کا فیضان ہوتا ہے۔ اس طرح علم و عمل میں گویا وہی تعلق ہے جو تعلق اثر اور موثر اور ظاہر و باطن میں ہوتا ہے یعنی علم ایمان کے زمرہ کی چیز ہے اور عمل کا تعلق اسلام سے ہے۔
>
> پھر، ایک دوسری حقیقت پر غور کرو۔ عمل جس طرح علم کا مقابل ہے اسی طرح وہ قول کا بھی مقابل ہے۔ یعنی قول علم و عمل کے بیچ کی کڑی ہے۔ قول ارادہ کا اولین ظہور اور عمل کا عنوان و دیباچہ ہے۔
>
> نماز ظاہر ہے کہ قول و قرار ہے۔ یہ اٹھنا، بیٹھنا، جھکنا، سجدہ کرنا، ہاتھ اٹھانا اور انگلی سے اشارہ کرنا کیا ہے؟ یہ سب اداؤں کی زبان سے ہمارا خدا سے قول و قرار ہے۔ یہ ایمان کے بعد راہِ اطاعت میں ہمارا پہلا

قدم ہے۔ یہ اعمال کے دروازہ کی کلید ہے۔ اسی وجہ سے یہ تمام شریعت کا عنوان قرار دی گئی۔ بکثرت آیات میں اس حقیقت کی طرف اشارات ہیں۔ مثلاً

| | |
|---|---|
| اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ | جو غیب میں اللہ پر ایمان لاتے ہیں |
| وَیُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ | اور نماز قائم کرتے ہیں۔ |

اس سے معلوم ہوا کہ معرفت اور ایمان کا پہلا ثمرہ نماز ہے۔ پھر نماز سے تمام شریعت وجود میں آتی ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں جہاں اجمال کا اسلوب ملحوظ ہے وہاں ایمان کے بعد صرف عمل صالح کا لفظ آتا ہے۔

| | |
|---|---|
| اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا | مگر جو ایمان لائے اور جنھوں نے |
| الصّٰلِحٰتِ | بھلائیاں کیں۔ |

اور جہاں اس اجمال کی تفصیل مقصود ہے وہاں سب سے پہلے نماز کا ذکر آیا۔

| | |
|---|---|
| اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا | بے شک جو ایمان لائے اور جنھوں |
| الصّٰلِحٰتِ وَاَقَامُوا | نے بھلائیاں کیں اور نماز قائم |
| الصَّلٰوۃَ (بقرہ) | کی۔ |

مذکورہ آیت میں تمام اعمال صالحہ کا عنوان نماز کو قرار دیا ہے۔ یہی حقیقت سورہ حج سے واضح ہوتی ہے۔

| | |
|---|---|
| یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ارْکَعُوْا وَ | اے ایمان والو، رکوع کرو، سجدہ کرو |
| اسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّکُمْ (حج) | اور اپنے رب کی بندگی کرو۔ |
| اِنَّمَا یُؤْمِنُ بِاٰیٰتِنَا | ہماری آیتوں پر وہی ایمان لاتے ہیں |
| الَّذِیْنَ اِذَا ذُکِّرُوْا | جن کا حال یہ ہے کہ جب ان کو وہ |
| خَرُّوْا سُجَّدًا وَّسَبَّحُوْا | آیتیں یاد دلائی جاتی ہیں وہ سجدہ |
| بِحَمْدِ رَبِّھِمْ وَھُمْ | میں گر پڑتے ہیں اور اپنے رب کی |

لَا یَسْتَکْبِرُوْنَ ۔ تَتَجَافیٰ | تسبیح کرتے ہیں اس کی حمد کے ساتھ اور
جُنُوْبُھُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ | تکبر نہیں کرتے، راتوں کو ان کے پہلو
یَدْعُوْنَ رَبَّھُمْ خَوْفًا وَّ | بستروں سے دور رہتے ہیں۔ وہ بیم ورجا کے
طَمَعًا (سجدہ - ۱۵) | ساتھ اپنے رب کو پکارتے ہیں۔

قرآن مجید میں اس مضمون کی آیتیں بہت ہیں۔ ان آیتوں میں، ایمان و معرفت کا پہلا مظہر نماز کو قرار دیا ہے۔ نماز اور ایمان کے درمیان کی کڑی شکر و محبت ہے جو ایمان و معرفت کا پہلا فیضان اور پھر تمام شریعت کے سرچشمہ یعنی نماز کا اولین محرک ہے۔ نماز اور شکر کی باہمی مناسبت زیادہ محتاج تفصیل نہیں ہے۔ کیونکہ معلوم ہے کہ نماز کی روح سورۂ فاتحہ ہے جو سراپا حمد و شکر کی سورہ ہے۔ پھر ایک سے زیادہ جگہوں میں نماز کو شکر ہی کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

فَاذْکُرُوْنِیٓ اَذْکُرْکُمْ وَاشْکُرُوْلِیْ | مجھ کو یاد کرو، میں تم کو یاد کروں گا۔
وَلَا تَکْفُرُوْنِ (بقرہ) | میرا شکر کرو ناشکری نہ کرو۔

اس آیت میں واشکرولی سے مراد فی الحقیقت نماز ہی ہے۔

**نماز تمام شریعت کا سرچشمہ ہے** | جس طرح ایمان شکر کے واسطہ سے، نماز کا محرک ہے اسی طرح نماز کے واسطہ سے بقیہ تمام شریعت کا محرک ہے۔ یعنی پہلے نماز وجود میں آتی ہے پھر وہ تمام شریعت کو وجود میں لاتی ہے۔

اس اجمال کی کسی قدر واضح لفظوں میں یوں سمجھ سکتے ہیں کہ بندہ پر تمام حقوق، جیسا کہ معلوم ہے، دو قسم کے ہیں۔ ایک حقوق اللہ، دوسرے حقوق العباد۔ حقوق اللہ کا شیرازہ خدا کے ساتھ اخلاص اور اس کی شکر گزاری ہے اور حقوق العباد کا شیرازہ عدل اور احسان ہے۔ نماز ان دونوں کی جامع ہے۔ اس کے شکر ہونے کی طرف اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے۔ باقی رہا اس کا اخلاص ہونا تو اس کی نہایت واضح

شہادت یہ ہے کہ ہر نماز کا آغاز اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ الخ[1] سے جو اخلاص اور توحید کی ایک عظیم الشان آیت بلکہ ایک عظیم الشان یادگار ہے۔

اسی طرح نماز کا عدل و احسان ہونا بھی ایک واضح حقیقت ہے کیونکہ شکر و اخلاص کی بنیاد عدل و احسان ہی پر ہے۔ انسانی فطرت کے اندر اللہ تعالیٰ نے جو عدل کا شعور اور احسان کا جذبہ ودیعت فرمایا ہے، یہ انہی کا تقاضا ہے کہ بندہ اپنے پروردگار کا مخلص اور صرف اسی کا شکرگزار ہو۔ ذیل کی آیات پر اس پہلو سے غور کیجیے ان سے واضح ہوتا ہے کہ آدمی کے اندر جو عدل کا شعور ودیعت ہے۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی اپنے رب کی نعمتوں کو اسی کی طرف منسوب کرے اور ان کے ملنے پر اسی کا شکر ادا کرے یہ نہ کرے کہ نعمت تو کسی سے پائے اور شکرگزار کسی کا بنے۔

| | |
|---|---|
| وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِى الرِّزْقِ فَمَا الَّذِيْنَ فُضِّلُوْا بِرَآدِّيْ رِزْقِهِمْ عَلٰى مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ اَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ۔ (النحل - ۷۱) | اللہ نے روزی کے معاملہ میں تم کو ایک دوسرے پر فضیلت بخشی ہے، لیکن جن کو فضیلت بخشی ہے وہ یہ نہیں کرتے کہ اپنی روزی بانٹ کر اپنے غلاموں کو دے دیتے ہوں کہ باہم برابر ہو جائیں (پھر اللہ کے متعلق ایسی بات کیوں کہتے ہیں) کیا وہ اللہ کی نعمت کا انکار کرتے ہیں۔ |
| مَا كَانَ لَنَآ اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَيْنَا وَعَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ (یوسف - ۳۸) | ہمارے لیے یہ زیبا نہیں ہے کہ ہم کسی شے کو خدا کا ساجھی ٹھہرائیں۔ یہ اللہ کا ہم پر اور لوگوں پر فضل ہے، لیکن اکثر اس کا شکر ادا نہیں کرتے۔ |

---

[1] میں نے اپنا رخ یکسو ہو کر اس کی طرف کیا جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا۔

اَحْسِنْ كَمَا اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ۔ | جس طرح سے اللہ نے تم پر احسان کیا ہے تم دوسروں پر احسان کرو۔

پس نماز ایک طرف بندہ کو خدا سے جوڑتی ہے، دوسری طرف مخلوق سے۔ اور شریعت کا اصلی مقصود یہی ہے کہ بندہ خدا اور مخلوق دونوں سے ٹھیک ٹھیک جڑ جائے۔ اسی وجہ سے قرآن میں ایمان کے دو مظہر برابر ساتھ ساتھ بیان ہوتے ہیں۔ ایک نماز دوسرے زکوٰۃ۔ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ۔ نماز حقوق اللہ کی بنیاد ہے اور زکوٰۃ حقوق عباد کی۔ اور یہی دو ستون ہیں جن پر ساری شریعت قائم ہے اور اگر زیادہ گہرائی میں اتر کر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ درحقیقت نماز ہی ہے جس سے زکوٰۃ بھی وجود میں آتی ہے اس وجہ سے اصلاً شریعت کا سرچشمہ ایک ہی ہوا ہے۔ چنانچہ سورۂ مومنون میں تمام اعمال صالحہ کا سرچشمہ نماز ہی کو قرار دیا گیا ہے۔

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ | ان ایمان والوں نے فلاح پائی
هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ، | جو اپنی نمازوں میں عاجزی کرتے ہیں
وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ | جو نکمی باتوں سے بچتے ہیں جو زکوٰۃ
وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فَاعِلُوْنَ | ادا کرتے ہیں اور اپنی شرم گاہوں
وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حَافِظُوْنَ | کی حفاظت کرتے ہیں۔

**شریعت کا قیام نماز پر منحصر ہے۔** جب نماز شریعت کا سرچشمہ ہے تو ظاہر ہے کہ اس کے قیام و بقا کے لیے نماز کا قیام و بقا ضروری ہوگا۔ سورۂ مریم میں اللہ تعالیٰ نے نماز کو تمام انبیائے کرام کی دعوت کی بنیاد کی حیثیت سے ذکر کرنے کے بعد یہ ارشاد فرمایا ہے۔

فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ | پھر اس کے بعد ایسے لوگ آئے
خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ | جنھوں نے نمازیں کھو دیں اور شہوتوں

وَاتَّبَعُوا الشَّهَوَاتِ فَسَوْفَ — میں منہمک ہو گئے پس ان کی گمراہی

يَلْقَوْنَ غَيًّا۔ — ان کے آگے آئے گی۔

یہاں شہوات کی پیروی کو نمازیں ضائع کر دینے کے لازمی نتیجہ کی حیثیت سے ذکر کیا ہے اور فی الحقیقت نمازیں ضائع کر دینے کا لازمی نتیجہ ہے بھی یہی۔ کیونکہ فحشاء اور منکر سے روکنے والی چیز نماز ہے۔

اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ — نماز فحشا اور منکر سے روکتی

الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ — ہے۔

جب یہ لگام نہ رہی تو نفس سرکش کو شہوات کی چراگاہ میں بڑھنے سے کون سی چیز روک سکتی ہے؟

ممکن ہے بعض لوگ نماز کی موجودہ بے اثری کی بنا پر اس بات پر حیران ہوں کہ نماز بے حیائی اور برائی کو کس طرح روکتی ہے؟ لیکن قرآن مجید میں یہ عظیم نتائج جن نمازوں سے وابستہ کیے گئے ہیں وہ ہماری موجودہ نمازیں نہیں ہیں۔ قرآن اس قسم کے تمام اثرات و نتائج اس نماز سے وابستہ کرتا ہے، جو شکر و محبت کے چشمہ سے ابلتی اور تمام شریعت کو وجود میں لاتی اور پھر اس کی نگہداشت کرتی ہے۔ یہ حقیقی نماز جو شخص پڑھے گا وہ شریعت کو ضائع نہیں کرے گا بلکہ اس کو قائم کرے گا۔ کیونکہ اس نماز کی روح اللہ کی سچی یاد ہوتی ہے جیسا کہ فرمایا ہے۔

اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِىْ (طٰہٰ) — میرے ذکر کے لیے نماز قائم کرو۔

وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ — اپنے رب کو یاد کیا پھر نماز

فَصَلّٰى (اعلیٰ) — پڑھی

گناہ اور معصیت کی رغبت، جیسا کہ معلوم ہے، غفلت اور خدا فراموشی کے سبب سے ہوتی ہے (نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰهُمْ اَنْفُسَهُمْ) اگر یاد الٰہی موجود ہو اور اس اہتمام

کے ساتھ کہ شب و روز کے تمام اوقات اس سے گھرے ہوئے ہوں تو دل پر غفلت و نسیان کا میل کہاں سے آئے گا؟ اور اگر آئے گا تو ذکرِ الٰہی کی یہ نہر جاری جس کو نماز کہتے ہیں اس کو باقی کب رہنے دے گی؟

| | |
|---|---|
| اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا اِذَا | جن میں تقویٰ ہے جب ان کو کبھی |
| مَسَّهُمْ طَآئِفٌ مِّنَ | شیطان کی چھوت لگ جاتی ہے تو |
| الشَّیْطَانِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا | وہ یاد کرتے ہیں پس ان کی آنکھیں |
| هُمْ مُّبْصِرُوْنَ | کھل جاتی ہیں۔ |

نماز کی یہی حقیقت بخاری شریف کی اس مشہور حدیث میں بیان ہوئی ہے۔

| | |
|---|---|
| ارأیتم لو ان | بھلا بتاؤ اگر تم میں سے کسی کے |
| نهراً بباب احدکم | دروازے پر ایک نہر ہو جس میں وہ |
| یغتسل فیه | روزانہ پانچ مرتبہ نہاتا ہو تو کیا اس |
| کل یوم | کے جسم پر میل کچیل کا کوئی شائبہ باقی |
| خمسا الخ | رہے گا؟ |

پھر یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ نماز کی اصل حقیقت اللہ کی یاد کو ہر وقت تازہ رکھنا ہے۔ مومن کی زندگی کا کوئی لمحہ بھی خدا کی یاد سے خالی نہیں ہونا چاہیے۔

| | |
|---|---|
| اَلَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیَامًا | جو اللہ کی یاد کرتے ہیں کھڑے اور |
| وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ۔ | بیٹھے اور لیٹے۔ |

دوسری جگہ فرمایا

| | |
|---|---|
| یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا | اے ایمان والو اللہ کو بہت یاد |
| اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِیْرًا وَّسَبِّحُوْهُ | کرو اور صبح و شام ہر وقت اس |
| بُكْرَةً وَّاَصِیْلًا۔ | کی تسبیح پڑھو۔ |

پس مومن صرف مسجد ہی میں نماز میں نہیں ہوتا ہے بلکہ ہر آن اور ہر مکان میں وہ نماز میں ہوتا ہے، کیونکہ نماز کی اصل روح یعنی ذکر الٰہی ہر لمحہ ان کے سینہ میں جلوہ گر رہتی ہے۔ وہ مسجد سے علیحدہ ہوتا ہے لیکن خدا کی یاد سے کبھی علیحدہ نہیں ہوتا، اور مسجد سے بھی جب علیحدہ ہوتا ہے تو یہ علیحدگی اس کے لیے کچھ راحت، ولذت کی چیز نہیں ہوتی کیونکہ اس کا دل مسجد ہی میں رہتا ہے مثل المومن کمثل الفرس باخیته والی حدیث میں مومن کا تعلق مسجد سے وہی بتایا گیا ہے جو ایک گھوڑے کا اس کے تھان سے ہوتا ہے۔ جس طرح گھوڑا اپنے تھان سے بندھا بندھا کچھ جولانیاں بھی کر لیتا ہے۔ اسی طرح مومن کا دل اٹکا ہوا تو ہوتا ہے مسجد کے ساتھ لیکن وہ اپنے بشری تقاضوں کے تحت کچھ دنیا کے لیے بھی دوڑ دھوپ، کر لیتا ہے۔

حافظ از عشق خط و خال تو سرگردان است
ہمچو پرکار و لے نقطۂ دل پا بر جاست،

یہ ذکر دل سے غفلت، ونسیان کے میل کو دھوتا رہتا ہے، یہاں تک کہ اس کی پابندی سے قلب میں ایک نور و برہان پیدا ہو جاتا ہے، جو زندگی کی ہر منزل میں بندہ کی نگرانی کرتا ہے۔ ہوائے نفس کی ظلمتیں جب نشانِ راہ گم کر دیتی ہیں یہ چمک کر راہ دکھا دیتا ہے، شہوات، نے جہاں ٹھوکر کھلائی یہ نمودار ہو کر، گرتے گرتے سنبھال لیتا ہے۔ اسی لیے حدیث شریف، میں نماز کو نور و برہان کہا گیا ہے۔

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے

| | |
|---|---|
| ان النبی صلی اللہ علیہ | آنحضرت صلعم نے ایک مرتبہ نماز |
| وسلم ذکر الصلوٰۃ یوماً | کے متعلق فرمایا کہ جو شخص اس کی |
| فقال من حافظ علیہا | نگہداشت کرے گا وہ اس کے لیے |

| | |
|---|---|
| کانت لہٗ نورا وبرھانا | روشنی اور برہان اور قیامت کے |
| ونجاۃ یوم القیامۃ۔ | دن نجات کا ذریعہ ہوگی۔ |

ذکر الٰہی کی یہی برہان عظیم تھی جس نے ایک بڑی نازک گھڑی میں نمودار ہو کر حضرت یوسف علیہ السلام کو سنبھالا۔

| | |
|---|---|
| وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ | اس نے (زلیخا) ان کا قصد کر لیا تھا |
| بِهَا لَوْلَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ | اور وہ بھی اگر اپنے رب کی برہان |
| رَبِّهٖ۔ | نہ دیکھ لیتے تو اس کا قصد کر لیتے۔ |

یہی راز ہے کہ نماز نے تمام شریعت کے لیے ایک دائرہ کی شکل اختیار کر لی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے نماز کا ایک دائرہ کھینچ کر تمام شریعت کو اس کے اندر محفوظ کر دیا ہے۔ جب تک کوئی شخص اس دائرہ کو محفوظ رکھتا ہے محفوظ رکھتا ہے اس کا دین و اخلاق محفوظ رہتا ہے اور جہاں اس حصار میں کوئی رخنہ پیدا ہوا، شیطان شہوات کی فوج لے کر چڑھ دوڑتا ہے اور اس کے سارے دین و اخلاق کو برباد کر کے رکھ دیتا ہے۔

سورۂ مومنون کی ان آیات پر غور کیجیے۔

| | |
|---|---|
| قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ | ان ایمان والوں نے فلاح پائی جو |
| هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ | اپنی نمازوں میں عاجزی کرتے ہیں |
| وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ | جو نکمی باتوں سے بچتے ہیں، جو |
| مُعْرِضُوْنَ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ | زکوٰۃ دیتے ہیں، جو اپنی شرم گاہوں |
| فَاعِلُوْنَ. وَالَّذِيْنَ هُمْ | کی حفاظت کرتے ہیں، مگر اپنی بیویوں |
| لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ اِلَّا عَلٰٓى | سے اور لونڈیوں سے، ان |
| اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ | کے بارے میں ان کو کوئی ملامت |

| | |
|---|---|
| فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُومِينَ فَمَنِ ابْتَغَىٰ وَرَاءَ ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْعَادُونَ وَالَّذِينَ هُمْ لِأَمَانَاتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُونَ وَالَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَوَاتِهِمْ يُحَافِظُونَ | نہیں، البتہ جو اس کے علاوہ کے لیے ہاتھ بڑھائیں وہ حد سے تجاوز کرنے والے ہیں اور وہ جو اپنی امانتوں اور عہد کا خیال کرتے ہیں اور جو اپنی نمازوں کی نگہداشت کرتے ہیں۔ |

یہاں جتنی نیکیاں بیان ہوئی ہیں ان کا آغاز بھی نماز سے ہوا ہے اور پھر ان کا اختتام بھی نماز ہی پر ہوا ہے۔ یہ اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ شریعت کی حفاظت نماز کی حفاظت و نگہداشت پر منحصر ہے۔ پھر شروع میں نماز کے ساتھ خشوع کا ذکر کیا جو انکسارِ بہیمیت کی علامت اور نماز کی روح ہے اور آخر میں محافظت کا ذکر کیا تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ جو نماز فلاح و سعادت کی ضامن ہے اس کی روح خشوع اور اس کی خصوصیت مداومت ہے۔ یہی بات سورۂ بقرہ میں بھی نظر آتی ہے۔ وہ بھی نماز سے شروع ہوتی ہے۔ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيمُونَ الصَّلَاةَ (ان متقین کے لیے ہدایت ہے جو غیب میں رہ کر ایمان لاتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں) پھر تمام قوانین و احکام کے خاتمہ پر یہ آیت آتی ہے۔ حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلَاةِ الْوُسْطَىٰ وَقُومُوا لِلَّهِ قَانِتِينَ (نمازوں کی نگہداشت کرو اور بیچ کی نماز کی اور اللہ کے حضور فرمانبردارانہ کھڑے ہو)

اس سے بھی یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ہمارے دین کا آغاز بھی نماز سے ہوتا ہے اور اس کا اختتام بھی نماز پر ہوتا ہے اور درحقیقت نماز ہی ہے جو تمام شریعت کی محافظ ہے۔

نماز ہی حقیقی زندگی ہے | نماز حقیقی زندگی کا سرچشمہ ہے۔ استاذ امام مولانا حمید الدین فراہیؒ

سورۂ کوثر کی تفسیر میں فرماتے ہیں۔

نماز سانس کی طرح زندگی کے لیے ناگزیر ہے۔ وہ حقیقی زندگی جو نور، سکینت اور ایمان کے الفاظ سے تعبیر کی گئی ہے، صرف اللہ کی یاد ہی سے باقی رہ سکتی ہے۔ غور کرو تو عقلاً یہ بات بالکل واضح معلوم ہوتی ہے کیونکہ بندوں کو عقل و تمیز اور ہر قسم کی صلاحیت دے دینے کے بعد خدا کی نظر دافت، اس وقت تک ان کی طرف متوجہ نہیں ہونی چاہیے جب تک وہ اپنی توجہ اور اپنی نیازمندی سے اس کو دعوت نہ دیں۔ اس کا دستور یہ ہے کہ جب بندہ شکر کرتا ہے اور پائی ہوئی نعمتوں کو صحیح طور پر کام میں لاتا ہے تو وہ نعمت کو زیادہ کرتا ہے۔

| | |
|---|---|
| وَالَّذِیْنَ اھْتَدَوْا زَادَھُمْ | جو ہدایت قبول کرتے ہیں وہ ان کے |
| ھُدًی | نور ہدایت کو بڑھاتا ہے۔ |

خدا کی طرف متوجہ ہونے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کے نام کی یاد کی جائے۔ خدا سے تقرب حاصل کرنے کی راہ یہی ہے۔ اس کی قربت کا مفہوم صرف یہ ہے کہ اس کی یاد تازہ رہے اور اس سے دوری کا مطلب یہ ہے کہ اس کی یاد سے غفلت نہ ہو۔ جب بندہ اللہ کو یاد کرتا ہے تو اس سے قریب ہو جاتا ہے۔

| | |
|---|---|
| وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ | سجدہ کر اور قریب ہو جا۔ |

اس وقت اللہ کی نظر رحمت اس کو نوازتی ہے اس کا سینہ نور معرفت سے جگمگاتا ہے کیونکہ روح ذکر و فکر کی گہرائیوں میں جس قدر اترتی ہے۔ زندگی اور قوت کے لازوال خزانوں سے اسی قدر معمور ہوتی جاتی ہے۔ بخاری شریف کی مندرجہ ذیل حدیث میں اسی حقیقت کی خبر دی گئی ہے۔

| | |
|---|---|
| ما یزال العبد یتقرب | بندہ نوافل کی راہ سے میری طرف |
| الی بالنوافل حتی | بڑھتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ میں اس کو |

| | |
|---|---|
| احببته فاذا احببته | محبوب بنا لیتا ہوں اور جب میں اس |
| کنت سمعه الذی | کو محبوب بنا لیتا ہوں تو اس کا کان |
| به یسمع وبصره | بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور |
| الذی به یبصر | اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ |
| ویده التی بها | دیکھتا ہے اور اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں |
| یبطش | جس سے وہ پکڑتا ہے۔ |

یہ اسی روحانی زندگی کا بیان ہے جو حقیقی اور واقعی زندگی ہے۔

اس حقیقت کو دوسرے لفظوں میں یوں بھی سمجھ سکتے ہیں کہ حقیقی زندگی کا سرچشمہ درحقیقت اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں نبی کی دعوت کو زندگی کی دعوت سے تعبیر کیا گیا ہے۔

| | |
|---|---|
| یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِیْبُوْا | اے ایمان والو، اللہ اور رسول کی دعوت |
| لِلّٰہِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاکُمْ | پر لبیک کہو جب کہ وہ تم کو ایسی چیز کی |
| لِمَا یُحْیِیْکُمْ | طرف بلاتے ہیں جو تمہیں زندگی بخشے گی۔ |

بعینہٖ یہی بات حضرت مسیحؑ نے بھی فرمائی ہے کہ "بندہ صرف روٹی سے نہیں جیتا بلکہ اس کلمے سے جیتا ہے جو خدا کی طرف سے آتا ہے۔" قرآن مجید میں ایک سے زیادہ آیات میں وحی کو رزق کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے کیونکہ یہی رزق حقیقی زندگی اور حقیقی قوت کا سرچشمہ ہے۔ جو لوگ اس رزق سے آسودہ ہیں وہ مر کے بھی زندہ رہتے ہیں (وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْیَآءٌ) اور جو اس رزق سے محروم ہیں ان پر زندگی میں بھی موت طاری رہتی ہے۔ چنانچہ قرآن مجید ان کے لیے اموات (مردہ) فِیْ قُلُوْبِھِمْ مَّرَضٌ (مریض القلب) شَرُّ الدَّوَابِّ (بدترین جانور) خُشُبٌ مُّسَنَّدَۃٌ (لکڑی کے کندے) وغیرہ الفاظ استعمال

کرتا ہے اور ایسے دس آدمیوں کو شکست دینے کے لیے ایک مردِ مومن کی قوت کو کافی قرار دیتا ہے۔

| | |
|---|---|
| اِنْ یَّکُنْ مِّنْکُمْ عِشْرُوْنَ | اگر تم میں سے بیس ثابت قدم ہوں گے |
| صٰبِرُوْنَ یَغْلِبُوْا مِائَتَیْنِ۔ | تو ان کے دو سو پر غالب ہوں گے۔ |

اور ہمارے مشہور فلسفۂ قلت و کثرت سے بالکل الگ ہو کر اس کی وجہ قرآن نے یہ بتائی ہے۔

| | |
|---|---|
| بِاَنَّھُمْ قَوْمٌ لَّا | یہ اس وجہ سے کہ وہ ایسے لوگ ہیں |
| یَفْقَھُوْنَ | جو سمجھتے نہیں۔ |

جن لوگوں کے دل سمجھ سے محروم ہیں۔ قرآن ان کو چوپایوں سے بھی بدتر قرار دیتا ہے۔

| | |
|---|---|
| لَھُمْ قُلُوْبٌ لَّا یَفْقَھُوْنَ | ان کے دل ہیں جن سے سوچتے نہیں۔ |
| بِھَا وَلَھُمْ اَعْیُنٌ لَّا یُبْصِرُوْنَ | ان کی آنکھیں ہیں جن سے دیکھتے نہیں |
| بِھَا وَلَھُمْ اٰذَانٌ لَّا یَسْمَعُوْنَ | ان کے کان ہیں جن سے سنتے نہیں۔ |
| بِھَا اُولٰٓئِکَ کَالْاَنْعَامِ | وہ چوپایوں کے مانند ہیں بلکہ ان سے |
| بَلْ ھُمْ اَضَلُّ اُولٰٓئِکَ | بھی زیادہ گمراہ ہیں یہی لوگ واقعی |
| ھُمُ الْغٰفِلُوْنَ۔ | بے خبر ہیں۔ |

یعنی چونکہ وہ فہم و بصیرت کی روشنی سے محروم ہیں اس وجہ سے ان کے دماغوں کانوں اور آنکھوں پر پٹیاں بندھی ہوئی ہیں۔ وہ اسی عالم آب و گل کی رغبات و شہوات میں گرفتار ہیں۔ وہ زمین کے کیڑوں کی طرح ہمیشہ ذلت کی خاک چاٹتے اور کتوں کی طرح ہمیشہ کسی ہڈی کی تلاش میں دوڑتے رہتے ہیں ذٰلِکَ مَبْلَغُھُمْ مِّنَ الْعِلْمِ ان کے علم کی رسائی بس یہیں تک ہے۔ اس سے آگے کسی عالم کا وہ تصور نہیں کر سکتے۔ اس سے آگے کا عالم، جو حقیقی عالم ہے، آیاتُ اللہ کی بخشی ہوئی روشنی

سے نظر آتا ہے جو اس روشنی کو قبول کر لیتے ہیں وہ اس عالم کو دیکھتے ہیں اور وہ اس کی کامیابیوں کے آگے اس دنیا کی کامیابیوں کو ہیچ سمجھتے ہیں اور ساری جد و جہد اس کے حاصل کرنے کے لیے کرتے ہیں، لیکن جو اس روشنی کو نہیں قبول کرتے ان کو شیطان اسی زمین کی وادیوں میں بھٹکاتا اور ٹھوکریں کھلاتا رہتا ہے۔

| | |
|---|---|
| وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ | ان کو اس کا قصہ سناؤ جس کو ہم نے |
| الَّذِىْٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا | اپنی آیتیں دیں لیکن وہ ان سے نکل |
| فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ | بھاگا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شیطان |
| الشَّيْطٰنُ فَكَانَ | نے اس کا پیچھا کیا اور وہ گمراہوں |
| مِنَ الْغٰوِيْنَ وَ | میں ہو گیا اگر ہم چاہتے (یعنی اس میں |
| لَوْشِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ | صلاحیت و طلب پاتے) تو ان آیات |
| بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ | کے ذریعے سے اس کو بلند کرتے (یعنی اس |
| اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ | میں سمجھ اور بصیرت کی روشنی پیدا کرتے |
| هَوٰىهُ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ | کہ اس کی نگاہ بلند ہو) لیکن وہ زمین |
| الْكَلْبِ اِنْ تَحْمِلْ | ہی کی طرف جھکا رہا اور اپنی خواہشوں |
| عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ | کی پیروی ہی میں لگا رہا، بس اس کی مثال |
| تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ | کتے کی ہے۔ اگر تم اس پر حملہ کرو تو بھی وہ |
| ذٰلِكَ مَثَلُ الْقَوْمِ | زبان نکالے رہے گا اور اگر چھوڑ دو جب |
| الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا | بھی زبان نکالے رہے گا۔ یہ اس قوم |
| بِاٰيٰتِنَا۔ | کی مثال ہے جس نے ہماری آیات |
| (اعراف - ۱۷۵) | کی تکذیب کی۔ |

اس تفصیل کو مختصر لفظوں میں یوں سمجھ سکتے ہیں کہ اصلی زندگی دل کی زندگی ہے

اور دل کی زندگی صحیح فہم و بصیرت سے پیدا ہوتی ہے اور صحیح فہم و بصیرت کا سرچشمہ اللہ کی آیات ہیں۔

اب آپ نماز کی حقیقت پر غور کیجیے۔ نماز کا اصلی مقصد اللہ کی آیات پہ تدبّر و تفکّر ہے، جو صحیح فہم و بصیرت یا حقیقی زندگی کا سرچشمہ ہیں۔ تمام عبادات میں نماز اس مقصد کے لیے مخصوص ہے۔ ابتدائے بعثت میں، جب آنحضرت صلعم کو ایک بارِ گراں کے تحمل کے لیے تیار کیا جا رہا تھا، اس حقیقی زندگی سے معمور کرنے ہی کے لیے آپ کو نماز کا حکم دیا گیا اور اس کے ایسے آداب و قواعد تعلیم کیے گئے، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز کا اصلی مقصد آیاتِ الٰہیہ پہ تدبّر ہے تاکہ قلب فہم و بصیرت کے انوار سے معمور ہو جائے۔

| | |
|---|---|
| قُمِ الَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلًا نِّصْفَہٗ | رات کے وقت نماز میں کھڑے رہا |
| اَوِ انْقُصْ مِنْہُ قَلِیْلًا | کرو مگر کچھ حصہ، آدھی رات، یا اس |
| اَوْ زِدْ عَلَیْہِ وَرَتِّلِ | میں سے کچھ کم کر دو، یا اس سے کچھ |
| الْقُرْاٰنَ تَرْتِیْلًا۔ اِنَّا | زیادہ اور قرآن کو خوب ٹھہر ٹھہر کر |
| سَنُلْقِیْ عَلَیْکَ قَوْلًا | پڑھو، کیونکہ ہم تم پر ایک بھاری بوجھ |
| ثَقِیْلًا۔ اِنَّ نَاشِئَۃَ الَّیْلِ | ڈالنے والے ہیں۔ بے شک رات کے |
| ھِیَ اَشَدُّ وَطْاً وَّ اَقْوَمُ | اٹھنے میں قدم خوب جمتے ہیں اور |
| قِیْلًا (مزمل۔ ۱-۶) | بات ٹھیک نکلتی ہے۔ |

اس آیت سے مندرجہ ذیل باتیں معلوم ہوئیں:۔

۱۔ یہ تہجد کی نماز ہے جس میں قیام و قرأت کا طویل ہونا چاہیے۔

۲۔ قرآن میں سے جو کچھ پڑھا جائے، لفظ لفظ کو ٹھہر ٹھہر کر خوب سمجھ کر پڑھا جائے۔

۳۔ یہ نماز انسان کو حقیقی زندگی اور قوت سے معمور کر کے مہماتِ دعوت و نبوت

کے لائق بناتی ہے۔

۴۔ اس کا وقت شب کے پچھلے پہر کا وقت ہے جب کہ آدمی کو نہایت اطمینان بخش اور سکون پرور تنہائی حاصل ہوتی ہے، کیونکہ تدبّر و تفکّر جو اصل مقصود ہے، اس کے لیے سب سے زیادہ سازگار ساعت یہی ہے۔

شرح مجموعۂ گل مرغ سحر می داند
کہ نہ ہر کو ورقے خواند معانی دانست

اس موقع پر وہ مشہور حدیث قدسی جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ پچھلے پہر کو اللہ تعالیٰ آسمانِ دنیا پر آ کر توبہ اور استغفار کرنے والوں کی دعا اور استغفار کا انتظار کرتا ہے ذہن میں رہنی چاہیے۔ نیز بخاری کی وہ حدیث بھی جو تقرب سے متعلق اوپر گزر چکی ہے اور وہ تمام تفصیلات بھی جو آنحضرت صلعم کی شب کی نمازوں کے متعلق، احادیث صحیحہ میں وارد ہیں اور جو اس آیت کریمہ کی عملی تفسیر ہیں۔

انہی وجوہ سے قرآن مجید میں نماز کو صاف صاف "حیات" کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

| | |
|---|---|
| اِنَّ صَلٰوتِیْ وَنُسُکِیْ وَ | بے شک میری نماز، اور میری قربانی اور |
| مَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ | میری زندگی اور میری موت اللہ رب |
| رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ | العٰلمین کے لیے ہے۔ |

اس آیت میں، تقابل کے اصول کو سامنے رکھ کر غور کیجیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس میں "محیای" کا لفظ جس کے معنی زندگی کے ہیں صلوٰۃ کی تفسیر ہے اور "ممات" جس کے معنی موت کے ہیں "نُسک" یعنی قربانی کی تفسیر ہے۔

نماز مشکل کشا ہے | نماز کی مذکورہ بالا حقیقت سمجھ لینے کے بعد یہ سمجھنا مشکل نہیں رہا کہ نماز تمام پریشانیوں سے نجات دینے والی اور تمام مشکلوں کو دور کرنے والی چیز ہے۔ چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے۔

| | |
|---|---|
| کان رسول اللہ صلعم اذا حزبہ امر صلی | آنحضرت صلعم کو جب کوئی مشکل پیش آتی تو آپ نماز پڑھتے۔ |

بعینہ یہی بات قرآن مجید سے بھی نکلتی ہے۔ مکہ کی پر مصائب زندگی میں جب مخالفین اسلام کی دل آزاریوں اور اشرار کی شرارتوں سے، آنحضرت صلعم ملول و آزردہ ہوتے تو آپ کو صبر و استقامت کی تلقین کی جاتی اور اس صبر و استقامت کے حصول کے لیے نماز کا حکم دیا جاتا۔

| | |
|---|---|
| فَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ وَ سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ وَمِنَ الَّیْلِ فَسَبِّحْهُ وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ۔ | ان کی باتوں پر صبر کرو اور اپنے رب کی تسبیح کرو (نماز پڑھو) آفتاب نکلنے سے پہلے اور اس کے ڈوبنے سے پہلے اور رات میں اس کی تسبیح کرو اور نمازوں کے ڈھلنے کے بعد |
| وَاصْبِرْ لِحُکْمِ رَبِّکَ فَاِنَّکَ بِاَعْیُنِنَا وَ سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ حِیْنَ تَقُوْمُ | اور اپنے رب کے حکم کے لیے ثابت قدم رہو، تم ہماری آنکھوں میں ہو اور اپنے رب کی حمد کی تسبیح کرو جس وقت اٹھتے ہو، |

مکی سورتوں میں اس کی مثالیں بکثرت ہیں۔ ان کے نقل کرنے میں طوالت ہوگی۔ اب غور کیجیے نماز میں ایسی کیا چیز ہے جس کے نتائج و ثمرات یہ ہو سکتے ہیں؟ رنج و غم کی حقیقت پر اگر غور کیا جائے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ چیز دراصل زیادہ تر نتیجہ ہے۔ اس بات کا کہ آدمی کو یا تو تقدیر پر مضبوط عقیدہ نہیں ہوتا یا مشکلات و مصائب کے ہجوم میں یہ عقیدہ نگاہوں سے اوجھل ہو جایا کرتا ہے۔ قرآن مجید نے اس حقیقت کو نہایت خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے۔

| | |
|---|---|
| مَا اَصَابَ مِنْ مُّصِیْبَةٍ | کوئی آفت زمین میں یا تمھارے نفوس |

فِی الْاَرْضِ وَلَا فِیْ اَنْفُسِکُمْ — میں تم کو نہیں پہنچتی مگر وہ ایک کتاب
اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ — میں لکھی ہوئی ہے۔ اس سے پہلے کہ ہم
نَّبْرَاَهَا اِنَّ ذٰلِکَ عَلَی — اس کو وجود میں لائیں۔ یہ اللہ کے لیے
اللّٰهِ یَسِیْرٌ لِّکَیْلَا تَاْسَوْا — نہایت سہل بات ہے تاکہ تم نہ غم کرو
عَلٰی مَا فَاتَکُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا — اس چیز پر جو تم سے کھو جائے اور نہ اتراؤ
بِمَآ اٰتٰکُمْ (حدید ۲۲-۲۳) — اس چیز پر جو اس نے تم کو بخشی ہے۔

اس آیت سے صاف واضح ہے کہ جو لوگ اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ انسان کو مالی اور جانی جو آفتیں بھی پیش آتی ہیں سب ایک حکیم و رحیم خدا کے حکم سے آتی ہیں اور صحیفۂ تقدیر کے نوشتہ کے مطابق آتی ہیں وہ نہ کسی آفت سے پریشان و مایوس ہوتے اور نہ کسی نعمت پر مغرور و متکبر ہوتے۔

چونکہ اس علم و عقیدہ کے لحاظ سے لوگوں کے حالات مختلف درجہ کے ہوتے ہیں اس وجہ سے مشکلات و مصائب کے مقابلہ میں مختلف اشخاص کا مختلف حال ہوتا ہے ایک شخص کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ پہاڑوں اور سمندروں کو بھی خاطر میں نہیں لاتا اور دوسرا ایک پرکاہ سے بھی لرزتا ہے اور کانپتا ہے۔

گہے بر طارم اعلیٰ نشینم — گہے بر پشت پائے خود نہ بینم

وہ بھی انسان ہی تھے جن کی بابت کہا گیا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ — اللہ نے مومنین سے ان کے جان و مال
اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ — جنت کے بدلے خرید لیے۔ وہ اللہ
الْجَنَّةَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ — کی راہ میں لڑتے ہیں، پس قتل کرتے
فَیَقْتُلُوْنَ وَیُقْتَلُوْنَ الاٰیۃ — ہیں اور قتل ہوتے ہیں۔

اور وہ بھی یقیناً انسان ہی تھے جن کی حالت یہ بیان کی گئی ہے۔

يَحْسَبُونَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ هُمُ الْعَدُوُّ فَاحْذَرْهُمْ

ان کو ہر آفت اپنے ہی سر پر نظر آتی ہے۔ یہی اصلی دشمن ہیں پس ان سے ہوشیار رہو۔

انسانوں کی ایک ہی جنس ہیں، یہ فرق و اختلاف محض علم صحیح کے عدم و وجود نے پیدا کر دیا ہے۔ جو حقیقی علم کی روشنی سے فیضیاب ہیں وہ کبھی رائی کو پہاڑ نہیں سمجھتے۔ وہ نفس مطمئنہ کی کائنات کے فرمانروا اور اقلیم طمانیت کے تاجدار ہوتے ہیں اور یہ مقام ان کو نماز کی برکت سے حاصل ہوتا ہے کیونکہ، جیسا کہ اوپر پڑھ چکے ہو، علم صحیح کا سرچشمہ نماز ہے۔

ایک دوسرا پہلو یہ ہے کہ رنج و غم اللہ سے دوری کا نتیجہ ہے۔ اگر اس کی معیت حاصل رہے تو کوئی پریشانی پاس نہیں پھٹک سکتی۔ آنحضرت صلعم نے اسی عالم میں فرمایا ہے۔

لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا

غم نہ کرو، اللہ ہمارے ساتھ ہے۔

خدا کے قرب ہی کی وجہ سے اہل جنت کا حال یہ ہوگا کہ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ نہ ان کو خوف ہوگا نہ وہ غمگین ہوں گے۔

اور دنیا میں خدا سے اس قربت کے حاصل کرنے کا ذریعہ صرف نماز ہے۔

وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ

سجدہ کر اور قریب ہو جا

سورہ بقرہ میں ہے اِسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۔ صبر اور نماز کے ذریعے سے مدد چاہو اور سورۂ اعراف میں ہے اِسْتَعِيْنُوْا بِاللّٰهِ وَاصْبِرُوْا۔ اللہ سے مدد چاہو اور ثابت قدم رہو۔

ان دونوں آیتوں پر غور کرو، پہلی آیت میں صلوٰۃ کا لفظ ہے اور دوسری آیت میں بالکل اسی جگہ پر "اللہ" کا لفظ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز خدا سے اس درجہ قریب ہے کہ وہ دنیا میں گویا ہمارے لیے خدا کی قائم مقام ہے۔ جب ہم ہر طرف

سے منقطع ہو کر نماز میں کھڑے ہو جاتے ہیں تو گویا اپنے اس رب کی پناہ میں چلے جاتے ہیں جس کا نام سلام (سکھ) ہے۔ سورۂ مزمل کی اس آیت پر غور کرو۔ اس میں محبت و رافت کا کیا جاں نواز پیام ہے۔

| | |
|---|---|
| وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ | اپنے رب کے نام کو یاد کر اور سب سے کٹ |
| إِلَيْهِ تَبْتِيلًا | کر اپنے رب کے پاس پناہ گیر ہو جا۔ |

اسی وجہ سے حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ بندہ نماز میں اپنے رب سے سرگوشی کرتا ہے۔ فان العبد يناجى ربه۔ اور اسی مقام کی کیفیات ہیں جو ارحنا یا بلال (اے بلال ہم کو راحت دو) اور فی الصلوٰۃ قرۃ عینی (نماز میں میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے) وغیرہ الفاظ سے بیان ہوتی ہیں۔

اس کا ایک اور پہلو یہ ہے کہ نماز جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے، ذکر الٰہی ہے اور ذکر الٰہی اطمینان قلب کا سرچشمہ ہے۔ چنانچہ قرآن میں ارشاد ہے۔

| | |
|---|---|
| أَلَا بِذِكْرِ اللَّهِ تَطْمَئِنُّ | اللہ کی یاد ہی سے دلوں کو طمانینت |
| الْقُلُوبُ۔ | حاصل ہوتی ہے۔ |

اطمینان کا مفہوم یہ ہے کہ ذکر و فکر اور علم صحیح کی حکمت سے قلب کے نور کا یہ حال ہو جائے کہ رنج و راحت کے تمام انقلابات میں اس کی لو یکساں رہے۔ یہی رضی اللہ عنھم و رضوا عنہ کا مقام ہے۔ اور اسی چیز کا ذکر سورۂ فجر میں ہے يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً۔ اور یہ مقام صرف نمازیوں کے لیے مخصوص ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے۔

| | |
|---|---|
| إِنَّ الْإِنسَانَ خُلِقَ هَلُوعًا | انسان تھڑدلا ہے۔ جب اس کو |
| إِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوعًا | کوئی تکلیف پہنچ جاتی ہے گھبرا اٹھتا |
| وَإِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوعًا | ہے اور جب نعمت مل جاتی ہے بخیل |

| | |
|---|---|
| اِلَّا الْمُصَلِّيْنَ الَّذِيْنَ هُمْ | بن جاتا ہے مگر وہ جو نمازی ہیں اور |
| عَلٰی صَلَاتِهِمْ دَائِمُوْنَ۔ | اپنی نمازوں کو کبھی ناغہ نہیں کرتے۔ |

**نماز فطرت کائنات ہے** تمام کائنات خدا کے حکم سے وجود میں آئی ہے اور اس کی مشیت و حکمت نے جو نقشۂ عمل اس کے لیے ٹھہرا دیا ہے اسی پر چل رہی ہے۔ کوئی ذرہ اس نقشہ سے سرمو انحراف نہیں کر سکتا۔ زمین و آسمان اس کے تابع فرمان ہیں۔ سورج اور چاند سب اس کے بنائے ہوئے مستقر اور اس کی ٹھہرائی ہوئی منزلوں میں دوڑ رہے ہیں۔ ہوا اور پانی اس کے حکموں کے آگے سرفگندہ ہیں۔ چرند و پرند اس کی حمد و تسبیح میں زمزمہ سنج ہیں۔

| | |
|---|---|
| تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ | ساتوں آسمان اور زمین اور جو ان |
| وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ وَاِنْ | میں ہیں اس کی تسبیح میں سرگرم ہیں |
| مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ | اور کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو اس |
| بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ | کی تسبیح نہ کر رہی ہو لیکن تم ان کی |
| تَسْبِيْحَهُمْ۔ (بنی اسرائیل-۴۴) | تسبیح سمجھتے نہیں۔ |
| اَوَلَمْ يَرَوْا اِلٰى مَا خَلَقَ | کیا نہیں دیکھتے وہ ان چیزوں کو جو |
| اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ يَّتَفَيَّؤُا | اللہ نے بنائی ہیں۔ ان کے سائے |
| ظِلٰلُهٗ عَنِ الْيَمِيْنِ وَالشَّمَآئِلِ | دائیں اور بائیں سے اللہ کو سجدہ |
| سُجَّدًا لِّلّٰهِ وَهُمْ دٰخِرُوْنَ | کرتے ہوئے ڈھلتے ہیں اور وہ عاجزی |
| وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِى السَّمٰوٰتِ | میں ہیں اور زمین میں جو جانور اور |
| وَمَا فِى الْاَرْضِ مِنْ | آسمانوں میں جو چیزیں ہیں وہ اللہ ہی |
| دَآبَّةٍ وَّالْمَلٰٓئِكَةُ وَهُمْ | کو سجدہ کرتی ہیں اور فرشتے بھی۔ وہ |
| لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ يَخَافُوْنَ | تکبر نہیں کرتے۔ وہ اپنے اوپر سے اپنے |

| | |
|---|---|
| يَخَافُونَ رَبَّهُمْ مِنْ فَوْقِهِمْ وَيَفْعَلُونَ | رب کا ڈر کرتے ہیں اور ان کو جو حکم |
| مَا يُؤْمَرُونَ | ملتا ہے اس کی تعمیل کرتے ہیں۔ |

تمام کائنات کی یہ ہم آہنگی و یکجہتی انسانی فطرت کو دعوت دیتی ہے کہ جب سب اس کی بندگی میں لگے ہوئے ہیں تو وہ بھی اس کی بندگی کے لیے کمربستہ ہو۔ جب زمین نے جانوروں، جنگل کے درختوں، فضا کی چڑیوں، سمندر کی مچھلیوں اور آسمانوں کے تاروں میں سے کوئی اس سے باغی نہیں ہے تو انسان، جو اشرف المخلوقات ہے، اس سے کیوں بغاوت کرے؟ تمام کائنات کی فطرت میں توافق ہے، یہ پورا ساز نغمہ ریز ہے، پھر انسانی فطرت کا ساز کیوں خاموش رہے! اس بزم میں وہ اپنا نغمہ بھی کیوں نہ چھیڑے کہ تمام کائنات حمد و تسبیح کے ترانوں سے گونج اٹھے۔

جو فطرت صالح ہے وہ کائنات کی اس دعوت کو یہ کہہ کر قبول کر لیتی ہے۔

| | |
|---|---|
| وَمَا لِيَ لَا أَعْبُدُ الَّذِي | میں اس رب کی بندگی کیوں نہ کروں |
| فَطَرَنِي | جس نے مجھ کو پیدا کیا۔ |

لیکن جو فاسد ہو چکی ہے وہ اس سے اعراض کرتی ہے۔

| | |
|---|---|
| فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلَّى وَلَٰكِن | پس نہ تو اس نے تصدیق کی، نہ نماز |
| كَذَّبَ وَتَوَلَّى | پڑھی بلکہ جھٹلایا اور اعراض کیا۔ |

قرآن مجید نے یہ پوری داستان صرف ایک آیت میں اس طرح بیان کر دی ہے۔

| | |
|---|---|
| أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ يَسْجُدُ | نہیں دیکھتے کہ اللہ کے لیے سجدہ کرتے |
| لَهُ مَن فِي السَّمَاوَاتِ | ہیں جو آسمانوں اور زمین میں ہیں اور |
| وَمَن فِي الْأَرْضِ وَالشَّمْسُ | سورج اور چاند اور ستارے اور |
| وَالْقَمَرُ وَالنُّجُومُ وَالْجِبَالُ | پہاڑ اور درخت اور جانور اور بہت |
| وَالشَّجَرُ وَالدَّوَابُّ وَكَثِيرٌ | سے انسان بھی، بہتیرے ایسے بھی ہیں |

مِنَ النَّاسِ وَكَثِيرٌ حَقَّ عَلَيْهِ ۔ جو اس سے منحرف ہیں اور ان کے
الْعَذَابُ الآیہ لیے اللہ کا وعدۂ عذاب حق ہو چکا ہے

چونکہ نماز تمام کائنات کی فطرت ہے اور اسلام دین فطرت ہے اس وجہ سے اسلام کا ستون نماز قرار پاتی ہے۔ پس جو شخص نماز کو ڈھا دے گا، وہ پورے دین کو ڈھادے گا اور جو شخص اس کو استوار کرے گا وہ پورے دین کو استوار و محکم کرے گا۔ الصَّلٰوۃُ عِمَادُ الدِّین الخ کہہ کر یہی حقیقت آشکارا کی گئی ہے۔

**نماز قوموں کے لیے عدالت ہے** اس مقام تک پہنچ جانے کے بعد یہ بات آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ نماز قوموں کے لیے عدالت ہے۔ یعنی قوموں کے عزل و نصب میں اصلی عامل درحقیقت نماز ہی ہے۔ جو قوم نماز قائم کرتی ہے فلاح پاتی ہے، جو نماز سے غفلت کرتی ہے، وہ انجام کار تباہ ہو جاتی ہے۔ یہ بات بعض لوگوں کو عجیب معلوم ہوگی لیکن پچھلے مباحث اگر نظر کے سامنے ہوں تو تھوڑے سے تامل کے بعد سمجھ میں آسکتی ہے۔

اوپر پڑھ چکے ہو کہ نماز تمام کائنات کی فطرت ہے۔ اس وجہ سے جو شخص نماز سے اعراض کرتا ہے، وہ ایک طرف تو خود اپنی فطرت کے خلاف رویہ اختیار کرتا ہے، دوسری طرف ساری کائنات سے الگ ہو کر وہ اپنی ایک جدا راہ نکالتا ہے جس میں کوئی اس کا ہم سفر نہیں ہے، نہ سورج نہ ہوا، نہ آسمان نہ زمین، نہ حیوانات نہ فرشتے۔ اور اس طرح وہ اس ہم آہنگی کو درہم برہم کر رہا ہے جو اس کائنات میں پائی جاتی ہے۔ وہ یہ نہیں چاہتا کہ سازِ ہستی سے جو نغمہ بلند ہو رہا ہے، اس میں اپنی آواز ملا کر، اس کو بلند کر دے۔ بلکہ اپنے تنہا سُر سے ایک الگ نغمہ ترکیب دینا چاہتا ہے۔ وہ سمندر بن کر نہیں، قطرہ بن کر جینا چاہتا ہے۔ کیا ایسا وجود فلاح پا سکتا ہے؟ اگر شاخ تنہ سے الگ ہو کر خشک ہو جاتی ہے اور گلہ سے الگ ہو جانے والی بھیڑ کو بھیڑیا

کہا جاتا ہے تو اس وجود کی تباہی میں کیوں شبہ کیا جائے جو بیابان کے درخت کی طرح اکیلا اور زندگی و بقا کے تمام وسائل سے محروم ہے! سورہ حج والی آیت جو اوپر گزر چکی ہے۔ ایک مرتبہ پھر غور سے پڑھیے۔

| | |
|---|---|
| اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ | نہیں دیکھتے کہ اللہ ہی کے لیے سجدہ کرتے |
| لَهٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ | ہیں جو آسمانوں اور زمین میں ہیں اور |
| وَمَنْ فِی الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ | سورج اور چاند اور ستارے اور |
| وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَ | پہاڑ اور درخت، اور جانور، اور |
| الْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَ | بہت سے انسان بھی لیکن بہتیرے |
| الدَّوَابُّ وَكَثِيْرٌ مِّنَ | ایسے بھی ہیں جو اس سے منحرف ہیں |
| النَّاسِ وَكَثِيْرٌ حَقَّ عَلَيْهِ | اور ان کے لیے اللہ کا وعدۂ عذاب |
| الْعَذَابُ۔ | قطعی ہو چکا ہے۔ |

اس آیت کے آئینہ میں، تمام کائنات خدا کے سامنے سربسجود نظر آتی ہے سورج اور چاند، دریا اور پہاڑ، شجر و حجر، چرند و پرند سب اس کے عرش عزت و جلال کے آگے سرفگندہ ہیں۔ ایک وجود بھی اس سے منحرف نہیں۔ تمام مخلوقات الٰہی کی زبانوں پر ایک ہی کا ترانہ اور ایک ہی کی حمد ہے۔ انسانوں میں سے، جن کی فطرت صالح ہے، وہ بھی اس بزم میں شریک ہیں (وَكَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ) سورج جب خدا کے سامنے سر جھکا دیتا ہے، وہ بھی اس کے حضور صفیں باندھ کر سجدوں میں گر جاتے ہیں (اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ) ستارے جب اپنے خالق کے سامنے سرفگندہ ہوتے ہیں، وہ بھی اپنے بستروں سے اٹھ کر، اپنی جبین نیاز اس کے سامنے رکھ دیتے ہیں (وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ) اور چونکہ انسان ذی ارادہ اور تمام کائنات سے اشرف و اعلیٰ ہے، اس وجہ سے وہ جب چاہتا ہے تو اس شان سے حمد الٰہی کا نغمہ چھیڑتا ہے کہ اگر زمین

کے غافل انسان اس کا ساتھ نہیں دیتے تو وہ فضا کی چڑیوں کو شریک بزم کر لیتا ہے اور اگر سنگ دل آدمیوں کو اس کی رفاقت سے انکار ہوتا ہے تو وہ پہاڑوں کو اپنا ہمنوا بنا لیتا ہے۔ کیونکہ خدا کی تمام مخلوقات میں سرکش انسانوں کے سوا اس کی حمد و تسبیح سے کسی کو بھی انکار نہیں ہے۔ چنانچہ حضرت داؤد کے متعلق فرمایا گیا ہے۔

| | |
|---|---|
| اِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ | اور ہم نے اس کے ساتھ پہاڑوں کو |
| مَعَهٗ يُسَبِّحْنَ بِالْعَشِيِّ | مسخر کر دیا۔ وہ شام کو اور چاشت |
| وَالْاِشْرَاقِ وَالطَّيْرَ | کے وقت اس کے ساتھ تسبیح کرتے |
| مَحْشُوْرَةً كُلٌّ لَّهٗ | تھے اور چڑیاں جھنڈ کی جھنڈ اور سب |
| اَوَّابٌ۔ | اس کی طرف رجوع کرنے والے تھے۔ |

یہی انسان کامیاب ہیں۔ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ (ان ایمان والوں نے فلاح پائی جو اپنی نمازوں میں عاجزی کرتے ہیں) اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس کائنات میں، تمام کائنات سے کٹ کر نہیں رہنا چاہتے بلکہ گھرانے کے فرد اور مجموعہ کائنات کے ایک عضو کی طرح جینا چاہتے ہیں۔ وہ اس کُل کے ایک جز اور اس سمندر کے ایک قطرہ ہیں۔ اس وجہ سے زمین اور آسمان دونوں کو ان سے محبت ہوتی ہے۔ کائنات کی ایک ایک چیز ان کو پیار کرتی ہے۔ زمین ان کے لیے غلّہ اگاتی ہے، بادل ان کے لیے پانی برساتے ہیں، ہوائیں ان کی فصلیں پکاتی ہیں۔ سورج ان کو گرمی پہنچاتا ہے، چاند ان کو شمع دکھاتا ہے، ستارے ان کی رہبری کرتے ہیں۔ وہ تمام کائنات سے محبت کرتے ہیں اس وجہ سے تمام کائنات ان سے محبت کرنے لگتی ہے۔ وہ خدا کو محبوب ہو جاتے ہیں۔ اس لیے خدا اپنی تمام مخلوق کو حکم فرماتا ہے کہ ان کو پیار کرے۔ اسی وجہ سے فرمایا۔

| | |
|---|---|
| وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْكِتٰبِ اٰمَنُوْا | اگر اہل کتاب ایمان لاتے اور تقویٰ |

| | |
|---|---|
| وَ اتَّقَوْا لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ | اختیار کرتے تو ہم ان کے گناہوں کو |
| سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاَدْخَلْنٰهُمْ | جھاڑ دیتے اور ان کو جنت نعیم |
| جَنّٰتِ النَّعِيْمِ وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا | میں داخل کرتے۔ اور اگر وہ لوگ توراۃ |
| التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَ | وانجیل کو قائم کرتے اور اس چیز کو |
| مَا اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ | جو ان کی طرف ان کے رب کی طرف |
| لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ | سے اتاری گئی ہے تو وہ آسمان وزمین |
| تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ (مائدہ ۶۵-۶۶) | دونوں کی برکتوں سے متمتع ہوتے۔ |

ممکن ہے کسی کو شبہ ہو کہ یہاں زمین و آسمان کی نعمتوں کے فتح باب کو اللہ تعالیٰ نے توراۃ و انجیل کے قائم کرنے کے ساتھ مشروط کیا ہے۔ یہاں نماز کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ اور ہماری بحث کا تعلق نماز کی برکات و نتائج سے ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اقامت کتاب یا اقامت توراۃ و انجیل یا اس سے زیادہ وسیع لفظوں میں، اقامت شریعت کا انحصار اقامت نماز ہی پر ہے۔ کتاب الٰہی کے طرز کلام کو جو لوگ جانتے ہیں وہ اس بات کو تسلیم کریں گے کہ اگر یہاں اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ کی جگہ صرف اَقَامُوا الصَّلٰوةَ ہی کا لفظ ہوتا تو گو الفاظ بدل جاتے لیکن حقیقت میں کوئی تبدیلی نہ ہوتی۔ اس بحث کو ہم اوپر لکھ چکے ہیں۔ اعادہ کی ضرورت نہیں ہے لیکن اقتضائے مقام سے چند اشارات ضروری ہیں۔ سورہ اعراف (آیہ ۱۶۹) میں ہے۔

| | |
|---|---|
| وَالَّذِيْنَ يُمَسِّكُوْنَ | جو لوگ کتاب کو مضبوطی سے پکڑتے |
| بِالْكِتٰبِ وَاَقَامُوا | ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں۔ بے شک |
| الصَّلٰوةَ اِنَّا لَا نُضِيْعُ | ہم اصلاح کرنے والوں کی مزدوری |
| اَجْرَ الْمُصْلِحِيْنَ۔ | ضائع نہیں کرتے۔ |

اس آیت میں تمسک بالکتاب کی علامت صرف اقامتِ نماز کو قرار دیا ہے یعنی جو جماعت نماز پر صحیح طور سے قائم ہے وہ اپنی کتاب پر قائم ہے اس کا اجر ضائع نہ ہوگا۔ چنانچہ دوسرے مقام پر اضاعت صلوٰۃ کو تمام شریعت کی بربادی کا پیش خیمہ قرار دیا ہے (اَضَاعُوا الصَّلٰوۃَ وَاتَّبَعُوا الشَّھَوَاتِ)

سورۂ مائدہ میں جہاں اللہ تعالیٰ نے اس عہد کا ذکر فرمایا ہے جو یہود سے پابندئ شریعت کے متعلق لیا گیا ہے، وہاں کتاب یا تورات کا لفظ نہیں رکھا بلکہ صرف اقامتِ صلوٰۃ کا رکھا ہے۔ اس میں بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ نماز پر پابندی کے ساتھ قائم رہنے کے معنی یہ ہیں کہ پورا عہد مضبوط و استوار ہے اور نماز کے کمزور ہو جانے کے معنی یہ ہیں کہ سارا عہد و میثاق پھس پھسا اور کمزور ہو گیا ہے۔

| | |
|---|---|
| لَقَدْ اَخَذَ اللّٰہُ مِیْثَاقَ بَنِیْ | اور اللہ نے بنی اسرائیل سے عہد لیا |
| اِسْرَائِیْلَ وَبَعَثْنَا مِنْھُمْ | اور ان میں بارہ نقیب اٹھائے |
| اثْنَیْ عَشَرَ نَقِیْبًا وَقَالَ اللّٰہُ | اور اللہ نے فرمایا کہ میں تمہارے |
| اِنِّیْ مَعَکُمْ لَئِنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوۃَ | ساتھ ہوں۔ اگر تم نماز قائم کرو گے |
| وَاٰتَیْتُمُ الزَّکٰوۃَ (مائدہ ۔ ۱۲) | اور زکوٰۃ دیتے رہو گے۔ |

تاہم اگر ان تصریحات کے بعد بھی کسی کو پورا اطمینان نہ ہو تو سورہ اعراف کی یہ آیت نماز کے نتائج کے باب میں بالکل غیر مشتبہ ہے:۔

| | |
|---|---|
| قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِہٖ | موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا اللہ تعالیٰ |
| اسْتَعِیْنُوْا بِاللّٰہِ وَاصْبِرُوْا | سے مدد چاہو اور ثابت قدم رہو۔ |
| اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰہِ یُوْرِثُھَا | بے شک زمین اللہ کی ملکیت ہے |
| مَنْ یَّشَاءُ مِنْ | وہ اپنے بندوں میں سے جس کو |
| عِبَادِہٖ وَالْعَاقِبَۃُ | چاہے گا بخشے گا اور انجام کار کی |

لِلْمُتَّقِيْنَ (اعراف - ۱۲۸) کامیابی پرہیزگاروں کے لیے ہے۔

اس آیت میں ابتدائی حصہ یعنی یَآ اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَ الصَّلٰوۃِ کے ہم معنی ہے۔ مذکورہ بالا آیت میں اللہ کا لفظ ہے اور اس میں صلوٰۃ کا لفظ ہے جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں، ان دونوں لفظوں سے ایک ہی حقیقت تعبیر کی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے استعانت کا ذریعہ نماز ہے۔ پس ایک آیت میں ذریعہ کو بتا دیا، دوسری آیت میں مقصود کو۔

خلاصہ اس بحث کا یہ ہے کہ جو جماعت نماز قائم کرتی ہے وہ تمام کائنات کے ساتھ متحد اور ہم آہنگ ہے اس وجہ سے اس کائنات کا ذرہ ذرہ اس کا ساتھی اور رفیق ہے زمین اور آسمان اور ان کے مابین جو کچھ ہے سب کے ساتھ اس کا رشتہ قائم ہے اور چونکہ اس پورے گھرانے میں ارادہ و اختیار رکھنے والی مخلوق تنہا وہی ہے اس وجہ سے اس کی سیاست کی باگ اسی کے ہاتھوں میں دی جاتی ہے۔ برخلاف اس کے جو جماعت نماز سے اعراض کر لیتی ہے، وہ تمام کائنات سے اپنا رشتہ کاٹ لیتی ہے۔ زمین و آسمان کے ساتھ اس کا اتحاد باقی نہیں رہ جاتا، پس قدرت کے قانون کے مطابق زمین سے اس کی جڑ کاٹ دی جاتی ہے کیونکہ وہ کینہ کے تعاون سے محروم ہو چکی ہے جو زندگی اور بقا کے لیے ناگزیر ہے۔

اس مقام پر ایک لمحہ توقف کر کے اس حقیقت کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ سمجھ لینا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ کا یہ قانون ہے کہ وہ افراد و اقوام کو جو کچھ بخشتا ہے، ان کی صلاحیت اور استعداد کے پیمانہ سے ناپ کر بخشتا ہے۔ اس قانون کا نام قرآن کی بولی میں سنتہ اللہ ہے۔ یہ سنت اللہ اس پورے کارخانہ خلق و ایجاد میں ایسی ہمہ گیری کے ساتھ جاری و نافذ ہے کہ کبھی اس کی خلاف ورزی نہیں ہوتی۔ قرآن کے علاوہ دوسرے آسمانی صحیفوں میں بھی یہ حقیقت بیان ہوئی ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ حکومت اور خلافت اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے ایک عظیم الشان نعمت ہے۔ یہ کسی قوم کو اس وقت بخشی جاتی ہے جب وہ اس کے لیے استعداد و صلاحیت رکھتی ہو۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب اللہ تعالیٰ نے سیادت و امامت کے منصب عظیم پر سرفراز فرمانا چاہا تو پہلے ان کی اہلیت و استعداد کا امتحان لیا اور جب وہ تمام امتحانوں میں پورے اترے تو ان کو امامت پر سرفراز فرمایا۔

یہ استعداد دو مختلف پہلوؤں سے جانچی جاتی ہے۔ ایک یہ کہ یہ مقاصد سیاست و حکمرانی کے مطابق ہے یا نہیں۔ دوسرے یہ کہ اس کی مقدار کتنی ہے۔ اگر یہ صلاحیت مقاصد حکومت کے لیے موزوں ثابت ہوتی ہے تو اس کی مقدار کے لحاظ سے چھوٹی یا بڑی حکومت عطا ہوتی ہے۔ اگر صلاحیت محدود ہوتی ہے، حکومت بھی محدود ہوتی ہے اور اگر صلاحیت غیر محدود ہوتی ہے تو حکومت بھی عالمگیر ہوتی ہے۔ اسلام سے پہلے جو ادیان و ملل تھے وہ قوموں اور جماعتوں کے اندر محدود رہے کیونکہ ان کی صلاحیت عالمگیر سیادت کے لیے کافی نہ تھی لیکن امت مرحومہ کو جو خلافت بخشی گئی اس نے زمین کے تمام کناروں کو اپنے احاطہ میں لے لیا۔

دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر!

اب یہیں ایک اور مسئلہ پر بھی غور کر لینا چاہیے کہ خلافت کے لیے کسی جماعت میں کس قسم کی صلاحیت ہونی چاہیے تاکہ صلاحیت کی نوعیت کا سوال طے ہو جائے اس سوال کا جو جواب مشہور مورخ اور حکیم علامہ ابن خلدون نے دیا ہے ہمارے نزدیک بالکل قرآن کے مطابق ہے۔ اس وجہ سے ہم اس کے جواب کو اسی کے الفاظ میں یہاں نقل کرتے ہیں۔ وہ لکھتا ہے۔

"چونکہ انسان مدنی الطبع ہے اس وجہ سے حکومت اس کے لیے ایک فطری چیز ہے اور انسان بمقابلہ شر کے خیر سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے کیونکہ اس کی اصل فطرت اور

قوت ناطقہ دراصل خیر ہی کو چاہتی ہے، نہ صرف اس کے قوائے حیوانی کا نتیجہ ہے بحیثیت انسان اس کو خیر اور خصائل خیر ہی محبوب ہیں۔ پھر حکومت وسیادت چونکہ اس کو انسان ہونے کی حیثیت سے حاصل ہے۔ کیونکہ یہ انسان کے خواص میں سے ہے نہ کہ حیوان کے خواص میں سے، اس لیے حکومت وسیاست کے لیے خصائل خیر ہی موزوں ہو سکتے ہیں۔

سیاست اور حکومت دراصل مخلوق الٰہی کی کفالت اور بندوں کے درمیان، احکامِ الٰہی کے اجرا کے لیے، اللہ کی خلافت ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے قوانین، جیسا کہ شرائع کے مطالعہ سے ثابت ہے۔ بندوں کے لیے سراپا خیر اور مصلحت ہوتے ہیں اس لیے جس قوم میں عصبیت، جو قوت واستطاعت کی کفیل ہے، اور خصائل خیر، جو احکام الٰہی کی تنفیذ کے لیے مناسب ہیں، پائے جائیں وہ قوم کفالت خلق اور خلافت الٰہیہ کی اہلیت واستعداد سے بھرپور سمجھی جائے گی۔"

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی نے بھی اس حقیقت کی طرف جابجا ارشادات کیے ہیں لیکن یہ چیز اس قدر واضح ہے کہ زیادہ شہادتیں پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس امر میں کون شخص شک کر سکتا ہے کہ سیاست اور حکومت کا اصل مقصد زمین میں اللہ تعالیٰ کی مخلوق کی کفالت ہے، اس وجہ سے اس نعمت سے وہ اسی قوم کو سرفراز فرمائے گا جو اس کے لیے موزوں اہلیت واستعداد رکھتی ہو گی۔

ہم بوجھ ڈھونے کے لیے ایک مزدور چاہتے ہیں تو اس میں محنت وجفاکشی ڈھونڈتے ہیں، اپنے مال ومتاع کی نگرانی کے لیے محافظ چاہتے ہیں تو اس میں مستعدی وسرگرمی کے ساتھ امانت ودیانت تلاش کرتے ہیں، بچوں کے لیے اتالیق ونگران کی ضرورت ہوتی ہے تو کسی ایسے شخص کا پتہ لگاتے ہیں جس میں علم اور اخلاق کے محاسن کے ساتھ شفقت ومحبت ہو۔ یہی حال اللہ تعالیٰ کا ہے۔ وہ رب العٰلمین اپنی مخلوق

کی کفالت کے لیے جب کسی قوم کو چننا چاہتا ہے تو اس قوم کو برگزیدہ فرماتا ہے جو جملہ محاسن خیر سے آراستہ ہو۔ وہ اپنے گلہ کا چرواہا ایسے درندہ صفت انسانوں کو نہیں بناتا جو بھیڑوں کا گوشت کھالیں اور ان کی کھالوں کے کپڑے بنا کر پہن لیں۔ چنانچہ فرمایا ہے۔

| | |
|---|---|
| وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ | ہم نے زبور میں، ذکر کے بعد، لکھ |
| مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ | دیا ہے کہ زمین کے وارث ہمارے |
| يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ | نیکوکار بندے ہوں گے۔ |

اب غور کرو، وہ خصائل خیر، جو کفالت خلق الٰہی کے لیے ضروری ہیں اور جن کی طرف علامہ ابن خلدون نے اشارہ کیا ہے، کسی قوم میں کیونکر پیدا ہو سکتے ہیں؟ سیاست کے لیے جس اخلاق اور حسن کیریکٹر کی ضرورت ہے اس کی تفصیلات میں پڑنے کا یہ موقع نہیں ہے اور نہ چنداں اس کی ضرورت ہی ہے۔ مجرد یہ حقیقت کہ حکومت کا اصل مقصد خلق الٰہی کی کفالت ہے اس بات کو پوری طرح واضح کر دیتی ہے کہ حکومت کے لیے کسی قوم کے کیریکٹر میں کیا کیا باتیں ہونی چاہئیں۔ البتہ جب تم ایک قدم آگے بڑھ کر، اس سوال پر غور کرو گے کہ کسی قوم میں یہ فضائل و محاسن کیونکر پیدا ہو سکتے ہیں تو اس کا صرف ایک ہی جواب ہوگا کہ نماز! کیونکہ جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں، جملہ محاسن و فضائل کا اولین سرچشمہ نماز ہے۔ اسی سے تمام بھلائیاں وجود میں آتی ہیں اور پھر وہی تمام بھلائیوں کی حفاظت و نگہداشت کرتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب دنیا کی تمام قوموں میں سے بنی اسرائیل کو برگزیدہ کیا اور ان کو وہ عزت و شوکت بخشی، جو زمین پر بسنے والی قوموں میں سے کسی قوم کو نہ بخشی جیسا کہ قرآن مجید میں وارد ہے۔

| | |
|---|---|
| اذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ | اپنے اوپر اللہ کی نعمت کو یاد کرو |
| إِذْ جَعَلَ فِيكُمْ أَنْبِيَاءَ | جب کہ اس نے تم میں انبیاء مبعوث |

| | |
|---|---|
| وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا وَّاٰتٰكُمْ | فرمائے اور بادشاہ بنائے اور تم |
| مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ | کو وہ کچھ بخشا جو دنیا کی کسی قوم |
| الْعٰلَمِيْنَ۔ | کو نہیں بخشا۔ |

تو ان سے میثاق لیا اور اس عظمت و شوکت کو اس میثاق کے قیام و استحکام کے ساتھ مشروط کیا کہ جب تک تم اس میثاق پر قائم رہو گے اللہ کا یہ عہد قائم رہے گا اور جب تم اس کو توڑ دو گے خدا کی بخشی ہوئی تمام عزت و عظمت تم سے چھن جائے گی یہ میثاق سورہ مائدہ کی آیت ۱۲ میں مذکور ہے اس کو ملاحظہ فرمایئے۔ اس میثاق کی پہلی دفعہ نماز ہے۔

| | |
|---|---|
| وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ | اور اللہ نے بنی اسرائیل سے میثاق |
| بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَبَعَثْنَا | لیا اور اٹھائے ہم نے ان میں بارہ |
| مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيْبًا ط وَ | نقیب اور اللہ نے کہا اگر تم نماز |
| قَالَ اللّٰهُ اِنِّيْ مَعَكُمْ لَئِنْ | قائم رکھو گے اور زکوٰۃ دیتے رہو گے |
| اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَيْتُمُ | اور میرے انبیاء پر ایمان لاؤ گے |
| الزَّكٰوةَ وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِيْ وَ | اور ان کی تائید کرو گے اور اللہ |
| عَزَّرْتُمُوْهُمْ وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ | کو قرض حسن دو گے تو میں تم سے |
| قَرْضًا حَسَنًا لَّاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ | تمہارے گناہوں کو جھاڑ دوں گا اور |
| سَيِّاٰتِكُمْ وَلَاُدْخِلَنَّكُمْ | تم کو ایسے باغوں میں داخل کروں گا |
| جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا | جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی |
| الْاَنْهٰرُ فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ | پھر اس کے بعد تم میں سے جس |
| ذٰلِكَ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ | نے کفر کیا وہ سیدھے رستہ سے |
| سَوَآءَ السَّبِيْلِ۔ | بھٹک گیا۔ |

لیکن یہود اس میثاق پر قائم نہ رہ سکے۔ وہ نماز غائب کر کے شہوات میں پڑ گئے اَضَاعُوا الصَّلٰوۃَ وَاتَّبَعُوا الشَّھَوَاتِ جس کی پاداش میں اللہ تعالیٰ نے ان پر لعنت کی اور ان کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ذلت وخواری اور دنیا کی دوسری قوموں کی محکومی اور بندگی کے لیے چھوڑ دیا۔

| | |
|---|---|
| فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِيْثَاقَهُمْ | پس بوجہ ان کی عہد شکنی کے ہم نے |
| لَعَنّٰهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ | ان پر لعنت کی اور ان کے دلوں کو |
| قَاسِيَةً۔ | سخت کر دیا۔ |

بعینہٖ یہی معاملہ خانہ کعبہ کے پاسبانوں کے ساتھ ہوا، اس کی تعمیر کا مقصد بھی جیسا کہ قرآن مجید کی متعدد آیات اور اس کے نام سے ثابت ہے قیام نماز ہے۔

| | |
|---|---|
| وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً | اور یاد کرو جب کہ ہم نے بیت اللہ |
| لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا وَ | کو لوگوں کے لیے مرکز اور جائے امن |
| اتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ | قرار دیا اور حکم دیا کہ ابراہیم کے |
| اِبْرٰهِيْمَ مُصَلًّى وَ | ٹھہرنے کی جگہ کو نماز کا مرکز بناؤ اور |
| عَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ | ہم نے ابراہیم واسمٰعیل کے ذمہ |
| وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا | یہ خدمت سپرد کی کہ میرے گھر کا |
| بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَ | طواف اور اعتکاف کرنے والوں |
| الْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ | اور رکوع وسجدہ کرنے والوں کے |
| السُّجُوْدِ (بقرہ-۱۲۵) | لیے پاک رکھو۔ |

اس مقدس گھر کے جوار میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی جو ذریت آباد کی اُس کے متعلق یہ دعا فرمائی۔

| | |
|---|---|
| رَبَّنَآ اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ | اے پروردگار میں نے اپنی اولاد میں |

| | |
|---|---|
| ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ | سے کچھ کو ایک بن کھیتی کی زمین میں |
| عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا | تیرے مقدس گھر کے جوار میں بسایا ہے |
| لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ | خداوندا تاکہ وہ نماز قائم کریں۔ |
| أَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْ إِلَيْهِمْ . | پس یوں کر کہ لوگوں کے دل ان کی |
| وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ | طرف مائل ہوں اور ان کو پھلوں کی |
| يَشْكُرُوْنَ (ابراهیم-۳۷) | روزی دے کہ وہ تیرے شکر گزار رہیں۔ |
| رَبِّ اجْعَلْنِيْ مُقِيْمَ | اے میرے پروردگار مجھے نماز قائم |
| الصَّلٰوةِ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ | کرنے والا بنا اور میری اولاد میں |
| رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ | سے بھی، اے پروردگار میری دعا |
| دُعَاءِ (ابراهیم-۴۰) | قبول فرما۔ |

چنانچہ بنی اسماعیل کی پوری تاریخ سے ثابت ہے کہ یہی نماز ہمیشہ ان کے عزل و نصب کی کسوٹی رہی۔ اسلام کے ظہور کے وقت خانہ کعبہ کی پاسبانی اور اس کے واسطہ سے تمام عرب کی دینی پیشوائی اور حکومت قریش کو حاصل تھی۔ یعنی حضرت ابراہیمؑ نے جو دعا فرمائی تھی رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ (اے پروردگار تاکہ نماز قائم کریں) اس دعا کو انہی کے ذریعے پورا ہونا تھا لیکن انہوں نے خانہ کعبہ کے اس بنیادی مقصد اور اپنے وجود و قیام کی اس اصلی غایت کو فراموش کر کے اس پاک گھر کو، جو اس دنیا میں توحید اور خدا پرستی کا اکیلا گھر تھا، شرک و بت پرستی کا مرکز بنا دیا اور ان کی نماز، جو خانہ کعبہ اور خانہ کعبہ کے ساتھ خود ان کے قیام و وجود کی اصلی غایت تھی، شرک سے آلودہ ہو کر، چند بیہودہ اور بے معنی مراسم مشرکانہ کا مجموعہ رہ گئی۔

اس حالت کی اصلاح کے لیے اللہ تعالیٰ نے ان میں اپنا آخری پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم)

اٹھایا جس نے دینِ حق کے تمام مٹے ہوئے آثار و مراسم کو زندہ کرنا چاہا اور ان کو اصلاح حال کی دعوت دی لیکن انھوں نے اس کی باتوں پر کان نہیں دھرے بلکہ اس کی مخالفت اور دشمنی پر آمادہ ہو گئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا اور اپنی شفقت و محبت کا رشتہ اس جماعت سے جوڑ لیا جو صحیح نماز کو قائم کرنے والی تھی۔ اس کے بعد قوت و شوکت کی فراوانی اور مذہبی پیشوائی کے غرور کے باوجود بدر کے میدان میں ان کو نہایت ذلیل شکست ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے ان کی شکست کا سبب یہ بیان فرمایا:۔

| | |
|---|---|
| وَمَا لَهُمْ اَلَّا يُعَذِّبَهُمُ | اور ان میں کیا فضیلت تھی کہ اللہ |
| اللّٰهُ وَهُمْ يَصُدُّوْنَ عَنِ | تعالیٰ ان کو عذاب نہ دیتا درانحالیکہ |
| الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَمَا | وہ مسجد حرام سے مسلمانوں کو روکتے |
| كَانُوْٓا اَوْلِيَآءَهٗ ۭ اِنْ اَوْلِيَآؤُهٗٓ | ہیں حالانکہ وہ اس کے متولی نہیں ہو |
| اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ وَلٰكِنَّ | سکتے۔ اس کے متولی تو وہی ہو سکتے |
| اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ | ہیں جو پرہیزگار ہوں لیکن ان میں |
| وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ | سے اکثر نہیں جانتے اور بیت اللہ |
| الْبَيْتِ اِلَّا مُكَاۗءً وَّتَصْدِيَةً | کے پاس ان کی نماز محض سیٹی بجانا |
| فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا | اور تالی پیٹنا ہے پس اپنے کفر کی |
| كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ۔ | پاداش میں اللہ کا عذاب چکھو۔ |

یعنی اگر ان میں کوئی خوبی اور فضیلت کی بات تھی تو یہ تھی کہ وہ خدا کے گھر کے محافظ و نگہبان تھے اور ان کے ذریعہ بیت اللہ کا مقصد تعمیر (یعنی قیام نماز) پورا ہوتا تھا، لیکن تولیت کی اصلی شرط تقویٰ ہے اور اس سے وہ بالکل خالی ہیں۔ رہ گئی نماز، سو اس کا حال یہ ہے کہ اس کی ہیئت اور حقیقت دونوں انھوں نے مسخ کر کے

رکھ دی ہے۔ اب وہ محض تالی پیٹنے اور سیٹی بجانے سے عبارت ہے۔ پھر کیا چیز ہے جس کے لیے اللہ ان سے اپنا رشتہ قائم رکھے اور کیوں ایسا نہ ہو کہ ان کی جڑ کاٹ دی جائے کہ ان کی جگہ پر وہ جماعت آئے جو خانہ کعبہ کے مقصد سے واقف ہو۔ جو بیت اللہ کی تولیت اپنے ہاتھوں میں لینے کے بعد نماز قائم کرے گی، زکواۃ دے گی، نیکی کا حکم کرے گی، برائی سے روکے گی۔

| | |
|---|---|
| وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ | اور ضرور اللہ ان کی مدد فرمائے گا |
| اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ | جو اس کی مدد کرتے ہیں بے شک |
| اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي | اللہ قوت والا اور غالب ہے، ان |
| الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا | لوگوں کی کہ اگر ہم ان کو زمین دمکا |
| الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ | میں اقتدار بخشیں گے تو وہ نماز قائم |
| وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ | کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، نیکی کا حکم |
| وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ | کریں گے، برائی سے روکیں گے اور |
| (حج۔ ۴۰۔ ۴۱) | معاملات کا انجام اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ |

یہ بات اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو پہلے ہی بتا دی تھی۔ ان کو جب امامت و سیادت کی عزت حاصل ہوئی تو انہوں نے چاہا کہ یہ عزت ان کی اولاد کو بھی حاصل رہے لیکن اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ چیز تمہاری اولاد کے لیے عام نہ ہوگی۔ صرف اللہ کے لیے مخصوص ہوگی جو دین کی تعلیمات اور شریعت کے احکام پر قائم رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ ان کو بے شک عزت و شوکت اور حکومت و سیادت بخشے گا اور جو عہد تم سے باندھا جا رہا ہے اس کی برکتوں سے وہ بھی متمتع ہوں گے لیکن جو خدا کے عہد کو توڑ دیں گے اور پیغمبروں کی سکھائی ہوئی نیکیوں اور سچائیوں کو فراموش کر کے نفس و شیطان کی پیروی کرنے لگ جائیں گے ان کے لیے

اس عہد میں سے کوئی حصہ نہ ہوگا۔

| | |
|---|---|
| قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُکَ | اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ میں تم کو لوگوں |
| لِلنَّاسِ اِمَامًا۔ قَالَ | کا امام بنانے والا ہوں۔ ابراہیم |
| وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ قَالَ | نے کہا اور میری اولاد میں سے؟ |
| لَا یَنَالُ عَهْدِی | فرمایا میرا یہ عہد ظالموں کو شامل |
| الظّٰلِمِیْنَ۔ | نہیں ہے۔ |

پس جب اہل مکہ نے توحید اور نماز کو ضائع کر کے وراثت ابراہیمی کا استحقاق کھو دیا اور دوسری جماعت اہلیت و صلاحیت کی تمام خوبیوں سے آراستہ ہو کر نمودار ہو گئی، اللہ تعالیٰ نے خانہ کعبہ کی کلید، جو درحقیقت تمام اقوام و امم کی سرداری کی کلید تھی، ان سے چھین کر اس اہل اور صالح جماعت کو بخش دی۔ یہ اس سنت الٰہیہ کا ظہور و اعلان تھا۔ جس کی طرف قرآن مجید کی اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے۔

| | |
|---|---|
| اِنْ تَتَوَلَّوْا یَسْتَبْدِلْ | اگر تم اللہ سے منہ موڑ لو گے۔ وہ |
| قَوْمًا غَیْرَکُمْ ثُمَّ لَا | تمہاری جگہ دوسری قوم اٹھا کھڑی |
| یَکُوْنُوْا اَمْثَالَکُمْ۔ | کرے گا۔ پھر وہ تمہاری طرح نہ ہوگی۔ |

یہ وہ اہل و صالح جماعت تھی جو آنحضرت صلعم کی دعوت پر ایمان لائی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے خانہ کعبہ کی پاسبانی کی عزت سے ان کو نوازا اور ساتھ ہی ان سے عہد لیا کہ اس گھر کے بنیادی مقصد نماز کو فراموش نہ کریں گے ورنہ جس طرح یہ امانت دوسروں سے چھین کر ان کو بخشی گئی ہے، اسی طرح ان سے چھین کر دوسروں کو بخش دی جائے گی۔ چنانچہ فرمایا۔

| | |
|---|---|
| اِنَّا اَعْطَیْنٰکَ الْکَوْثَرَ | ہم نے تم کو بخشا کوثر۔ پس اپنے رب |
| فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَانْحَرْ۔ | کی نماز پڑھو اور قربانی کرو۔ |

استاذ امام مولانا حمید الدین فراہیؒ نے سورۂ کوثر کی تفسیر میں پوری تفصیل کے ساتھ ثابت کر دیا ہے کہ "کوثر" سے مراد خانہ کعبہ ہے۔ یہاں اس کی تفصیلات میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ صرف اس نکتہ کو ملحوظ رکھنا چاہیے کہ خانہ کعبہ کی تفویض کے اعلان کے ساتھ مسلمانوں سے سب سے پہلا جو عہد لیا گیا وہ نماز اور قربانی کا عہد تھا۔ یہ اس حقیقت کی طرف اشارہ تھا کہ یہی دو چیزیں اس نعمت کے بقا کی ضامن ہیں، جب تک ان کا اہتمام قائم رہے گا یہ نعمت اور اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی تمام نعمتیں حاصل رہیں گی۔ جب یہ فراموش ہو جائیں گی اس گھر کی تولیت اور اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی تمام نعمتیں چھن جائیں گی۔

تفسیر سورۂ کوثر میں فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ کی تفسیر کرتے ہوئے استاذ امام نے جابجا اس حقیقت کی طرف اشارات کیے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

> اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلعم کو کوثر کے عطیہ کی بشارت دینے کے بعد دو باتوں کا حکم دیا۔ نماز اور قربانی اور دوام کے صیغہ پر تعقیب کی "ف" داخل کی ہے جو سابق و لاحق یعنی عطیہ اور حکم کے درمیان، تعلق اور نسبت کی دلیل ہے۔
>
> اس حکم میں اس بخشش کا اصل مقصود پنہاں ہے کیونکہ یہ ایک بہت بڑے مقصد کی خاطر تھی۔ چنانچہ فرمایا ہے۔

| | |
|---|---|
| وَالَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى | جو اگر ہم ان کو زمین غلبہ دیں، نماز |
| الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ | قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، |
| وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ | معروف کا حکم کریں گے اور منکر سے |
| وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ | روکیں گے۔ |

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبانی فرمایا۔

| | |
|---|---|
| رَبَّنَآ اِنِّىْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ | اے پروردگار! میں نے اپنی اولاد |

| | |
|---|---|
| ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ | میں سے اس بن کھیتی کی زمین میں |
| عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا | تیرے حرمت والے گھر کے پاس بسایا |
| لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ | ہے، اے پروردگار اس لیے کہ یہ |
| اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ | نماز قائم کریں، پس تو یوں کر کہ لوگوں |
| تَهْوِيْ اِلَيْهِمْ۔ | کے دل ان کی طرف مائل ہوں۔ |

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا، اپنے قدیم وطن سے ہجرت کر کے، ایک بے آب و گیاہ سرزمین میں بسنا محض اس لیے تھا کہ اللہ واحد کی عبادت کا ایک مرکز تعمیر ہو جو لوگوں کی عقیدت و انابت، سعی و طواف اور نذر و نیاز کا قبلہ ہو اور جس طرح غلام اپنے آقا کی ڈیوڑھی پہ گوش بر آواز، سرگرم عمل رہتے ہیں، اسی طرح لوگ اس گھر کی طرف لبیک لبیک لا شریک لک لبیک کہتے ہوئے دوڑیں۔"

اسی سلسلہ میں کچھ آگے چل کر مولانا فرماتے ہیں۔

"اس سے معلوم ہوا کہ اس گھر (بیت اللہ) کی تعمیر نہایت عظیم الشان مقاصد کے لیے ہوئی ہے اور خدا نے انھیں مقاصد کی تکمیل کے لیے ان کو (مسلمانوں کو) اس پر قبضہ دیا۔ ان مقاصد کا لب لباب دو چیزیں ہیں۔ نماز اور قربانی۔ پس عطیہ کے ذکر کے بعد ان دونوں کا ذکر کر دیا کہ یہ واضح ہو جائے کہ یہ عطیہ یوں ہی نہیں مل رہا ہے بلکہ اس کے کچھ حقوق و فرائض ہیں جن کا اہتمام اصلی مقصود ہے یہ گویا بقائے حقوق کے عام اور معروف قانون کے مطابق ایک مسلّم حق کا اظہار کیا گیا کیونکہ کوئی عطیہ بغیر کسی فرض کی ذمہ داری کے نہیں ملتا۔ جب ہم کچھ لیتے ہیں تو لامحالہ کچھ نہ کچھ دینے کے لیے بھی آمادہ رہنا چاہیے۔"

اس عطیہ اور فرض کے عام ہونے کے پہلو کی طرف مولانا اشارہ کرتے ہیں

پس نماز اور قربانی کا حکم تمام امت کے لیے عام ہوا کیونکہ یہ نعمت بھی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی امت کے لیے عام تھی۔ پیغمبر امت کا وکیل ہوتا ہے اس لیے جو کچھ اس کو ملتا ہے، اس میں امت بھی شریک ہوتی ہے۔ ...... پس یہاں نماز اور قربانی کا حکم عام ہے۔ یہ بات سیاق کلام سے ظاہر ہے۔ پھر یہ حقیقت بھی واضح ہے کہ جب کوئی عبادت کسی عطیہ کے ساتھ مخصوص کی گئی تو معلوم ہوا کہ اس کی پابندی ہی اس نعمت کی بقا کی ضامن ہو سکتی ہے۔ آیت ذیل اس قانون الٰہی کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔

| | |
|---|---|
| اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا | اللہ تعالیٰ کسی قوم کے ساتھ اپنے |
| بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا | معاملہ کو نہیں بدلتا جب تک وہ |
| مَا بِاَنْفُسِهِمْ | اپنی حالت میں تبدیلی نہ کرے۔ |

یہاں جیسا کہ سیاق سے ظاہر ہے حج اور اس کے دوسرے آداب و مراسم کا حکم دیا گیا ہے۔ گویا یوں فرمایا کہ ہم نے تم کو کوثر بخشا، پس اس کے حقوق ادا کرو کہ یہ نعمت تمھارے لیے باقی رہے۔"

اس عہد کی مولانا مزید تشریح فرماتے ہیں۔

یہ اس عہد کا بیان ہے جس کی ذمہ داری خدا کے عطیہ کے بعد از خود ہم پر عائد ہو جاتی ہے کیونکہ نماز اور قربانی کے حکم کو خدا نے اپنے عطیہ کے ساتھ مشروط کیا ہے۔ اس لیے جب ہم نے اس کا عطیہ قبول کر لیا تو اس حکم کو بھی اپنے اوپر واجب کر لیا۔ پس جب تک اس عہد پر قائم رہیں گے یہ عطیہ بھی ہمارے لیے باقی رہے گا۔ یہ بالکل اسی طرح کا معاملہ ہے، جیسا آدم وحوا کے ساتھ ہوا تھا۔ خدا نے ان کو جنت میں سکونت اور ہر نعمت سے آزادانہ متمتع ہونے کی اجازت دی لیکن ایک مخصوص درخت کے پاس جانے کی ممانعت کر دی۔

جب انھوں نے اس کے بخشے ہوئے عطیہ کو قبول کر لیا تو ان پر یہ عہد بھی خود بخود واجب ہو گیا۔ چنانچہ قرآن پاک میں اس کو عہد ہی کے لفظ سے تعبیر کیا گیا۔

| | |
|---|---|
| وَلَقَدْ عَهِدْنَا اِلٰی اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِیَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا۔ | اور ہم نے اس سے پہلے آدم سے ایک عہد لیا لیکن وہ بھول گیا اور ہم نے اس میں ارادہ کی پختگی نہیں پائی۔ |

چنانچہ یہ عطیہ اسی وقت تک باقی رہا جب تک وہ دونوں اپنے عہد پر قائم رہے۔

تولیت کعبہ کی تفویض کے وقت جس طرح مسلمانوں کو نماز کا حکم ہوا اسی طرح یہود کو بھی ارض مقدس کی تفویض کے وقت نماز کا حکم ہوا۔

| | |
|---|---|
| وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْیَةَ فَكُلُوْا مِنْهَا حَیْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰیٰكُمْ وَسَنَزِیْدُ الْمُحْسِنِیْنَ۔ | اور یاد کرو جب ہم نے کہا کہ اسی بستی میں داخل ہو جاؤ اور جہاں چاہو آزادی و فارغ البالی سے کھاؤ اور معبد کے دروازہ میں سجدہ کرتے ہوئے داخل ہو اور کہو کہ اے پروردگار ہمارے گناہ بخش دے، پس ہم تمھارے گناہ بخش دیں گے اور خوبی کے کام کرنے والوں کے لیے ہمارا فضل اس سے بھی زیادہ ہوگا۔ |

لیکن یہود جیسا کہ ہم اوپر تفصیل سے لکھ چکے ہیں، اس عہد کو بھول گئے بلکہ انھوں نے شرارت سے دعا کے الفاظ میں ایسی تبدیلی کر دی جس سے اس کی حقیقت ہی بالکل مسخ ہو گئی۔

فَبَدَّلَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَیْرَ الَّذِیْ قِیْلَ لَھُمْ فَاَنْزَلْنَا عَلَی الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا کَانُوْا یَفْسُقُوْنَ (بقرہ ۵)

پس ظالموں نے اس قول کی جگہ پہ جو ان کو سکھایا گیا تھا دوسرا قول رکھ دیا تو ہم نے ان ظالموں پر ان کے فسق کی پاداش میں آسمان سے عذاب نازل کیا۔

اس عہد شکنی پر یہود کو بار بار تنبیہیں ہوئیں جن کی تفصیلات توریت اور قرآن مجید میں مذکور ہیں، لیکن یہود کی قساوت اس درجہ سخت و شدید تھی کہ ان تنبیہات کے باوجود ان کو اصلاح حال کی توفیق نہ ہوئی اور اگر ہوئی بھی تو اس کا اثر بالکل عارضی ہوا، کچھ ہی دنوں کے بعد غفلت و نسیان کی وہی خود فراموشی اور ناعاقبت اندیشی ان پر پھر طاری ہو گئی، جو پہلے طاری تھی۔ یہاں تک کہ ان کی پشت غفلت کے لیے خدا کا آخری تازیانہ نمودار ہوا جس نے ان کی ریڑھ کی ہڈی تک توڑ دی۔ قرآن مجید اور یہود کے صحیفوں میں اس کی تفصیلات موجود ہیں اور اہل نظر سے مخفی نہیں ہیں۔ یہاں سورۂ بنی اسرائیل سے چند اشارات نقل کیے جاتے ہیں۔

وَقَضَیْنَآ اِلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ فِی الْکِتٰبِ لَتُفْسِدُنَّ فِی الْاَرْضِ مَرَّتَیْنِ وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا کَبِیْرًا۔ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ اُوْلٰھُمَا بَعَثْنَا عَلَیْکُمْ عِبَادًا لَّنَآ اُولِیْ بَاْسٍ شَدِیْدٍ فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّیَارِ

اور ہم نے بنی اسرائیل سے تورات میں صاف صاف کہہ دیا تھا کہ تم زمین میں ضرور دو مرتبہ فساد کرو گے اور بہت سرکش ہو جاؤ گے پس جب ان فسادوں میں سے پہلے فساد کا وقت آیا تو ہم نے تم پر اپنے ایسے بندے مسلط کر دیے جو نہایت سخت گیر تھے۔ وہ تمھارے شہروں کے اندر

وَكَانَ وَعْدًا مَّفْعُولًا ..... فَاِذَا جَاءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ لِيَسُوْٓءُا وُجُوْهَكُمْ وَلِيَدْخُلُوا الْمَسْجِدَ كَمَا دَخَلُوْهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّلِيُتَبِّرُوْا مَا عَلَوْا تَتْبِيْرًا۔ (بنی اسرائیل - ۷)

پھیل گئے اور خدا کا وعدہ حتمی تھا۔ پھر جب دوسرے فساد کا وقت آیا تو پھر ہم نے دوسرے بندوں کو اٹھا کھڑا کیا کہ تمہارے منہ بگاڑ دیں اور جس طرح پہلی دفعہ مسجد بیت المقدس میں گھسے تھے اسی طرح اس دفعہ پھر اس میں گھسیں اور جس چیز پر قابو پائیں توڑ پھوڑ کر اس کا ستیاناس کر دیں۔

افسوس ہے کہ ٹھیک یہی حالت، جیسا کہ بعض احادیث میں پیشینگوئی کی گئی تھی، مسلمانوں کو پیش آئی۔ خانہ کعبہ کی تفویض کے وقت، جو درحقیقت تمام دنیا کی حکومت و سیادت کی تفویض کا دیباچہ تھی، مسلمانوں سے نماز کا جو عہد لیا گیا تھا، کچھ دنوں بعد آہستہ آہستہ انھوں نے اس کو فراموش کر دیا اور بتدریج نوبت یہاں تک پہنچی کہ یا تو اگلی امتوں کی طرح، مسلمانوں کے اندر سے نماز یک قلم اٹھ گئی یا باقی رہی تو اس کو نماز کی اصلی ہیئت اور حقیقت سے لگاؤ نہیں رہ گیا ہے اور جن لوگوں نے مسلمانوں کی تاریخ کا گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے وہ اعتراف کریں گے کہ مسلمانوں کے اندر جب تک نماز کی حقیقت محفوظ رہی ان کے قدم برابر ترقی کی راہوں میں بڑھتے رہے لیکن جوں جوں ان کے دل اور دلوں کے ساتھ مسجدیں ویران ہوتی گئیں۔ ان کی پھیلی ہوئی عظمت سمٹنی شروع ہوئی - یہاں تک کہ جس طرح رومیوں اور ایرانیوں نے یہود کو تاراج کر دیا۔ اسی طرح نصاریٰ نے مسلمانوں کی تمام سطوت پارہ پارہ کر ڈالی۔

**ایک شبہ کا جواب** ممکن ہے کسی کے دل میں یہ شبہ پیدا ہو کہ جب سیادت و حکومت کا حصول نماز کے قیام پر منحصر ہے تو چاہیے کہ وہ تو میں اس نعمت سے محروم رہیں

جن کے اندر نماز مفقود ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے۔

اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ حکومت کی دو قسمیں ہیں ایک خلافت الٰہیہ دوسری حکومت و بادشاہی۔

خلافتِ الٰہیہ میں خدا کا قانون فرمانروا ہوتا ہے۔ انسانوں کی مرضی و خواہش کو اس میں کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اس کا قانون خدا کا دیا ہوا ہوتا ہے اور تمام زمین کے لیے یکساں اور عام ہوتا ہے۔ اس میں رنگ اور خون کی کوئی تمیز نہیں ہوتی۔ خدا کے سورج کی طرح اس کی فیض رسائی تمام مخلوق کے لیے یکساں ہوتی ہے۔ اس میں آزادی اور مساوات کا یہ عالم ہوتا ہے کہ اگر خلیفۂ وقت بھی کوئی ایسی بات کہے، جو خدا کے حکم کے مخالف نظر آئے تو ایک بڑھیا کو بھی حق پہنچتا ہے کہ علانیہ اس کو ٹوک دے۔ کیونکہ خلافت الٰہیہ میں، زمین والوں کو صرف تنفیذ کا حق ہے۔ ان کو کوئی نیا قانون گڑھنے کا اختیار نہیں ہے۔ قانون سازی کا حق صرف اللہ اور اس کے رسول کو حاصل ہے۔ اگر کوئی ایسی بات پیش آجائے، جس کے متعلق آسمانی قانون کے اندر کوئی صاف رہنمائی موجود نہ ہو تو اس ایک معصوم وجود کے اقوال و اعمال کو دیکھیں گے جو آسمانی قانون کا اولین حامل رہا ہے۔ اگر اس کے اقوال و اعمال میں بھی کوئی صاف اور صریح رہنمائی موجود نہ ہو تو ادنیٰ درجہ میں اس کے اشارات پر چلیں گے یا اجماع کی پیروی کریں گے مگر یہ نہیں کریں گے کہ کوئی بات اپنے جی سے گڑھ لیں۔ جس دائرہ کے اندر خود اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے قانون سازی کی آزادی حاصل ہے اس دائرہ کے اندر بھی کوئی ایسا قانون بنانے کا حق کسی کو نہیں ہے جو اللہ اور اس کے رسول کے کسی امر و نہی کے خلاف ہو۔

ایسی سیادت و حکومت کے حصول اور بقا کے لیے قیام نماز اولین شرط ہے۔ یہ نماز ہی سے وجود میں آتی ہے اور نماز ہی سے باقی رہتی ہے۔ نماز سے اس کو اس

درجہ قریبی علاقہ ہے کہ جو شخص نمازوں میں ہمارا امام ہو سکتا ہے وہ بے تکلف اس آسمانی حکومت کا صدر بھی ہو سکتا ہے۔ خلیفۂ اوّل حضرت ابو بکر صدیق کے استحقاق خلافت کی ایک بڑی وجہ یہی بتائی گئی تھی کہ جس کو رسول اللہ (صلعم) نے ہماری دینی پیشوائی کے لیے چنا کیا ہم اس کو اپنی دنیاوی سیاست کے لیے نہیں انتخاب کر سکتے"۔

دنیا میں امت مرحومہ کا اصلی فریضہ قیام نماز ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے اپنی ذریت کے لیے جو پہلی دعا کی اس میں یہ فرمایا تھا۔" اے پروردگار تاکہ یہ نماز قائم کریں"۔ اور بعینہٖ یہی حقیقت اس آیت میں دہرائی گئی ہے، جو اوپر گزر چکی ہے اور جس کا مضمون یہ ہے کہ "اگر ہم مسلمانوں کو زمین میں غلبہ اور اقتدار بخشیں گے تو وہ نماز قائم کریں گے اور زکوٰۃ دیں گے"۔ پس خلافت کا اصلی اور بنیادی مقصد قیامِ نماز ہوا اس لیے جو شخص تمام مسلمانوں میں اس قابل گنا گیا کہ ان کی نمازوں میں ان کی امامت کرے وہ بدرجہ اولیٰ اس قابل بھی سمجھا گیا کہ ان کے دوسرے امور میں ان کی سربراہی بھی کرے۔

نماز اپنے باطن میں جس طرح دین کی تمام بنیادی تعلیمات کا سرچشمہ ہے اسی طرح اپنے ظاہر میں، دین کے پورے نظام اور خلافت الٰہیہ کے تمام اساسی مقاصد و اغراض کا خاکہ ہے۔ یعنی اگر ایک شخص یہ جاننا چاہے کہ خلافتِ الٰہیہ کیا ہے؟ اس کی ہیئت اجتماعیہ کی تشکیل کیونکر ہے؟ اس کے قوانین کا سرچشمہ کہاں ہے؟ دنیا میں اس کے قیام کے اغراض و مقاصد کیا ہیں؟ اس میں امیر و مامور کے حدود و اختیارات کیا کیا ہیں؟ تو ان امور کو جاننے کے لیے وہ اس بات کا محتاج نہ ہوگا کہ وہ اسلام کے پورے دستور کا مطالعہ کرے بلکہ وہ کسی گاؤں کی چھوٹی سے چھوٹی مسجد میں جا کر مسلمانوں کی نماز کی صفیں دیکھ لے۔ دیدۂ بینا صرف اس ایک ہی چیز کے اندر وہ سب کچھ پالے گی جو ہزاروں صفحات میں بیان نہیں ہو سکتا۔

ہم نے اپنے مضمون کو صرف باطن نماز سے متعلق رکھا ہے ورنہ ہم دکھاتے

کہ نماز کی ظاہری شکل و ہیئت ہمارے پورے نظامِ ملی اور ہماری ہیئت اجتماعیہ کی کتنی مکمل اور خوب صورت تصویر ہے۔

یہی نکتہ ہے کہ مسلمانوں کے فرضِ اجتماعی یعنی شہادتِ حق کے لیے قیامِ نماز کو ضروری قرار دیا گیا۔

مسلمانوں کا فرضِ اجتماعی قرآن مجید میں یہ بتایا گیا ہے۔

| | |
|---|---|
| كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً | اسی طرح ہم نے تم کو وسط شاہراہ |
| وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ | پر گامزن رہنے والی امت بنایا کہ |
| عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ | تم لوگوں پر گواہی دو اور رسول تم |
| عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ۔ | پر گواہی دے۔ |

اور سورۂ حج کی آخری آیات میں اس فریضہ کی ادائیگی کے لیے اقامتِ نماز کو ضروری قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے۔

| | |
|---|---|
| لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ | تاکہ رسول تم پر گواہی دے |
| وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ | اور تم لوگوں پر گواہی دو پس نماز |
| فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ (حج-۷۸) | قائم کرو اور زکوٰۃ دو۔ |

ان دونوں آیتوں کو ملا کر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تبلیغ و دعوت کی جو ذمہ داری پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر عاید ہوتی تھی، وہ ذمہ داری پیغمبر صلعم کے بعد خلافتِ الٰہیہ کی شکل میں امت پر منتقل ہو گئی، اور امت کے لیے اس ذمہ داری کے ادا کرنے کی راہ اقامتِ نماز اور ایتاءِ زکوٰۃ بتائی گئی یعنی اگر امت نماز اور زکوٰۃ کو ان کے تمام شرائط و آداب کے ساتھ قائم رکھے تو گویا اس نے اپنے فرضِ منصبی یعنی "شہادت علی الناس" کو ادا کیا، جس کے بعد وہ دنیا میں باقی رہنے اور پیغمبر کی وراثت سے سرفراز ہونے کی مستحق ہے۔ لیکن اگر وہ نماز کو ضائع کر دے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس

نے خلافت الٰہیہ کے اس بنیادی مقصود کو ضائع کر دیا جس کے بعد اس کے باقی رہنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

یہی وجہ ہے کہ خلفائے راشدین کے مبارک عہد میں دین و دنیا کے تمام امور مہمہ کا مرکز مسجد ہی تھی اور خلیفۂ وقت کے اولین فرائض میں سے یہ بات تھی کہ وہ پنج وقتہ نمازوں میں مسلمانوں کی امامت کرے۔ کیونکہ جس خلافت الٰہیہ کا وہ امیر ہوتا تھا اس کا پہلا مقصد ہی یہی تھا کہ دنیا میں نماز قائم ہو اور نماز کی شکل میں خدا کی اس آخری دعوت کی شہادت دی جائے جس میں دنیا کی نجات کا راز مضمر ہے۔ ظاہر ہے کہ اس نماز کی امامت کے لیے سب سے زیادہ موزوں شخصیت خلیفۂ وقت کی ذات ہی ہو سکتی تھی۔ چنانچہ جب تک مسلمانوں میں نماز کی یہ اہمیت و عظمت باقی رہی اس وقت تک امامت کی خدمت خلفاء اسلام ہی انجام دیتے رہے۔ لیکن آہستہ آہستہ، جب دین کی حقیقت اور اسی کے ساتھ ساتھ، نماز کی عظمت فراموش ہو گئی اور دنیا پرست امراء مسلمانوں کے فرمانروا ہوئے تو انہوں نے مسجدوں اور جماعتوں کی حاضری ترک کر دی یہاں تک کہ رفتہ رفتہ وہ درد انگیز زمانہ آ گیا کہ آج دنیا کے ہر کام کے لیے اہلیت و صلاحیت کا سوال ہوتا ہے لیکن نمازوں میں امامت کے لیے کسی اہلیت و صلاحیت کی ضرورت نہیں ہے۔

دوسری چیز حکومت و پادشاہی ہے۔ پادشاہی کا سرچشمہ نماز نہیں بلکہ عصبیت ہے عصبیتیں مختلف قسم کی ہوتی ہیں۔ خون کی عصبیت، رنگ کی عصبیت، سرزمین اور وطن کی عصبیت، وغیرہ وغیرہ۔ نسل اور خون، رنگ اور سرزمین، زبان اور تمدن میں سے کوئی چیز انسانوں کی کسی جماعت اور گروہ میں اجتماع اور اتحاد کی وہ حالت پیدا کر دیتی ہے جس سے حکومت کی ایک شکل قائم ہو جاتی ہے۔ یہ حکومت رنگ اور نسل کے امتیازات پر قائم ہوتی۔ اس لیے عدل الٰہی سے یکسر خالی ہوتی ہے۔ اس کے تمام فوائد انسانوں کے ایک مخصوص گروہ کو حاصل ہوتے ہیں۔ اس کی بہتر سے بہتر شکل بھی انسانیت

کے لیے عذاب اور لعنت ہے۔ موجودہ زمانہ کی تمام حکومتیں اور پچھلے زمانوں کی تمام غیر الٰہی حکومتیں اسی عصبیت کے ذریعہ وجود میں آئی ہیں اور ان کی حقیقت ڈاکوؤں کے منظم جتھوں سے زیادہ نہیں ہے۔

اس طرح کی حکومت یا حکومتیں دنیا کے امن کے لیے سب سے بڑی مصیبت ہیں اللہ تعالیٰ کو ان کا وجود نہیں بلکہ عدم مطلوب ہے لیکن چونکہ اس دنیا میں خدا نے حق کے ساتھ باطل کو بھی جینے کی مہلت دی ہے اس وجہ سے وہ اس طرح کی حکومتوں کو بھی سر اٹھانے کا موقع دیتا ہے۔ لیکن اس کا مقصد محض یہ ہوتا ہے کہ ان پر اللہ تعالیٰ کی حجت پوری ہو جائے اور وہ جس سزا کی مستحق ہیں اس کا فیصلہ وہ خود اپنے قلم سے اپنے لیے لکھ لیں۔

یہاں تک جو کچھ کہا گیا ہے اس کا تعلق صرف باطن نماز سے ہے۔ ظاہر نماز پر ہم نے کچھ نہیں لکھا ہے۔ بلکہ باطن نماز کے بھی صرف ان گوشوں پر نگاہ ڈالی جا سکی ہے جو بہت نمایاں تھے لیکن بحث بہت طویل ہو گئی اس لیے اب ختم کی جاتی ہے۔ انشاء اللہ کسی دوسری فرصت میں اس کے دوسرے اطراف و جوانب بحث میں آئیں گے۔

گماں مبر کہ بپایاں رسید کار مغاں
ہزار بادۂ ناخوردہ در رگ تاک است

---

# فہرست تصانیف
# ڈاکٹر اسرار احمد

صدر موٴسس مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور و امیر تنظیم اسلامی

★ تحریک جماعت اسلامی : ایک تحقیقی مطالعہ = ۶/- روپے
★ سرافگندیم : یعنی تنظیم اسلامی کے قیام کا فیصلہ = ۶/- ؍؍
★ مطالبات دین (یعنی بندگی رب، شہادت علی النّاس اور اقامت دین) ۶/- ؍؍
★ اسلام کی نشأۃ ثانیہ = کرنے کا اصل کام = (اردو) ۱/- ؍؍
★ اسلام کی نشأۃ ثانیہ = کرنے کا اصل کام (انگریزی) ۳/- ؍؍
★ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کا مقصد بعثت ۳/- ؍؍
★ نبی اکرم ؍؍ ؍؍ ؍؍ سے ہمارے تعلق کی بنیادیں ۲/- ؍؍
★ مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق (اردو) ۳/- ؍؍
★ ؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍ (انگریزی) ۵/- ؍؍
★ ؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍ (عربی) ۴/- ؍؍
★ مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب حصہ اول ۵/- ؍؍
★ ؍؍ ؍؍ ؍؍ حصہ دوم ۵/- ؍؍
★ قرآن اور امن عالم (اردو) ۷۵/- ؍؍
★ ؍؍ ؍؍ ؍؍ (انگریزی) ۳/- ؍؍
★ راہ نجات سورۃ والعصر کی روشنی میں (اردو) ۲/- ؍؍
★ ؍؍ ؍؍ ؍؍ (انگریزی) (زیر طبع)
★ علامہ اقبال اور ہم ۲/- ؍؍
★ عظمت صوم ۱/- ؍؍
★ دعوت الی اللہ ۱/- ؍؍
★ آیت الکرسی ۳۰/- ؍؍
★ قرآن حکیم کی سورتوں کے مضامین کا اجمالی تجزیہ : الفاتحہ تا الکہف = ۵/- ؍؍
★ نشر القرآن : یعنی سورۂ توبہ آیات ۹۸ تا ۱۲۹ کے درس پر مشتمل نشری تقاریر = ۳/- ؍؍

مرکزی **انجمن خدام القرآن** لاہور

کے قیام کا مقصد

**منبعِ ایمان ——— اور ——— سرچشمۂ یقین**

# قرآنِ حکیم

**کے علم و حکمت کی**

وسیع پیمانے ——— اور ——— اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر و اشاعت ہے

تاکہ اُمّتِ مسلمہ کے فہیم عناصر میں **تجدیدِ ایمان** کی ایک عمومی تحریک برپا ہو جائے

اور اس طرح

**اسلام کی نشأۃِ ثانیہ ——— اور ——— غلبۂ دینِ حق کے دورِ ثانی**

کی راہ ہموار ہو سکے

**وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ**